

مہوش کاشمیری

---



بے پروا زندگی



# پس یواری نڈاں

---

( ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء تک کے ایام قید و بندن رواد )

---

پنسورس کاشمیری

مطبوعات چٹان

---

۸۸۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں

— انوار کلام آزاد —

# انتساب

یہ کہانی میرے جواں سال بھائی پورش کاشمیری کی موتِ خپسٹم ہوتی ہے، جی چاہتا تھا اس کے نام معنون کروں لیکن اس کے لئے ان اوراق میں کیوں ہوا ہے، اس کی جواں مرگی کو چوتھائی صدی گزر چکی ہے وہ اپنا توشہ ساتھ لے گیا، یہ توشہ اس کے لئے بے معنی ہے۔

معا بعض دوستوں کے چہرے سامنے آگئے لیکن نگہ نارسا کے باعث ایک ایک چہرہ اوجھل ہو گیا، کئی رہنماؤں کی تصویریں اُبھریں لیکن دلِ گستاخ توری چڑھا کر نکل گیا۔ شاہوں کا زمانہ نہیں کہ اس نالہ احتجاج کو ان سے منسوب کروں، حکمرانوں کا دور لگ گیا ورنہ انہیں یہ آئینہ ضرور دکھانا، نئی پود کا دل جھریوں سے پہلانا مشکل ہے، بوڑھوں کے لئے عمر رفتہ میں کیا رکھا ہے تاہم ان اوراقِ عبرت کو ان ساتھیوں کی یاد سے منسوب کرتا ہوں جن سے کبھی وفاقہ چہل رواں دواں تھا، آج ان میں سے کوئی باقی نہیں۔

جانے کب ملاقات ہو۔

بہ آں گروہ کہ از ساغر و فامستند  
سلام ما بر سایند ہر کجاہستند

شورش کاشمیری

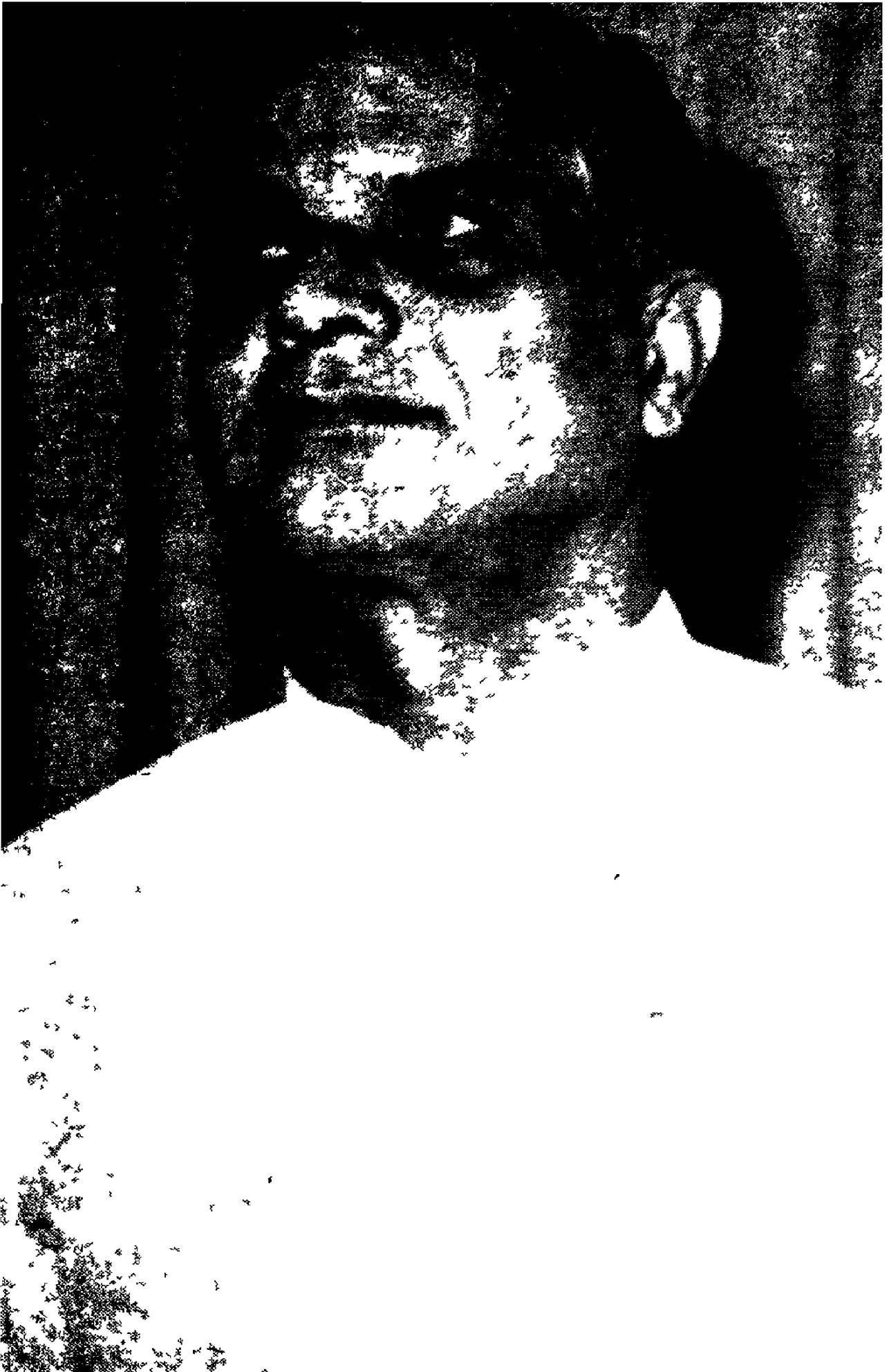
ہجرت  
ہجرت ۱۹۶۱ء



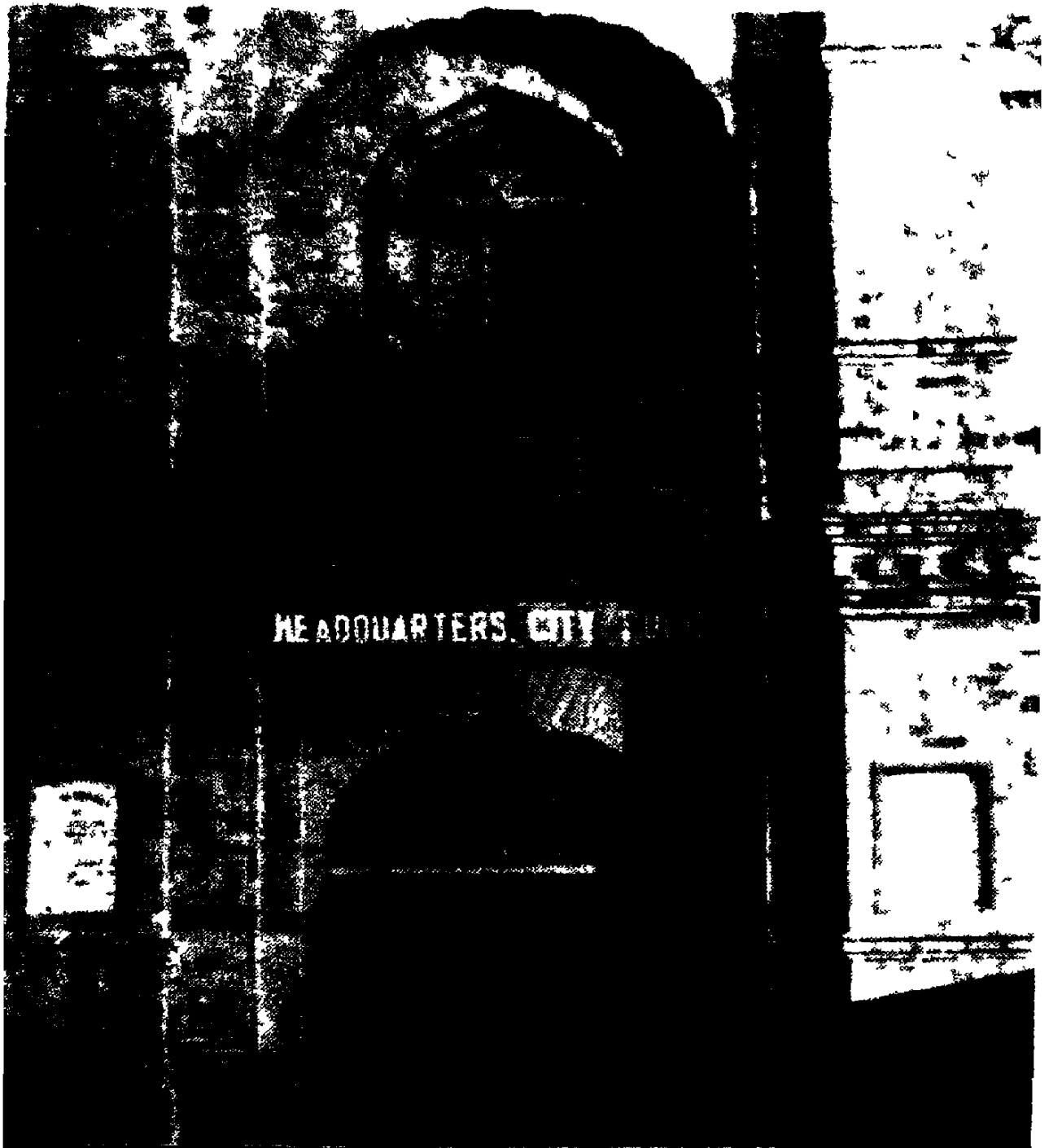
جوان مک یورش کا بیسی

اس کہانے کا مرتبہ آخر









جواب بھی ہے

سٹی کو تو الی لاشور









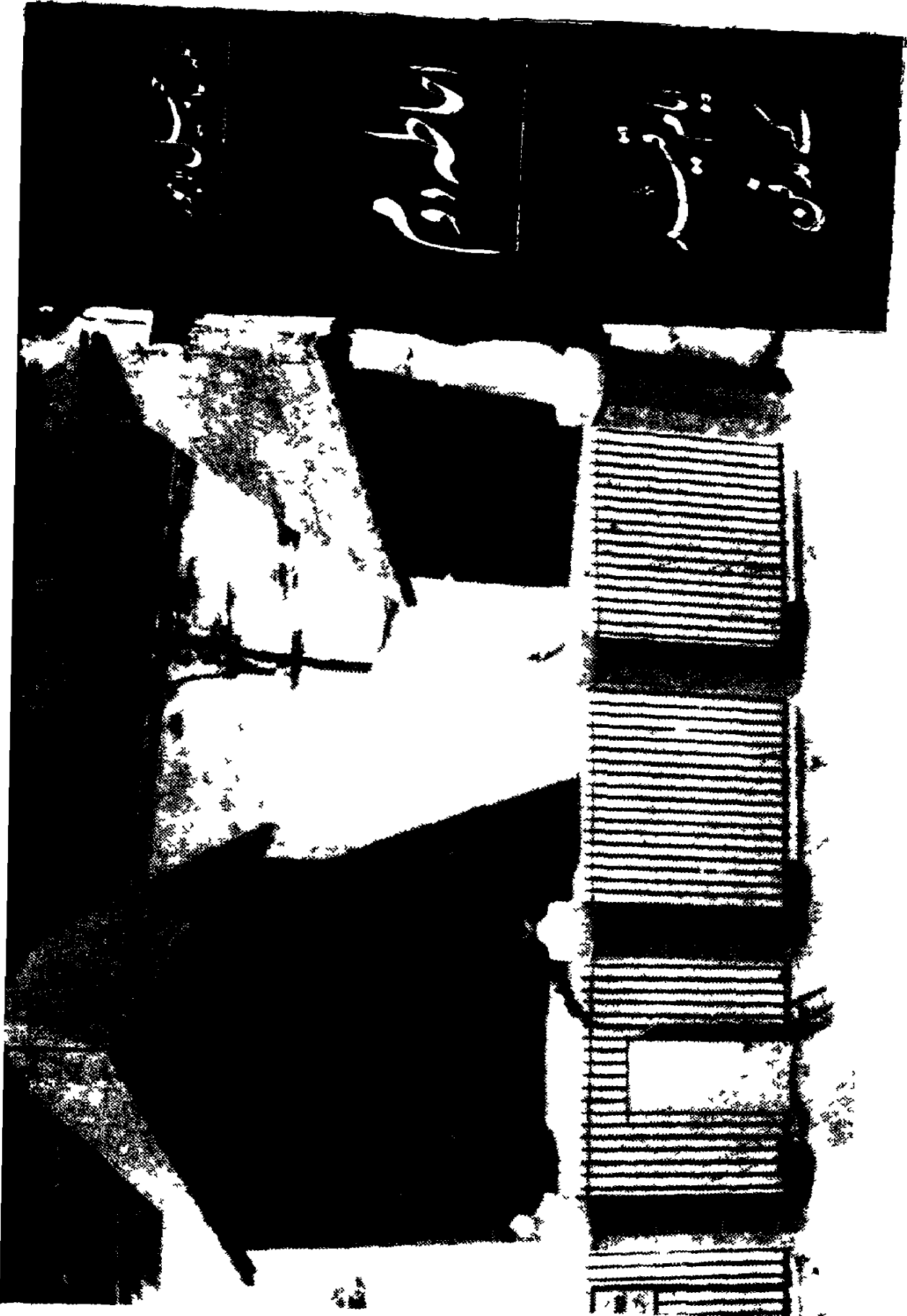


چوستان

انباروں کی

شکار گاہ





الطابق

الطابق



غالباً ۱۹۵۲ء میں اس کتب کی اشاعت کا اعلان کیا تھا لیکن آج انیس سال بعد  
 کتاب شائع کی جا رہی ہے، لطف کی بات یہ ہے کہ اس دوران میں تین دفعہ آزمائش و ابتلا  
 کے انہی مرحلوں سے گزر چکا ہوں، ایک دفعہ ۱۹۵۲ء میں صوبائی حکومت نے سیفٹی ایکٹ کے  
 تحت گرفتار کیا، میرا جرم ایک تقریر تھی ہفتہ عشرہ جیل میں رہا، سیشن بیج کی عدالت سے ضمانت  
 ہو گئی تو وزارت نے مقدمہ واپس لے لیا، دوسری دفعہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان  
 چٹان کے ایک ادارے سے ناراض ہو گئے تو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بند کر دیا تب  
 دو ماہ کے لگ بھگ سنٹرل جیل خٹکری (اب ساہیوال) میں رہا، وہاں سے بیمار ہو کر لاہور میڈیٹل  
 منتقل ہو گیا، یہاں بھی قریب قریب دو ماہ کاٹے، کامن ویلتھ پریس یونین (لندن) اور انٹرنیشنل  
 پریس انسٹی ٹیوٹ (جنیوا) نے حکومت سے وجوہ دریافت کئے، چونکہ آئیں بائیں شائیں کے  
 سوا کوئی جواب نہ تھا لہذا ایوب خان سپر نڈاز ہو گئے، ایک ایسی رٹا کر دیا بھی ڈیڑھ سال گزرا  
 تھا کہ ۶ مئی ۱۹۶۸ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت دوبارہ گرفتار کر کے ڈیڑھ اسماعیل خان

جیل بھجوا دیا جن لوگوں کو اس جیل کا علم یا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ یہاں کن لوگوں کو رکھا جاتا ہے کیوں رکھا جاتا ہے اور تعزیری و سزا کے اس جہنم کا حدود و اربعہ کیا ہے؟ میری بھوک ہڑتال اور ٹائی کوورٹ کی مداخلت سے حکومت بے بس ہو گئی، ڈیرہ سے نکال کے طیارہ پر کراچی بھیج دیا، اس دفعہ نظر بندی بلا میعاد تھی لیکن حکومت اس قدر رسوا ہوئی کہ اُسے بھکننا پڑا، میری پینتالیس دن کی بھوک ہڑتال نے اس کے چکے چھڑا دیئے ایوب خان کے گوبزنز نے مشورہ دیا کہ حکومت کا بھکننا صحیح نہ ہوگا اس کے پریسٹیج میں دراڑ آجائے گی لیکن ایوب خان اور موسیٰ خان اپنے وقار کی مورتی توڑ چکے تھے، دونوں زرد پتوں کی طرح جھڑ گئے اور میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے رہا ہو گیا۔

**پہلی نظر بندی (۱۹۶۶ء) کے تاثرات و تصورات میں نے "تمغہ خدمت"**

کے نام سے لکھے ہیں واضح رہے کہ تمغہ خدمت سرکاری خطابات میں سے ایک خطاب ہے جو قومی خدمات کے صلہ میں صدر مملکت عطا کرتے ہیں، میں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مسلم و زبان اور قول و عمل سے ملک و قوم کے لئے جو کچھ کیا اس کا اعتراف اور اس پر اظہار تحسین مملکت کے صدر اور صوبہ کے گورنر بالمشافہ کر چکے تھے لیکن جنگ کی پہلی ہی سالگرہ پر یہاں دوسروں کو خطابات دیتے گئے وہاں مجھے گرفتار کر لیا گیا، اس رعایت سے میں نے اس کہانی کا نام "تمغہ خدمت" رکھا ہے۔

**دوسری نظر بندی (۱۹۶۸ء) کے جائیداد واقعات اور دُوح فرساحالات پر**  
 شتل ایک ایسی دستاویز ہے کہ اپنے ہی نفس پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ ہنگامہ بھی گزر چکا ہے، آزادی سے پہلے دس سال قید و بند میں رہا لیکن اب کے آٹھ سینسوں میں گویا آٹھ صدیاں گزرن گئیں، ایوب خان، صدر مملکت، اور موسیٰ خان، گورنر صوبہ، نے

شاید فرض کر لیا تھا کہ وہ رب تیار و جبار ہیں لیکن رب رحمن و رحیم نے آن واحد میں انہیں پٹخ ڈالا، دونوں آوارہ قبہتوں کی طرح اڑ گئے، تب یہ خیال ہی نہ تھا کہ موت کی سرحد سے واپس آجاؤں گا لیکن جب انسان کسی اعلیٰ مقصد کے لئے مرنے کو تیار ہو تو موت کتنی کاٹ کے نکل جاتی ہے، میں نے موت کو بھاگتے دیکھا ہے، اس ساری کہانی کا نام اسی لئے موت سے واپسی رکھا ہے۔

زیر نظر کتاب برطانوی عہد استعمار میں زمانہ اسیری کی روداد ہے، دس سال معمولی مدت نہیں، میں شعور کے حدود میں داخل ہو رہا تھا کہ پہلی دفعہ ایک تقریر میں ماحوذ ہو کر قید ہو گیا اس کے بعد یہ سلسلہ ۱۹۲۶ء کے اداؤ تک چلتا رہا، آخری قید و بغض آف انڈیا ایکٹ میں سات سال تھی، عجب زمانہ تھا کرم بھی تھا اور ستم بھی، بہت سی یادداشتیں جیل میں قلم بند کر لی تھیں۔ اس سے پہلے ۱۹۲۵ء میں قیدی کار و زنا مجھے نکھا لیکن وہ رہائی کے وقت حکام نے ضبط کر لیا، اب کے یادداشتیں ساتھ لے کر رہا ہوا لیکن تعین کے ہنگاموں میں سارے کا سارا پلندہ غارت ہو گیا۔ قید خانہ ایک ایسی جگہ ہے کہ دماغ و دل پر جو تہمتی ہے ہمیشہ حافظہ پر نقش رہتی ہے، مجھ میں ایک نقص ہے کہ خوشگوار حافظہ کے باوجود سن و سال یاد نہیں رہتے مثلاً مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ میں ۱۹۶۸ء میں کون سے مہینے اور کون سی تاریخ کو گرفتار ہو کر نظر بند ہوا تھا تو لازماً مجھے اپنے حافظہ پر زور دینا ہوگا، اس کے باوجود مجھے تذبذب ہوگا کہ نظر بندی کی ٹھیک ٹھیک تاریخ کیا ہے؟ اس نسیان کے باوجود جہاں تک واقعات و حالات اور ساخت و حادثات کا تعلق ہے ان کی تفصیلات و جزئیات تک میرے حافظہ سے محو نہیں ہوتیں، اس بارے میں قدرت نے مجھے بلا کا حافظہ دیا ہے، میں اپنے پروردگار کے اس احسان و نعمت پر عرضِ شکر سے قاصر ہوں، انسان احسانات

ایزدی کا شکر ادا کرنا چاہیے تو عمر بھر یہ قرض نہیں اتار سکتا۔

قلم اٹھانے سے پہلے اضطراب سا تھا کہ حافظہ کہاں تک ساتھ دیگا، مستلم اٹھایا تو واقعات ابھرا بھر کر وارد ہو گئے، معلوم ہوا جیسے لکھ نہیں رہا پڑھ رہا ہوں، کئی سال صرف اس کشمکش میں نکل گئے کہ اسلوب کیا ہو؟ کئی اسلوب ذہن میں آتے اور چلے جاتے رہے، کسی اسلوب پر دل مطمئن نہ ہو سکا، باور کیجئے کئی مسودے لکھ کر پھاڑ ڈالے ایک دفعہ ساری کتاب مکمل کر لی لیکن پھر اس لئے سارے کا سارا مسودہ تلف کر دیا کہ میں خود مطمئن نہ تھا، یہ مسودہ جواب آپ کے سامنے ہے میں نے پانچ چھ سال پہلے لکھا تھا کتابت و طباعت چنداں مشکل نہ تھی، اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم شامل حال تھا لیکن سیاسی انفعال مانع رہے ۱۹۶۶ء میں کتابت مکمل ہو گئی پر دفعت دیکھ رہا تھا کہ نظر بند ہو گیا، اس کے بعد کتابت شدہ مسودہ سیف میں چھڑا رہا، دفتر کے رفقاء نے بار بار زور دیا طبیعت کو آمادہ نہ کر سکا، آخر اتنے دنوں کی سیاسی جیت مار کے بعد یہ کتاب چھپ کر تیار ہوئی ہے اللہ کرے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے، ان سطور کی ضرورت نہ تھی یہ ایک طرح کا معذرت نامہ ہے کہ دو تئوں نے قریب قریب انیس برس انتظار کیا، بہر حال جس کہانی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا آج وہ کہانی ۲۵ برس بعد شوخی تحریر سے بے نیاز "کانغزی پیرہن" میں ندرت یارین ہے، اس کا فیصلہ انہیں خود کرنا ہو گا کہ اس پر نقش فریادی کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن اس اعتبار سے اس کے بعض اوراق پر سخت جا نہیںائے تنہائی کا اطلاق ضرور ہوتا ہے کہ ۶

موسے آلتس دیدہ تھا حلقہ مری زنجیر کا

یہ کہانی نئی سنوں کے لئے شاید انوکھی ہو، ان کے دل میں پرانی چیزوں کی طرح

پرانے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں الا ماشاء اللہ نوجوان ماضی سے کئے ہوئے اور ہم انہیں مستقبل سے بٹے ہوئے نظر آ رہے ہیں، ہمارا وجود ان کے لئے متروکات سخن میں سے ہے۔ ہمارے ساتھ ان کی دلچسپی بس اتنی رہ گئی ہے جتنی تاریخ کے طلبہ کو کھنڈروں سے ہوتی ہے یا تعزیت داروں کو بھیمیز دیکھنے کے بعد کسی فبرے رہ جاتی ہے، مخلص برعاست ہو جائیں تو پورا صبح تک جلتے ہی رہتے ہیں، یہ کہانی بس ایک ایسے ہی چراغِ سخن کی ہے

تھوڑا سا تردد ہے کہ بعض چہرے جنہیں تقسیم یہاں سے اٹھا کر ہندوستان لے گئی ان کے ذکر سے ممکن ہے بعض طبائع کچھ پاموس کریں لیکن میرے لئے منسل تھا کہ ان دوستوں کو بھولنا اس یا ان ساتھیوں سے بخل کروں جن کے ہاتھ پر شقہ فرود تھا لیکن جن کے دل آئینہ تھے اس وقت ہمارا سفر ایک تھا اور ہم ایک ہی دھارے پر بہ رہے تھے، برطانوی استبداد کے خلاف بدوجہد کا دھارا، وہ دوست کیونکر بھلائے جاسکتے ہیں جو اپنے ہی بتکدوں میں اشد کبر کی صدا تھے، تاریخ عقیدہ نہیں تجربہ ہے، کہانی و بدوشیند کا تجربہ، شاعری احساسِ تغزل کا مشاہدہ پسے دیوارِ زندان سے تجربہ بھی ہے، تجربہ بھی اور مشاہدہ بھی، اب مطالعہ کے بعد تبصرہ آپ کی ذمہ داری ہے، مولف کو ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی بردا، اسد اللہ خان غالب سے لے کر سورش کاشمیری تک مضمون واحد ہے ع

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ ہی

لاہور

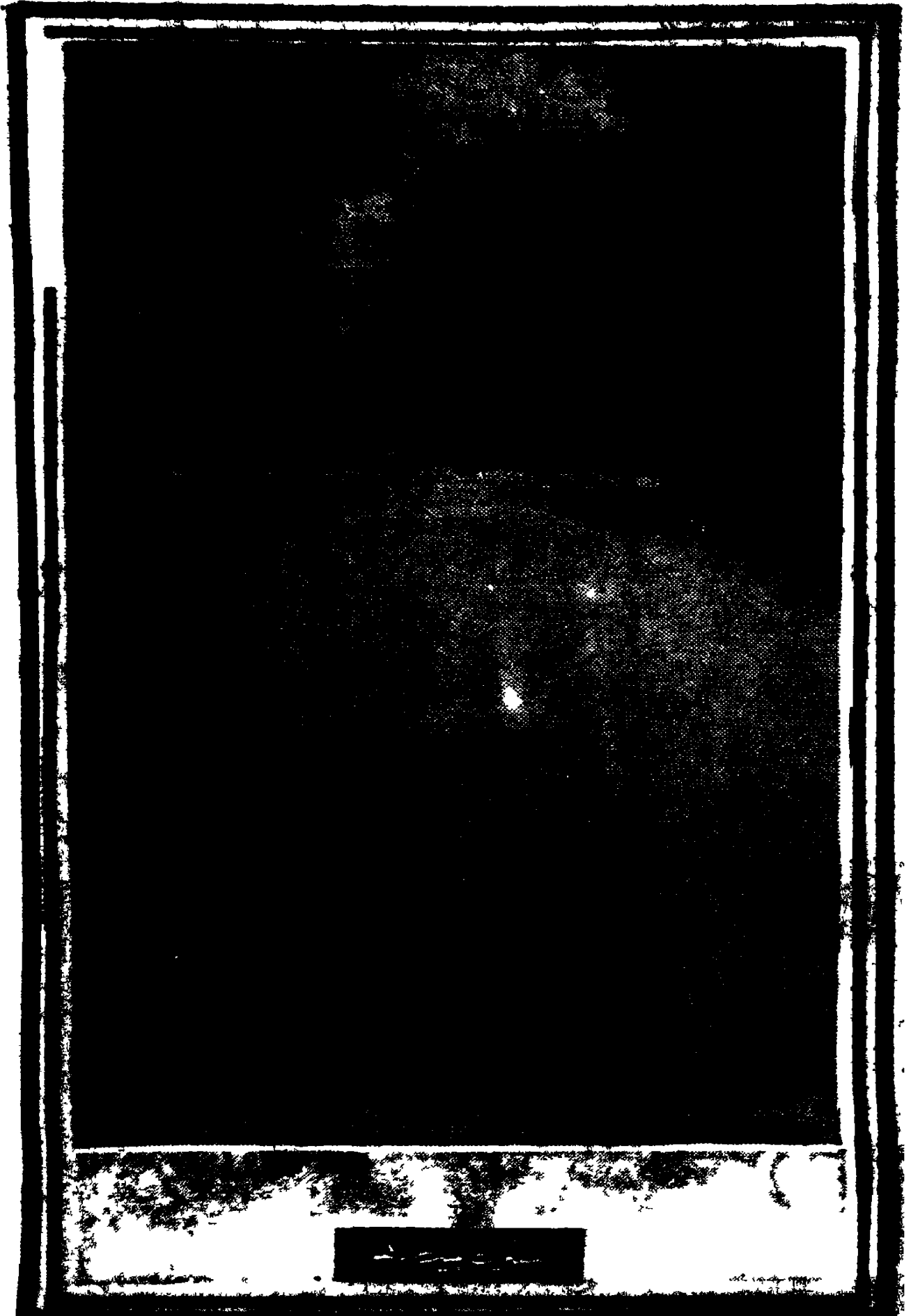
یکم فروری ۱۹۶۱ء

شورش کا شمیری

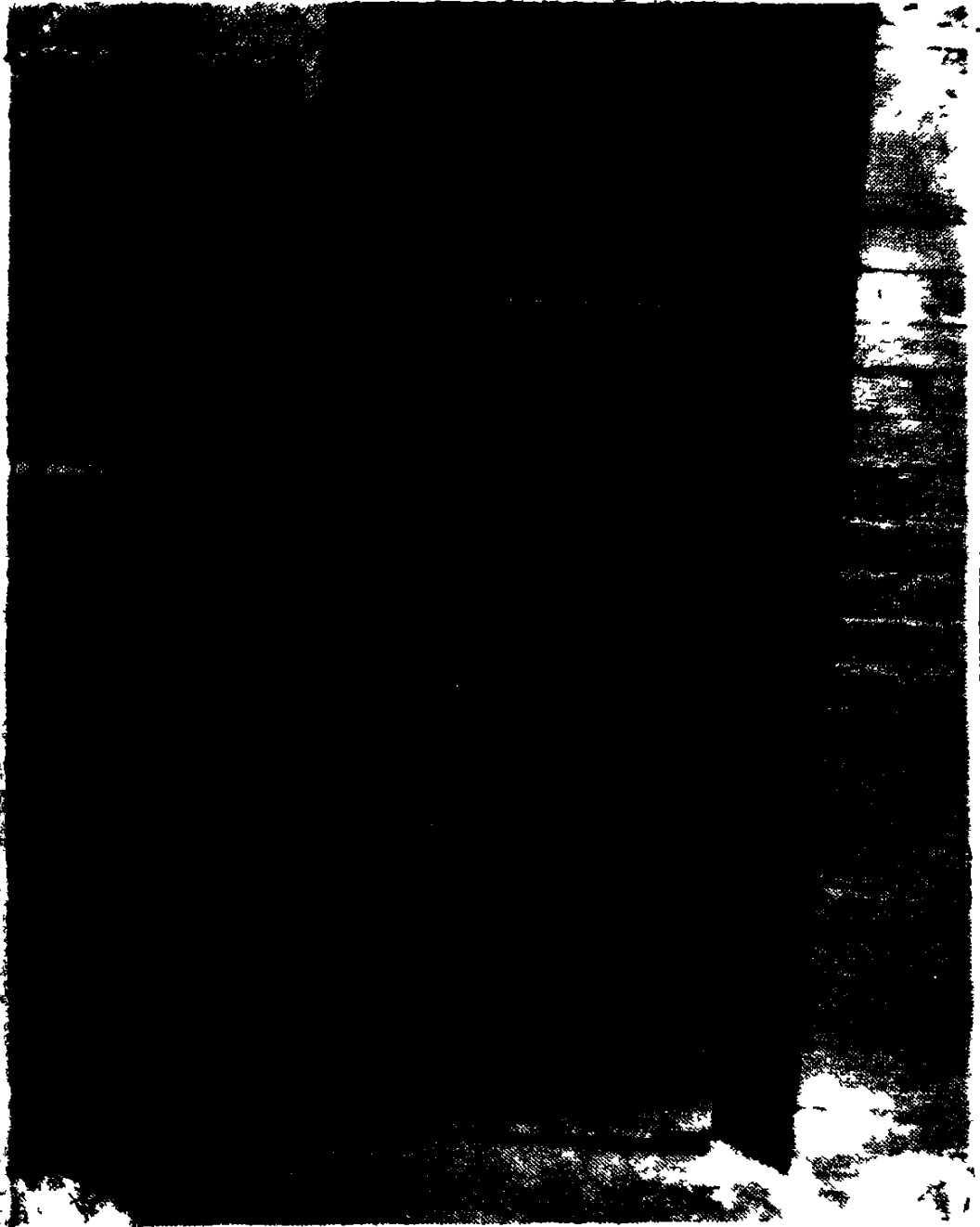
رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدُّ مُؤْنِنِي إِلَيْهِ ۝

سورہ یوسف پارہ ۱۲ آیت ۲۲

(میرے اللہ ان کی ترغیبات سے قید خانہ مجھے کہیں زیادہ محبوب ہے)



نالہ از بہرِ رمائی نہ کند مرغِ اسیر  
خورد و افسوسِ زمانے کہ گرفتار نہ بود







ہے۔ یہ قیدی وارڈ کھلاتے اور وہاں ڈیڑھی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

پہلی درونی کسی فیما کی آخری عہدہ ہے بہت غوطے قیدی اس عہدہ تک پہنچتے ہیں سبھی قیدی اس کے خفدار نہیں ہوتے بعض کڑی دفعت کے قیدی ان رعایات سے محروم ہیں۔ مثلاً ٹھکی، زہر خورانی، نکلان و شغ فطری اور زنا کے مرتکبین ان مراعات سے محروم رہتے ہیں قیدی عہدیداروں کا کام اپنے ہی ساتھیوں پر حکومت کرنا اور جیل کی چل دیواری میں انتظامیہ کا ہاتھ بٹانا ہے۔ سب انہیں بلا، کالی اور پہلی مل باقی ہے تو پھر یہ قیدیوں کے نہیں افسروں کے ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ انہیں ساتھی قیدیوں کی کھال اتارنے سے بھی مار نہیں ہوتی ہنسنے کا اشارہ ابرو پر چلتے ہیں۔

حیض پر سب کچھ بیان کر رہا اور ہم بڑی بڑی دیواروں کی ہیڈیت کو ٹکڑے ٹکڑے چلے جا رہے تھے بنجارہ ان بڑی بڑی دیواروں سے ابک ظالما زخوف کا اظہار ہو رہا تھا مگر ہم پر اس خوف کا قطعاً کوئی اثر نہ تھا میں نے حیض سے کہا ہمیں مل کر نعرے لگاتے چاہیں حیض نے کہا۔۔۔ یہاں نعرہ لگانے سے کوئی فائدہ نہیں تم اندر کے نظام سے واقف نہیں ہو یہ ہمیں آہنی دیواروں میں بانٹ دیں گے پھر کسی کو خبر نہ ہوگی کہ کون کہاں ہے؟ ہم نے اندر چلتے چلتے کوئی ایک میل لبا فاصلہ طے کیا نالے کھلتے بند ہوتے دیواریں آتیں نکل جاتیں اعلیٰ سے اعلیٰ بیروست دیواروں سے دیواریں بغل گیر مالوں کا زنجیروں سے معاف تہ، دروازوں کا دیواروں سے معاف تہ، معلوم ہوتا کہ اس دیوار کے پیچھے اب کچھ نہ ہوگا لیکن آہنی دروازے کھلتے ہی دیواروں کا ایک اور سلسلہ موجود ہوتا، لائقہ کو ٹھکڑیاں دو منزلہ مذبح پانی کے گھاٹ، سیاٹ میدان، سلاخوں کے آغوش میں بیرکس، بیرکوں کے پہلو میں بان بٹائی منج کٹائی، سوت کٹائی اور گندم سپائی کے احاطے بڑ اور پیل کے ورنخت ان کے سایہ میں خراس اور کولھو ان میں جتے ہوئے نو عمر قیدی وارڈوں کا دھول دھپا، پسینہ میں لوکی سٹرانڈ۔۔۔ غرض یہ سارا منظر ایک ایک نگاہوں سے نکل گیا۔۔۔ اپنی جگہ پہنچے تو وہاں بیس پچیس ساتھی پہلے سے موجود تھے جو ایک ہی روز پہلے گرفتار ہوئے تھے۔



حسرت ہی رہی ساتھ کے پڑھے ہوئے کالجوں میں پڑھتے اور ہوشوں میں رہتے تھے اُن سے ملاقات ہوتی تو گنتی داتا تک مچھلیں جتنیں خوش گیمیاں ہوئیں شعرو شاعری کا چرچا رہتا، اٹھ پینے کی بائیں چلتیں، بیٹھے اڑتے فرس ایک نشہ سا چھایا رہتا کسی قدر یہی نقشہ اس وقت سامنے تھا۔

میں خلقتِ ہذبِ باقی تھا والدین کی بے سرو سامانی بر جی میں کڑھتا اور حسرتوں کا ماتم کر کے سوچا کرتا کہ میرے ہم جماعت کتنے خوش قسمت ہیں جنہیں کالج اور ہوش کی زندگی میرے ہے اب بیگھر ملا تو لحظہ بھر کے لئے دماغ میں خیال سا نقش ہو گیا جیسے کالج میں داخل مل گیا ہو اور میں ہوشل میں چلا آیا ہوں۔

میرے دل پر ایسا کوئی بوجھ نہ تھا کہ جیل میں ہوں یا میری آزادی سلب ہو گئی ہے۔ تمام ساتھی ادھر ادھر اڑے پھر رہے تھے ان میں ایک دھان پان فضل الہی اختر بھی تھا جس کے یلج رنگ پر بعض بے قابو طبیعتیں مٹی جا رہی تھیں مجھ پر ایسی صورتوں کا ایک سی اثر ہوتا ہے کہ حافظہ میں غزل کے اشعار کھلنے اور بکھرنے لگتے ہیں کئی تصویریں گھومتی رہیں۔

جمدار نے گنتی بند کرنے کا اعلان کیا تو سب اپنی اپنی چلتی چلنے میں چلے گئے۔ سلاخوں کے دروازے، لوہے کا ٹبرکا، دیوار کا آہنی آویزا اور آویزے میں دو تالے۔ قبر سے دو گنتی کوٹھڑی، پانچ گنتی کی طرف پانی کی جھیر، ایک کونے میں بول براز کا برتن، تھڑے پر میچ کی چٹائی، ایک کبیل، ایک چادر ایک پرنا بیوی اور ٹھننا بھی بچھونا۔ جولائی کا مہینہ گرمی کے دن مچھر حاضر ہوا غائب گھپ اندھیرا۔ باہر اچھہ روڈ پر تانگوں کے پہیوں کی جھینیں۔ گھوڑوں کی ٹاپین لاریوں کا غل موڑوں کا شور۔ راگروں کی اکاڈ کا آوازیں، فلم کے بول گینوں کی ٹوٹی ہوئی دھنیں اور آوارہ معرعوں پر کے کاغذ۔ سنا جگنو کی روشنی سے خیالوں کا جگمگ اٹھایا ایک ماضی کے نگار خانے میں رونق سی پیدا ہو گئی۔ کتنے ہی خوبصورت چہرے، مکروہ صورتیں، خوش نما منظر، بھیاک خوب دلاویز یادیں اور ہیب مچھلیں حافظہ میں ابھرائیں اور میں ایسا ایسا ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا جہاں کوئی سا بندھن نہ تھا

کسی موڑ پر بھی ٹڑکا نہیں چلتا ہی رہا خیالوں کا سفر ایک ایک تصویر دیکھتا اور اس پر کچھ نہ کچھ سوچتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی آنکھیں کھول لیتا بھی بند کر دیتا غرض ایک آدھ گھنٹے میں رجم ماضی کا پورا عہد مٹا دیا اور نگاہ سے نکل گیا۔

---

## ہاتھ کی لکیریں

دو سال پہلے بمبئی کے طلبہ رخصت ہو رہے تھے تو السنہ شریف کے استاد مولوی نیاز محمد نے پانچ چھ شاگردوں کا ہاتھ دیکھا جو ذرا لکیر کی درجہ سے انہیں بے حد عزیز تھے۔ میرا ہاتھ دیکھتے ہی کانپ اٹھے فرمایا دوسروں کے ہاتھ تو صاف ہیں ان کی زندگی میں ایسی کوئی آفتا دیا الجھاؤ نہیں تمام لکیریں واضح میں۔ مگر تم۔۔۔ (ذرا آزرہ مولیٰ) اس کے بعد نہ مزید تعلیم پاسکو گئے اور نہ مدۃ العمر سکون حاصل ہوگا۔ تیس تیس سال کی عمر تک تمہاری زندگی میں قید و بند کے شدا مد معلوم ہوتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں واضح طور پر قید و بند کی لکیریں موجود ہیں بانی اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہیں جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ یہی ہے ہاتھ کی لکیریں بدلتی بھی رہتی ہیں۔ ممکن ہے عمر کے کسی حصے میں بدل جائیں مگر اس وقت جو نشان ابھر رہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنیسی برس سے پہلے تمہیں کسی طرح بھی سکون نہ ملے گا۔ البتہ اس کے بعد تمہاری زندگی اپنا راستہ پیدا کر لے گی اور تم قوی زندگی کے کسی حصے میں چمکنے لگو گے۔

میں ایک لحظہ کے لئے اس پیش گوئی سے خوف زدہ نہ ہوا مگر عام بانوں کی طرح ربات بھی ذہن سے نکل گئی مجھے موروثی عقائد کی پختگی پر یقین تھا میں ہاتھ کی لکیروں بنجوم کے معنوں جعفر کی پھیلے ہوئے تصویروں کے سُخردوں اور ستاروں کی گردنوں کا کبھی نائل نہ تھا بلکہ عام اصطلاح کے مطابق تو بانی تھا۔ میں سمجھتا تھا مجھ میں کوئی عیب نہیں اور جیل علیوں کے لئے ہے۔ میں ایک بیدھا سا دا نوجوان تھا میں نے کبھی تصویر تک نہ کھینچوئی تھی۔ طلبہ رخصت ہو رہے تھے تو میں نے مذہباً گروپ فوٹو میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا عام لڑکوں کی طرح مجھ میں شوخی اور شرارت تھی ہی نہیں، ساٹھی طلبہ مجھے کنواری لڑکی کہہ کر چلے گئے تھے۔ البتہ تعلیم چھٹ جانے کے بعد میرا شاعرانہ ذوق تیز ہوتا رہا حالات ناموافق تھے تنگ دستی کا راز تھا، آسودگی نے آنکھیں پھیر لی تھیں روزگار کے دروازے پر نالہ لگا ہوا تھا دل آخردل تھا و فتنہ اس پر ایک

پوٹ پڑی شاعری کے راستے خود بخود صاف ہو گئے، ہوش و شعور سمجھ میں نہیں آ رہے تھے اب محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہی لیے کئے گئے ہیں اور ان کا جو مطلب میں سمجھتا ہوں وہ تنہا ہی کوئی دوسرا سمجھتا ہو خود تاء کو بھی اس کا علم نہ ہوگا۔ — عمر کا بھی ۱۰ ور تھا۔ جب اختر شیرانی کی شاعری سے میرا کافر بڑھا وہ جو کچھ کہہ چکے یا کہہ رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ میری ہی تصویریں بنا رہے ہیں لیکن نظروں کا بد رشتہ سمجھت نام سو گیا اب جو قید ہوا تو ہاتھ کی لکیں سولانا شاہ محمد کی پیش گوئی کے مطابق ابھرنے لگیں گویا اب اور سورش کا سہری پیدا ہو رہا تھا۔

اُس رات نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا جن چیزوں کا تصور مشکل تھا یا سمجھی خواب میں منظر کل ہونا محال تھا اب کر کر کے سامنے آ رہی تھیں۔

میں واقعہ ایک نیا سفر اختیار کر چکا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں والد اور ان کے دو چار دوستوں کی معیت میں جیل روڈ سے گزر رہا تھا تو بیرونی پنجرے کے خوفناک قیدیوں کی صورتیں دیکھ کر سہم گیا تب ایک قیدی کا مطلب تھا قاتل۔ ڈاکو۔ خونی اور چور۔

اب میں خود ایک قیدی تھا اور اس دنیا میں کوئی سا خوف محسوس نہ ہو رہا تھا۔ قیدی پہر بیدار لائٹیں لیے پھیرے لگا رہا تھا۔ وہ دردانے پر رکا تو میں اٹھ کھڑا ہوا بنند غائب تھی مرحوم دنوں کا تصور بندھا ہوا تھا جو یکا یک ٹوٹ گیا اس نے مسکرا کر پوچھا۔ — نام؟

نام بتایا۔ — کہنے لگا آج دن بھر شہر میں گولی چلتی رہی ہے اب بڑا جلوس شہید گنج کی طرف جا رہا تھا حکومت سے نصاب ہو گا بہت سے لوگ مارے گئے کیتوں کے سر بھٹے پولیس اور فوج کے نوجوان بھی زخمی ہوئے ہیں کئی سونہ جوازوں کو گرفتار کر کے بہاں لایا گیا ہے جو اس جیل کے پہلے احاطہ میں ہیں اور نصف کے لگ بھگ زخمی ہیں۔ سینکڑوں افراد سنٹرل جیل میں بھی بھجوائے گئے ہیں۔

”انہیں ہمارے ساتھ کیوں نہیں رکھا گیا؟ میں نے پوچھا تو آمد قیدیوں کو ہفتہ عشرہ تک ہی رکھتے ہیں چونکہ ان کی حالت خراب ہے انہیں اس لئے بھی آپ کے ساتھ نہیں رکھا ہے“ اُس نے جواب دیا۔

گولی چلنے کی اس خبر سے مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ قیدی نمبر دار اس سے زیادہ خیر و سہ کار رُکا۔ ادھر سے گھڑی گشت ہیڈ وارڈ آ رہا تھا چونکہ قیدی عہدیداروں کو عام قیدیوں سے گپ لڑنے کی اجازت نہیں ہوتی لہذا اس کو دیکھے ہی کھسک گیا۔ میں آدھ گھنٹہ تک پریشانی کے عالم میں ٹہلتا رہا پھر لیٹ گیا۔ میرا داغ صاف طور پر گولیوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ کئی خیالی تصویریں آتی جاتی رہیں پولیس کے بہادر تشدد کا اندازہ مجھے بہت پہلے سے نقاب گولی چلنے کی خبر نے مجھے اس طرح ہلا ڈالا جیسے بھونچال کے پہلے جھٹکے ہی میں کوئی بڑی عمارت زمین پر آ رہی ہو اور منوں مٹی نلے انسانوں کی چیخیں دب گئی ہوں۔

### پارکامیلہ

پولیس کیا ہے؟ اس کے تشدد کا اندازہ یا احساس پہلے پہل مجھے دس گبارہ برس کی عمر میں ہوا تھا لاہور کے معامی میلوں میں ایک پارکامیلہ ہے جو ہر سال جون میں جہانگیر کے مقبرہ میں لگتا ہے برسوں سے یہ میلہ پُر رونق نہیں رہا اور نہ وہ پرانے لوگ ہی رہ گئے ہیں بیس پچیس سال پہلے یہ میلہ بڑے ٹھاٹھ سے ہوتا تھا امرتسر اور لاہور کبھی ایک دوسرے کے ہم زلف شہر تھے۔ ہزاروں امرتسری شریک ہوتے پیشیل ٹرینیں چلتیں پورے دور دراز ہنگامہ رہتا ہفتہ کی رات لوگ مقبرے میں گزارتے چھو لہاریاں لگاتی جاتیں اسباب کی بیسیوں ٹولیاں رات بھر جتن مناتیں گانے بجانے کی غمگین لگتیں کھانے پکے 'مجرے ہونے' دور چلتے عزم خوش نگروں کا ایک نگر آباد ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں والد بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس میلے میں گئے انہوں نے بھی مقبرے کے عقبی حصہ میں ایک کیمپ لگا رکھا تھا۔ مچ جھگل بیٹھنے کے لئے نکلے تو دیر تک واپس نہ آئے دوستوں کو تشویش ہوئی تھوڑی دیر بعد والد کے ایک دوست انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے خبر لائے کہ پولیس نے پکڑ رکھا ہے۔





حافظ کی لوح پر ابھرا۔ اسی واقعہ نے میرے دل میں برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کا بیج بویا تھا جو آج بھارت کی مختلف کلکٹریں اٹھا کر ایک تن آور درخت ہو گیا۔

### پہلی جہارت

دوسرا واقعہ طالب علمی کے زمانے کا ہے دادا انچ دنوں کے لئے مجھے امرتسر سے لاہور لے آئے یہاں میں پانچویں یا چھٹی میں پڑھتا تھا کہ تمام ملک میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا چرچا ہو رہا تھا کمیشن لاہور پہنچا تو یہاں بھی زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا گیا ریلوے اسٹیشن سے باہر چاروں طرف سڑکوں کے کنارے پر مسلح پولیس کے دستے کھڑے تھے۔ ادھر لنڈا بازار برانڈر تھر روڈ اور میکلوڈ روڈ کے سرے پر تاروں کا باڑھ باندھا گیا۔

لالہ لاجپت رائے مولانا ظفر علی خان سید عطاء اللہ شاہ بخاری چودھری افضل حق ڈاکٹر ستیہ پال وغیرہ کے زبردستی ایک عظیم الشان احتجاجی جلوس نکلا جو ریلوے اسٹیشن سے باہر مظاہرہ کرتا رہا جو کمیشن کے ارکان پلیٹ فارم سے باہر نکلے مظاہرین بے قابو ہو گئے گھڑ سوار پولیس نے مسٹر سکاٹ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی معیت میں زبردست لاکھی چارج کیا لالہ لاجپت رائے کے سینے پر سخت زخم آئے وہ چوٹ کھا کر گر پڑے۔ اسی رات موری دروازہ کے باہر ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لوگوں پر جادو کر دیا لالہ لاجپت رائے نے بڑے ہی آزر و لہجہ میں تقریر کی انہوں نے کہا — ”میرے بچو! میں اپنی عزت کا بدلہ چاہتا ہوں لاجپت رائے کے سینے پر جو لاکھیاں پڑی ہیں وہ برطانیہ کے تالوت میں آخری میخ ہو جائیں۔ نوکر شاہی نے لاکھیاں برساکر بھارت ماتا کی توہین کی ہے آج کے بعد لاجپت رائے شاید زندہ نہ رہے لیکن بھارت ماتا کی عزت اور میرے بڑھاپے کی ہنگ کا بدلہ لینا تمہاری جوان ہمتوں کا فرض ہے جاؤ آج میں تمہیں اس انتقام کی دعوت دیتا ہوں۔ میرے بچو! میں تمہیں آخری پر نام کرتا ہوں آشیر داودیتا ہوں ہندوستان تمہارے حوصلوں اور تمہارے دلوں کا راستہ دیکھ رہا ہے۔“

چند دنوں بعد لاجپت رائے سورگبش ہو گئے ان کی موت سے پورا ملک ہل گیا اس روز لاہور کے تقریباً تمام اسکول کالج اور تعلیمی ادارے بند ہو گئے لیکن دیو سماج کے منتظمین نے اسکول بند کرنے سے انکار کر دیا جو یہ تھے کہ

۱۔ دیو سماج اور آریہ سماج کے مسلک و مشرب میں بعد المشرقین تھا۔ لاجپت رائے آریہ سماج کے لیڈر تھے۔

۲۔ دیو سماجی بیانات سے کنارہ کش رہتے اور اپنے اداروں کو سیاسی آلودگیوں سے صاف رکھنا چاہتے تھے۔

۳۔ دیو سماج اسکول کے طلبہ میں آریہ سماجی نہ ہونے کے برابر تھے۔ مسلمان طلبہ اکثریت میں تھے۔ مسلمانوں کے بعد دوسرے درجہ پر سائنس دھری طلبہ تھے۔

جانکی داس نام کے ایک صاحب دیو سماج کے سیکرٹری تھے ایک پاؤں کٹا ہوا تھا جیسا کہ بیکر چلپتے آریہ سماج سے انہیں سخت اختلاف تھا انہوں نے ہندو طلبہ کی درخواست کو سختی سے مسترد کر دیا ان طلبہ کا لیڈر رام کشن سیرے پاس آیا ہم دوچار مسلمان طالب علم ان دنوں سکول میں نمایاں تھے۔ رام کشن نے کہا لاجپت رائے ملک کے بہت بڑے لیڈر تھے برطانوی سرکار کے تشدد سے ان کا دیہانت ہوا ہے ملک بھر میں ان کا سوگ منایا جا رہا ہے لاہور کے سبھی سکول بند ہو گئے ہیں لیکن جانکی داس نہیں مانتے۔ آپ ہمارا ساتھ دیں ممکن ہے اس طرح وہ مان جائیں یا پھر ہم احتجاجاً خود سنجو دھپلی کر دیں میں تیار ہو گیا چنانچہ ایک وفد بنا کر ہیڈ ماسٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے پڈت رام نارائن ہیڈ ماسٹر تھے بائی دیو سماج کے داماد اور کٹر ناسک لیکن انتہائی شریف نیک اور بے آزار انہوں نے مُذکر کیا کہ سیکرٹری نہیں مانتا ہم ان سے اجازت لے کر سیکرٹری کے پاس چلے گئے۔ جانکی داس ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا اٹا ڈانٹنے لگا اس کا جواب پا کر ہم نے کھڑے کھڑے ٹینگ کی اور طے کیا کہ احتجاجاً کلاسوں سے نکل آنا چاہیے ہیڈ ماسٹر کے نام سے اس مضمون کا ایک نوٹس تمام

کلاسوں میں بھجوا دیا کہ ابھی گھنٹی بجنے پر اسکول لالہ لاجپت رائے کی موت کے باعث بند کیا جا رہا ہے جب یہ نوٹس تمام کلاسوں میں پھرایا جا چکا تو میں نے آگے بڑھ کر چھٹی کی لمبی گھنٹی بجا دی طلبہ باہر آگئے سیکرٹری اور ہیڈ ماسٹر گھبرا کر اپنے دفتر سے نکل آئے اساتذہ کو طلبہ کے پیچھے بھجوا یا پکارتے رہے کہ نوٹس اور گھنٹہ دونو فرضی ہیں مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا البتہ سکول سے نکال دینے کی دھمکی کسی قدر لاگ رہ گئی۔ طلبہ کا بڑا حصہ واپس آگیا خود رام کشن لوٹ آیا مجھے مولوی نیاز محمد نے بہتیرا سمجھایا مگر میں طرح دے کر نکل گیا اگلے روز شام آگئی تمام طلبہ کو ہال میں اکٹھا کیا گیا لالہ جانکی داس نے سخت ناراضی کا اظہار کیا ہیڈ ماسٹر موجود نہیں تھے۔ سکیڈ ماسٹر نے اس سارے قضیہ کا سر غنہ مجھے قرار دیا۔ ہاتھ پر دس بید لگائے اور پانچ روپیہ جرمانہ کیا البتہ اسکول سے نہیں نکالا ایک تو میں کلاس میں ذہین طالب علم تھا دوسرے مولوی نیاز محمد مجھ پر بید مہربان تھے وہ مجھے عام طلبہ سے کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے تھے۔ جانکی داس کو پتہ چل گیا تھا کہ سٹرائیک کا اصل محرک کون تھا اس نے کس طرح دغا کی میں نے توفی الجملہ اپنے قول کی لاج رکھی تھی اس عمر میں لاجپت رائے کی موت کا مطلب صرف چھٹی تھا۔

تھوڑے دنوں بعد لاجپت رائے کی موت کا بدلہ چکایا گیا بھگت سنگھ اور ان کے انقلابی ساتھی مسٹر سکاٹ کی تلاش میں تھے کہ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر کا ایک سارجنٹ سانڈرس ان کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ بھگت سنگھ فائر کر کے بھاگ بھاگ ڈی اے وی کالج میں گھس گئے جو سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر کے عین سامنے تھا کپاؤنڈ سے ایور ویک کالج کو نکلے اس کے عقبی حصہ سے دیو سماج اسکول کی گراؤنڈ تک پہنچے وہاں سے سیکرٹریٹ کی پشت کے ساتھ ساتھ چوہر جی کی طرف نکل گئے بھگت سنگھ بھاگتا دوڑتا سن سے نکل گیا میں اس وقت اسکول کی گراؤنڈ میں کھیل رہا تھا گھروٹے ہوئے اخباری ضمیموں سے پتہ چلا کہ سانڈرس قتل کر دیا گیا اور اس علیہ کے نوجوان فائر کر کے غائب ہو گئے ہیں۔

## بال بھارت سجا

۱۹۳۰ء میں ہاتھ کا ندھی نے نکلین ستیہ گرہ شروع کی تو ان کے ڈانڈی مارچ نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ ان کی گرفتاری سے ایک ملونان اٹھ کھڑا ہوا عام ہڑتال ہو گئی لاہور میں اس روز بڑا مورچہ ہوا کالج اور اسکول بند ہو گئے طلبہ کی ٹولیوں نے کوچرانوں پر دباؤ ڈال کر تانکے کھلا دیے ایک آدمہ جگہ مزاحمت ہوئی۔ عام مسلمان کھلے دل سے کامیوں میں شریک دتھے لیکن ان کے دل میں کانگریس کے خلاف کوئی جذبہ ناراضی بھی نہ تھا۔ اس ہڑتال میں انہوں نے بھی حصہ لیا۔۔۔ میں ہڑتال دیکھتا دکھاتا ریلوے اسٹیشن کی طرف آکھلا۔ میکلوڈ روڈ پر ریلوے پولیس لائن کے عین سامنے مت سے طلبہ نے ایک تانگہ گھیر رکھا تھا اور کچران سے گھوڑا کھول دینے کا لقا تھا کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک چھتہ دار ہیڈ کانسٹیبل موٹا سا ڈنڈا لے کر بیک سے نکلا اور ان طلبہ کو بے تحاشا پیٹنے لگا عام طلبہ بھاگ گئے مگر ایک خوش روٹ کا ڈنڈا مارا اُس نے بڑی ہمت سے ڈنڈے کھائے 'گرا' اٹھا 'پھر گرا' پھر اٹھا، حتیٰ کہ اُس کے سر سے خون بننے لگا مٹھیرے اندر ایک تحریک سی پیدا ہو گئی میں نے ڈنڈا چھیننا چاہا لیکن ظالم نے میرے ہاتھیں گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ میں بلبلا اٹھا اور پٹائی ہوتی مگر سامنے ہی پولیس کے جنگلے سے ایک گورہ سا جنت پھرتی سے نکلا اور ہیڈ کانسٹیبل سے ڈنڈا چھین لیا اُسے سخت سست کہا اب شرک یر ہم دونو رہ گئے لیکن دونو ایک دوسرے سے اجنبی اس کے بدن پر کافی چوٹیں آئی تھیں اور پیشانی کے بائیں طرف ایک زخم سا بن گیا تھا میرا بائیں گال سوچ گیا دانستوں میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا نکسیر بھوٹی اور قمیص پر لہو کی دھاریاں بن گئیں۔۔۔ اس طرح ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔ اُسے یہ جان کر کسی قدر حیرت ہوئی کہ میں مسلمان ہوں وہ ڈی اے وی ہائی اسکول لاہور میں نویں جماعت کا طالب علم تھا نام ادم پرکاش تھا اور باب کا نام دولت رام۔ دولت رام انارکلی میں شراب کا ٹھیکیدار تھا انسان زندگی میں بہت سے خوبصورت چہرے

دیکھتا ہے لیکن اوم و اتھی لچھن و رام کا مکس تھا حسنِ اتفاق نے ہمیں اکٹھا کر دیا۔ اُس نے اور میں نے بنگالی مملہ کے باہر تھڑے پر بیٹھ کر بال بھارت بھما کی بنا اور کھی توری دروانسے کے باہر باغ میں ایک کیمپ لگایا وہ صدر بنائیں سیکرٹری آگے چل کر یہ نقشہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔

اوم خوش آواز تھا عموماً جلسوں میں نظمیں پڑھتا اور سارا جاتا کبھی کبھار تقریر بھی کرتا۔ تقریریں رسمی ہوتیں انگریز نظام ہیں بدیسی راج ختم کر دو ہم سوراج چاہتے ہیں کھدر پتو مہاتا گاندھی کی جے وغیرہ اس کی چٹری میں ذرہ بھر خوف نہ تھا لوگ اس کو آشیرا دوتے، وہ دنوں ہی میں بچوں کا لیڈر ہو گیا۔

ادھر دو چار روز میں کانگریس کو خلاف قانون فرار دے دیا گیا نوجوان بھارت بھما پر بھی یہی پتی بڑے بڑے نیڈر بنزار یا بندگان خدا کو ساتھ لے کر جیل چلے گئے، بال بھارت بھما کا کیمپ ہفتہ عشرہ ہی میں پر رونق ہو گیا بچوں کی ایک ڈار جم ہو گئی، لنگر کھل گیا لوگوں نے اس خوش دلی سے دان دیا کہ عطیات کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ کھی، دودھ، وہی، چاول، آٹا، سبزی، پھل، روپے صبح و شام سُن کی طرح برستے تھے اس سُن ہی سے کئی مہاشے جو بچوں کے کٹوڈین ہو کر آرابھے تھے خوردہ فروش سے تھوک فروش ہو گئے۔ کیمپ وسیع ہوتا گیا مسلمان ہم تین ہی تھے میں نذیر اور شہاب دین۔ نذیر کے والد مزاجا کانگریسی تھے میں مورتحال کی بدولت انقلابی ہو گیا، شہاب دین کیمپ سے قریب ہی گنپت روڈ پر رہتا تھا بے پڑھا ہونے کے باوجود پنجابی میں شعر کہہ لیتا اور خوش آواز تھا اس کا بڑا بھائی چتھس بنائے کی دکان کرتا، دونو خاکروب سے مسلمان ہوئے تھے پنجاب میں انہیں مستی کہتے ہیں، یہ ایک ایسے صاحب کے کراہ دار تھے جو ذی حیثیت بھی تھا اور پولیس کا معزز و معتد بھی نغمیوں کا مملہ تھا اور وہ تمام لوگ اسکی میراث تھے۔ یہ شام ہوتے ہی اپنی چارپائی بازار کے ٹکڑے پر بچھا کر بیٹھ جاتا دو چار حواری جمع ہوتے گپیں لڑانی باتیں جھوٹ چلتا، گالیاں جکتے، اور جو لوگ قند ہو رہے تھے اُن پر تبرے تو لے جاتے، ان صاحب نے شہاب الدین کو بچوں کی

دوکان سے اٹھایا اور سرکاری ایما پر بال بھارت بھائی بھیج دیا۔ شہاب الدین نے مخبری شروع کی۔ نفس کی غذا چننا رہا اور کئی بچوں کو آوارہ کیا۔ جب بال بھارت بھائی کا شہزادہ بھگیا اور شہاب الدین کی قلعی کھل گئی تو ان بزرگ نے اسے سالار بنا کر مسلمان نوجوانوں کا ایک طینس یار کیا جس میں تقریباً سبھی چنگیز یا مسلی تھے اور اسے، جیش کا یہ کام تھا کہ جہاں ہندو طلبہ یا ہندو لڑکیاں پکٹتے کرتیں وہاں یہ لوگ پولیس کے امدادی ہوتے یا پھر شہاب الدین کے ساتھ اس نم کے ننگے کیے گئے پھرتے کہ شریف لوگ کانوں میں لٹکیاں ٹھونس لیتے، ان گیتوں کا ڈھکا چھاپا مطلب یہ تھا کہ جینا فروتس لڑکیاں اور خود فروش لڑکے کھد رہیں کہ انقلاب مانگ رہے ہیں۔ یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب مسلمانوں کی اپنی اسی تحریک کا نام و نشان تک نہ تھا اور پشتینی و فادار انہیں اس طرح استعمال کرتے تھے۔

ایک روز پو پھٹنے سے کچھ ہی پہلے اوم اور نذیر میرے ہاں پہنچے، میں گھر کے صحن میں سو رہا تھا، میرے بالوں کو نشانہ کرتے ہوئے نذیر نے بھنبھوڑا۔

اٹھ جاگ دطن دیا شیرا گھر لٹیا فرنگیاں تیرا  
(دطن کے شیر اٹھ فرنگیوں نے تیرا گھر لوٹ لیا ہے)

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا معلوم ہوا کہ رات دو اڑھائی بجے نتھورام ٹی مجسٹریٹ نے سارا کیمپ اٹھوایا ہے پولیس ہر چیز اٹھا کر لے گئی ہے تنبو، قنائیں، پھولداریاں، سامان خور و نوش، جھنڈے وغیرہ غرض ایک ساٹ میدان رہ گیا ہے رضا کاروں نے مزاحمت کی پولیس نے گرفتار کر لیا ایک روز پہلے کیمپ اٹھانے کا نوٹس ملا تھا اور میں نے جنرل میکرٹری کی حیثیت سے اس پر دستخط کئے تھے نتیجہ متوقع تھا۔

ادھر موقع پر سیکڑوں طلبہ جمع تھے، دوبارہ کیمپ لگانے کا اعلان کیا، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا دیں جو ادھر ادھر نکل گئیں شام تک تین چار ہزار روپیہ جمع ہو گیا ہندو خواتین نے گھنچا بادل، آٹا، مٹھائی کے ڈبیر لگا دیئے، سورج غروب ہونے سے پہلے ایک میلا سا لگ گیا تنبو قنائیں پھولداریاں اسی طرح نصب ہو گئیں

غرض ایک آشرم سا بن گیا — پہلے کی بہ نسبت رضا کاروں کا پرہ بھی مضبوط کر دیا گیا۔

نتھورام کنسٹیبل سے ترقی کر کے سٹی مجسٹریٹ کے عہدہ تک پہنچا تھا شروع شروع میں اُس نے سکھوں کے مورچے پرستم نوڑے تھے۔ وہاں سے اُسکی ترقی کا راتہ کھلا اور یہاں تک پہنچا اب سٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے اُس نے کانگریس کی منگائی تحریک کو کچلنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ عورتوں بچوں نوجوانوں کے مختلف مظاہروں پر لاٹھی چارج کرنا اس کا معمول ہو گیا تھا لاہور تھا کہ نتھورام ہائے ہائے، ”ٹوڈی بچہ ہائے ہائے“ کے نعروں سے گونج رہا تھا اور یہ گویا لاہور والوں کا روزمرہ یا محاورہ ہو گیا تھا جس روز کیمپ ٹا ہزاروں خواتین نے کچہری کے باہر نتھورام کا سیاہ پکیا لیکن نتھورام بڑا ہی بُرا اور وفادار تھا وہ انگریزوں کے لئے جان دے سکتا تھا مگر اُن کے خلاف نعرہ سننے کے لئے تیار نہ تھا اپنے خلاف گالوں کی بوچھاڑ میں بھی ہنستا رہا لڑکیاں سیاہا کر رہی تھیں لڑکے گالیاں اُڑا رہے تھے، مگر وہ سب کچھ مضم کرنے کا عادی ہو گیا تھا اگلے روز بھی ٹھیک اپنے وقت پر پولیس کی جمعیت لے کر اُس نے چھاپہ مارا، کیمپ، اکھاڑ پھینکا جن رضا کاروں نے مدافعت کی انہیں بُری طرح پٹائی بلکہ بعض خوش رُو لڑکوں کے گالوں کو سپا ہیوں نے اس زور سے کاٹا کہ گڑھے پڑ گئے، چاروں طرف انجیرا سپاہی لوٹ رہے تھے اور کیمپ لُٹ رہا تھا — اس روز بھی پو پھٹنے سے پہلے پہلے کچھ لے گئے، بال بھارت بجا خلاف قانون قرار دے دی گئی صبح ہوئی تو مظاہرے شروع ہو گئے پولیس اوم کے تعاقب میں تھی اُسکو جلوس ہی میں گرفتار کر لیا گیا۔

میں کنورسین اور جیالال گھر میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیئے، تجربہ تھا نہیں، نتھورام کو تہدید ہی خط لکھنے شروع کئے اوم پر کاشس کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ پولیس کہاں لے گئی ہے اُس کے والدین بھی سخت پریشان تھے اگلے ہی دن یا ایک دو روز کے وقفہ سے اوم میرے پاس آیا اور گھر



سے اٹھا کر مجھے باہر لے گیا اُس کا چہرہ اُرا ہوا تھا گالوں پر وائٹ کاٹے سے بہت سے نشان تھے ہونٹوں پر بھی  
چھوٹے زخم تھے۔

### اوم پرکاش

ہم دونوں اہلس پی ایس کے ہال کے عقبی باغیچہ میں بیٹے گئے اور وہاں درختوں کے ایک ٹھلے میں ہو گئے  
اوم نے میرے زانو پر اپنا سر رکھ دیا دل اُس کا ڈھال ہو رہا تھا کہنے لگا معلوم نہ تھا کہ بولیں اتنی ذلیل موتی ہے؟  
اپنی لرزہ نیز سر نہ شمت شروع کی تو اُسکی غزالیں آنکھوں سے آنسوؤں کی چھوڑ بہہ گئی۔ سولہ برس کا ایک  
نوجوورت کھلونا جس کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ کرشن کی مانسری کے سروں سے اُس کا پیکر بنا تھا لیکن آج یہ سُتر  
ٹوٹ گئے تھے اُس نے اپنا باجامہ دکھا جو خون سے لکھڑا ہوا تھا پھر اُس نے کہا تم میرے بھائی ہو میں تم  
سے چھپانا نہیں چاہتا یہ دیکھو مقعد پر زخم ہی زخم ہیں پہلا شکاری کو تو ال تھا پھر ایک درجن او باس جس جو  
رات بھر میرے مُنہ اور مقعد کو گرہ لگانے رہے جب ان کی ہمتیں تھک گئیں تو ترنگا جلا کر اُس کی راکھ  
میرے زخموں پر رکھ دی یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں بدلیاں سمٹ آئیں وہ ضبط سے باہر ہو گیا۔  
اُس نے کہا۔

”بھائی۔۔۔ میرا جی اچاٹ ہو گیا ہے اب میں جینا نہیں چاہتا اس سے موت  
بھلی ہے۔۔۔ یہ لو میرا ظلم میری آخری نشانی ہے اس واقعہ کا کسی اور سے ذکر نہیں کیا صرف  
تمہیں یہ کہانی سنا رہا ہوں پھر اُس نے ایک لمبی سی آہ بھری اور رکتے رکتے بولا مجھے بچہ کانر  
کہہ کہہ کر انہوں نے اپنے نفس کی غذا بنایا ہے۔“

اوم کی ان باتوں نے مجھے تھرا دیا میں کانپ اُٹھا خود بھی بے اختیار ہو کر رونے لگا اس سناٹے اور  
تخیلے میں ہم دو اناڈی رو رہے تھے پندرہ سولہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کتنی ہی دیر تک ہم روتے

رہے آخر میں اُسے گھر چھوڑ آیا لیکن وہ ایک مرجایا ہوا پھول تھا جسکی پتھریوں کے دریشے سکھ گئے تھے۔! گھر لٹا تو وادی اماں نے بتایا کہ نظام (میرے والد) کو پسیہ اخبار چوکی میں تھانیدار نے بلایا ہے میں سم سا گیا ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ والد آگئے ان کے ساتھ جلال الدین ملک اور علی حسن سید پولیس کا مقدمہ اور مخبر دونو تھے ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی ہمراہ تھا والد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بے تماشائیتنا شروع کیا۔ جوتے، گھونے، تھپڑ، ٹھڈے، اینٹیں، روڑے، دھونکنی، چٹنا، دست پناہ، فرض آدمہ گھنٹہ تک پٹائی ہوتی رہی سر پھٹ گیا چہرہ پر ضرب آگئی آنکھ زخمی ہو گئی کھینوں پر خراشوں سے چنانچ بڑگے جوڑ جوڑ دیکھنے لگا پولیس کے برخوردار تماشادیکھتے رہے بہر حال سب کا جی سیر ہو گیا جان نے اماں پائی والد نے مجھے امرتسر واپس بھرانے کا فیصلہ کر دیا۔ میں استعمار دشمنی میں اور سچتہ ہو گیا ایک ناپختہ ذہن ہونے کے باوجود اب اس نظام کا ایک پختہ دشمن تھا۔

دوسرے بائیس روز میں اوم کے ہاں گیا تو اس کے پتانے بتایا کہ وہ سخت بیمار ہے اور گاؤں چلا گیا ہے کوئی ہفتہ بعد دوبارہ گیا تو اُس کی مائے نے کہا میں گاؤں جا رہی ہوں اُس کی بہن کا خط آیا ہے کہ اوم کی حالت اچھی نہیں پوتڑوں سے خون آنا اور منہ سے خون تھوکتا ہے، ماں کا چہرہ اشکبار ہو گیا میں امرتسر چلا گیا۔

وہاں کوئی ڈیڑھ مہینہ رہا لیکن اوم مجھے رہ رہ کر یاد آتا، ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ دل کی نظریں اُدھر ہی لگی رہتیں۔ اس پر جو بیٹی، محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر بیت چکی ہے۔ اس کے یہ لفظ میرے کانوں میں رہ رہ کر گونج رہے تھے کہ مجھے بچہ کافر کہہ کر اس بیجانہ سلوک کا مستحق سمجھا گیا۔

بس میں ہوتا تو میں اُڑ کے اُس کے پاس پہنچ جاتا تاہم بندشوں کو نقب لگا کر ایک روز میں لاہور آگیا اس کے پتہ کی دوکان پر گیا نوکرنے کہا لالہ جی گھر میں ہیں اوم جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ انتقال ہو گیا ہے؟ میرے دل پر جیسے کسی نے منوں مٹی رکھ دی ہو جی کڑا کر کے اس کے گھر پہنچاؤ کیا ماں بھاری

مارنے لگی بڑی دیر بعد آٹے ہو بیٹا؛ اوم کی تو چٹا بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے وہ تیں بہت یاد کرتا تھا اکیس  
 دن ہو گئے ہیں اب میں تو گنگا جی پھول لے جا رہی ہوں؛ ساتھ چلیں گے؛  
 آہ امیرا اکلوتا بچہ — شتر و کھائے؛

میں ناندھی اندر بل گیا میں نے بدیر سویر اپنے سارے زخم بھلا دیئے لیکن یہ زخم ہمیشہ ہی  
 رستا رہا قید کی پہلی رات جب میں سوچ رہا تھا تو اس زخم کا گھاؤ اور بھی گہرا ہو گیا اور آج جب یہ واقعہ  
 لکھ رہا ہوں اوم میرے سامنے کھڑا ہے اس کے زخم پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں وہ کہہ رہا ہے۔  
 اوم پرکاش کی کہانی لکھ کر کیا کرو گے؛ شہاب دین کی کہانی نلکھو؛

## شقاوت کی انتہا

ہمارے ان ساتھیوں میں ایک اور کم عمر طالب علم راجیال تھا صبح بنا رس کی تصویر مرتقی میر کے لکھنؤ میں ہوتا تو وہ اپنے محلہ خیال میں اُس کی پوجا کرتے؛ پولیس نے دوسری دفعہ چھاپہ مارا تو وہ بال بھارت سمحا کیمپ میں تھا پولیس نے اندھیرے میں رضا کاروں کی کمپنی سے ذائقہ بدلنا راجیال نے ایک روایت کے مطابق سی آئی ڈی یا کار خاص کے کسی گماشتے کو گالی دی اور زناٹے کا ایک طمانچہ مارا تھا اس برکنسٹیل راجیال کو اٹھا کر ساتھ لے گئے رات بھر اُس سے مامٹا کیا نتیجتاً وہ جان ہار ہو گیا پولیس والے لاری میں لا کر گوالنڈی کے پاس رتن چند کے نلاب میں پھینک گئے چوبیس گھنٹے بعد لاسٹ تیر کر اوپر آگئی بھول سا چہرہ دسے کی طرح سیاہ ہے چکا تھا رنسا روں پر دانتوں کے نشان تھے جسم اس بُری طرح بد رنگ ہو چکا تھا کہ خوف آنا تھا گلے میں کھدر کا خون آلود کرما اور چوتڑوں پر رسی سے ترنگا بندھا ہوا تمام نہر میں شور مچ گیا۔ جگہ جگہ اس اندھے ظلم پر احتجاج ہونے لگا اُرتھی کا زبردست جلوس نکلا پولیس نے لالھی چارج کیا لوگوں سے پرچم چھین لئے پولیس کا شعار ہو گیا تھا کہ ترنگا چھین لیتی دن بھر میں جتنے پرچم جمع ہوتے انہیں اکٹھا کر کے جلا یا جاتا انکی راکھ سے چلمیں بھری جاتیں اور اس طرح کو توالی میں ان نوجوانوں کو پڑایا جاتا جو سول نافرمانی میں پکڑے جاتے۔ یہ واقعات اُس زمانے میں ہر روز ہو رہے تھے جیل خانے بھر چکے تھے کوئی ٹاواں ٹاواں آدمی جیل بھیجا جاتا اور نہ عام مظاہرین کو جلوس یا جلسے سے پکڑ کر پولیس والے کہیں دور درازے میں جھوڑا آتے انہیں میلوں میل چل کے آنا پڑتا لیکن اس تمام ہیئت کے باوجود لوگوں کا ولولہ افسردہ نہ ہوا ایک چھوٹی سی جنگاری سے شعلے بھڑک اُٹھتے اور لوگ ”انقلاب زندہ باد“ ”ہندوستان آزاد“ اور ”ہماتما گاندھی کی جے“ کے نعروں سے زمین آسمان ایک کر دیتے تھے۔

## شہید گنج کا محاذ

اس رات بہ تمام تصوریں ببری آنکھوں میں پھرتی رہیں میں کسی طرح بھی سو نہ سکا۔ سوچتا ہی رہا شب عوسی نہ تھی تب اسبری تھی نیند نے جیسے قسم کھالی سو نہ دار نے تالا کھٹکھٹا باتوں نے۔ وقت پوچھا

”آپ سوئے نہیں؟“ غرور بولا۔

”نہیں بھائی نیند ہی نہیں آرہی ہے“

”مجھ کاٹتے ہوں گے، سو جا یہ بہاں منہ اندھیے گنتی موتی، اور جاگنا ٹیٹا نے قید کی پہلی رات وحشت ناک ہونی ہے گھبرائیے نہیں اچھے بڑے دن سب کٹ جاتے ہیں آپ لوگ تو چند روز کے لئے آئے ہیں غرور نے خود ہی سوال بنائے خود ہی جواب دے ڈالے۔

میں نے صرف وقت پوچھا تھا، دوبارہ پوچھا تو کہنے لگا دو بج چکے ہیں کنتی کھٹنے میں تین گھنٹے باقی ہیں وہ گھڑی گشت جمہدار کے ساتھ چلا گیا مگر آنگلے لگ گئی پھر اُدھوری نیند ہی بس نمابلی نے اُٹھا دیا۔ ”بول جوان کی لیکار نے جگایا۔ جمہدار ایک ایک کو گھڑی کے سامنے بول جوان کی صدا دیتا اور سوں ہاں میں جواب لبتا ہوا نکل گیا۔ سب اچھا پرتا لے کھل گئے تمام قیدی قطار در قطار بیٹھ گئے جمہدار نے گنا، در سن پایا ریسٹر پر دستخط کئے اور ڈیوڑھی بھجوا دیا۔ ہم لوگ نہانے دھونے میں لگ گئے انہی میں سورج نکل آیا کھانا آگیا بھوک تیز تھی سبزی کا مال وال سے بھی پتلا تھا جیسے گھاس اُبال دی ہو تھوڑی ہی دیر میں ڈیوڑھی سے بچہ آگیا۔ مقدمہ کی پیشی ہے ہم لوگ جو تقریر میں مانوہ تھے تاریخ پر چلے گئے یولیس کی بندلاری میں کو تو الی پہنچے تو شہر کا مال ہی دگر گوں تھا۔ گورہ فوج نے کیتی اور دہلی دروازے سے لے کر شاہ محمد غوث تک تمام علاقہ کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مسلمان فوج غائب تھی کچھ جھنڈ نے بارخ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے معلوم ہوا کل سے گولی چل رہی ہے مسلمان فوج والوں نے مورچہ باندھ رکھا ہے ایک شہید ہوتا

تو دوسرا اُسکی جگہ لے لیتا ہے گورے چُن چُن کر گولی مارتے ہیں ابھی تک کسی شخص نے پیٹھے پر گولی نہیں کھائی سب سینہ ہی پر گولی کھا رہے ہیں چوبلیں گھٹے گزر گئے مگر پولیس اور فوج سے مورچہ نہ ٹوٹا ہم نے قیدی گاڑی سے دیکھا تو بہت سے گوروں کے سر پٹھے ہوئے تھے ہر طرف تصادم اور دہشت کا دور دورہ تھا ہمیں گاڑی سے اتارا گیا بلکہ پیش کئے بغیر تارینج دی گئی ہم نے گاڑی ہی میں نعرے لگانے شروع کئے کئی دروازے کے ہجوم نے ہمارے ساتھ اپنی آوازیں ملا دیں۔ اتنے میں وہاں بھی گولی چلنے لگی ہمیں تو فوراً واپس کر دیا گیا مگر کئی دروازے والوں نے جب دیکھا کہ ان کے دونوں جوان مارے گئے ہیں تو کفن پہن کر ڈٹ گئے دہلی دروازے کے مورچہ پر بھی یہی ہوا اُدھر سکھ اور مسلمان رجمنٹوں میں تصادم کا اندیشہ پیدا ہو گیا گورنر کو کو تو والی آنا پڑا۔ سرکار پرست مسلمان جو کچھ بھی تھے ظاہر تھا ملک فیروز خان نون نے گورنر کی گھڑکیوں سے زچ ہو کر شہر کے سرکاری مسلمانوں کو جمع کیا میرزا معراج الدین سپرنٹنڈنٹ کی روایتی وفاداری سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مولانا اختر علی خان مجمع کے پاس گئے اور والد کا نام لیکر ہجوم کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ حرام موت مرنے سے کوئی فائدہ نہیں، غرض سرکف نوجوانوں کو پیچ و خم میں لاکر مورچہ تڑوا ڈالا اور اس طرح ایک گمشدہ امن واپس آ گیا۔

### شیر زمان

اُس روز جیل میں بھی بہت سے ساتھیوں کا اضافہ ہوا اکثر زخموں سے چور تھے ان کے سروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ سب مرچے سے گرفتار کر کے لائے گئے تھے، انہی میں ایک نوجوان شیر زمان بھی تھا۔

شیر زمان میانوالی کا رہنے والا تھا نہایت قبول صورت سترا اٹھارہ سال کا سن ہو گا لاہور کی کسی مسجد میں درویش تھا اور شاید کسی عربی مدرسہ کا طالب علم۔ میں دوسرے روز جامع مسجد سے

تقریر کے باہر نکلتے تو پولیس کی گارڈیں گٹھا کی طرح ٹلی کھڑی تھیں میرے ارد گرد سی آئی ڈی والوں نے مسجد ہی میں مظاہر حقیقت کا دائرہ سا بنالیا تھا انہیں پریشانی یہ تھی کہ پہلے روز تقریر کے میں روپوش ہو گیا تھا اور وہ رات بھر ادھر ادھر تلاش کرتے پھرے تھے کئی دستوں سے ان کی جھڑپیں ہو چکی تھیں اب وہ مجھے کہاں جانے دیتے، باہر نکلتے ہی ان عقیدت کیشوں کی اصل تدبیریں آشکار ہو گئیں پولیس نے فوراً ہی بڑھ کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رائفلوں کی بارٹھ کھینچ دی کہ اس سے آگے کوئی نہیں آئے گا۔ سی آئی ڈی کے نمازی گناہتے جو اندر سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے آ رہے تھے اب نعرہ بازوں کی نشاندہی کر رہے تھے لوگوں نے جوش میں ہماری طرف بڑھنا شروع کیا پولیس نے لاطینی چارج کا حکم دے دیا ہجوم بھاگا نہیں، ادھر ادھر کبیر گیا پولیس کو غصہ آیا لوگوں نے پتھراؤ کیا حتیٰ کہ مسجد کی دیوار کو کین گاہ بالیا، اتنے میں ایک نوجوان آگے بڑھا اور پیچھے سے سی آئی ڈی کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو چوڑیوں پر ٹھٹھا دے مارا اس کے ٹھٹھا کھانے سے ہمارا حلقہ ٹوٹ گیا ہم نے فغرو ہونا چاہا مگر پولیس نے فوراً ہی حصار باندھ لیا سپرنٹنڈنٹ پولیس — قیدی گاڑی ہوانے کے لئے چننا رہا معلوم ہوا کہ بڑے دروازے پر لوگوں نے گاڑی کو گھیر رکھا ہے — جس نوجوان نے ٹھٹھا مارا تھا اس کو ایک پھتے دار سب انسپکٹرنے اس بڑی طرح پٹیا کہ بہو لہان ہو گیا ہجوم اس سے اور بھی بھرا اور بگڑا۔ جھروں کی چھتوں اور مسجد کے چوڑوں سے نشت باری تیسر ہو گئی پولیس نے دوڑنا شروع کیا انہوں نے بند گاڑی آگئی مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو فوراً ہی اس میں بٹھا دیا گیا کپتان پولیس نے حکم دیا قلعہ میں لے جاؤ مگر اس سے پہلے کہ گاڑی ٹارٹ ہو۔ اس کا پھلا پیہ پھٹ چکا تھا — شیر زمان نے گاڑی کے پیہ میں خنجر بھونک دیا، ٹائمر کے دو ٹکڑے ہو گئے، واہ ناکارہ ہو گئی شیر زمان کے پیچھے دو پاہی دوڑے مگر وہ اتنی بھرتی سے ٹائمر پھاڑ کر مسجد میں گھس گیا کہ پولیس منہ بکتی رہ گئی — ہمیں اس گاڑی سے اتار کر سپرنٹنڈنٹ کی کار میں بٹھایا گیا — کار صدر دروازہ کی طرف مڑتے ہی بارہ درمی کے پاس کسی فوری خرابی سے ڈک

گئی شیز زمان صدر دروازے سے نکلا تھانی حجروں سے ہونا ہوا کار تک پہنچا، خبر نکالا، ابھی مائروں پر پک ہی رہا تھا کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے دیکھ لیا زمان پر ہاتھ ڈالا، مگر زمان اس وقت اتنا مشتعل اور غضبناک تھا کہ گھٹم گھٹا ہوا گناہ اس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ چکر اگیا زمان بل کھا کر مسجد کی طرف کھا کھا کر جاوہ جاوہ یہ سب کچھ ڈرامائی انداز میں ہو گیا۔

### سزایابی

گولی کا اثر کئی دن تک رہا جن لڑکوں کو نائترنگ کے اس ہنگامہ میں پکڑا گیا وہ ہفتہ سوشہ میں رہا کر دیئے گئے۔ انہی میں زمان بھی تھا ان کے علاوہ جو لوگ آگے پیچھے پکڑے گئے ان میں سے جن کی عمریں اٹھارہ برس سے اوپر تھیں وہ سنٹرل جیل میں رہے ان کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہ تھا ہم لوگ بورسٹل جیل میں تھے۔ کوئی پندرہویں روز سنٹرل جیل کے کورٹ روم میں ہمارا مقدمہ شروع ہوا ایک اینگلو انڈین مجسٹریٹ مسٹر ٹیل نے سماعت کی جن تقریروں کی بنیاد پر ہمیں گرفتار کیا گیا وہ تمام چونکہ شاہی مسجد میں ہوئی تھیں اس لئے استغاثہ کے گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری تھا۔ کئی رشتہی وار اٹھیوں نے پرج یا جھوٹ بولا ایک انسپکٹر پولیس جو جاری گرفتاری کے وقت سرے سے موجود ہی نہ تھا بلکہ جس رات ہم سٹی کوتوالی کی حوالات میں تھے ہم سے گرفتاری کا حال پوچھنا ہوا اور جو کچھ ہم نے بتایا اس نے وہی عدالت میں بیان کیا کہ میں نے اس طرح پکڑا اتنے بچے پکڑا یہ کیا وہ کیا کہا پرج لیکن یہ اس کا جھوٹ تھا کہ اس نے ہمیں خود پکڑا تھا۔

غرض سرسری سماعت کے بعد برسوں کے بعد برسوں کو ایک ایک سال قید سخت اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو برس جرمانہ کی سزا دی گئی مجھے دو سال قید سخت اور تین سو سو پچھتر جرمانہ (بصورت عدم ادائیگی مزید چھ ماہ قید) کا حکم سنایا گیا۔ میں نے حکم سنتے ہی انقلاب زندہ باد۔ اللہ اکبر۔ اور پنجاب پولیس



مروہ باد کے نعرے لگاتے۔ ٹیل پہلے ہی سے مجھے گستاخ مجھتا اور میرا تحریری بیان گستاخی پر محمول کو کے زمین پر دے مارا تھا اب جو مجھے نعرے لگاتے رانا تو بھڑک اٹھا سپرٹنڈنٹ جیل کے نام میرے خلاف عالتی خط لکھا کہ وہ مجھے سزا دے کیونکہ میں نے بے ہنگامہ جیل کے حدود میں کیا ہے۔ بورٹل جیل کا سپرٹنڈنٹ اب گوریہ فوجی تھا۔ کیپٹن گولڈ فیڈ بیٹیس بن اس نے مجھے پندرہ روز قید نہائی کا حکم سنایا۔ ڈپٹی سپرٹنڈنٹ جیل خان عبدالحکیم خان نوید دھنے سپرٹنڈنٹ اسی کے اتارہ پر چلتا خان صاحب کی وجہ سے قید نہائی۔ قید نہائی نہ رہی انہوں نے مجھے سانجھوں ہی میں بھجوا دیا وہاں نظارہ ایک الگ حصہ میں رہا مگر یہ محسوس دکھاوا تھا برڈ کے روز (سپرٹنڈنٹ کے ہفتہ وار معائنہ کا دن) تھوڑی سی دیر کے لئے بند رہتا پھر ہفتہ بھر کھلا۔ تہائی قید والوں کو پسائی کے لئے پندرہ سیر گندم دی جاتی لیکن جہاں ہم تھے وہاں جیکیاں بالکل نہ تھیں مجھے سر جی کوٹنے کے لئے روڑی دی گئی میں شوومہ کوٹنا بھی رہا مگر یہ اپنی رضی برتھا۔ نہ کوٹنے پر کوئی باز پرس نہ تھی۔

ہم جیل کے قواعد سے بالکل نادان تھے چاہتے تو مسلمان جیلر کی بدولت کما حقہ آرام پا سکتے تھے، مگر ان رعایات کو ہم نے اپنا حق سمجھا اور لحظہ بہ لحظہ خود سر ہوتے گئے۔ نتیجتاً ہمیں مختلف احاطوں میں بانٹ دیا گیا۔ میں اور اسحاق ایک ہی احاطے میں ڈالے گئے لیکن ہمارے cells فاصلہ پر تھے۔ یہاں پہلی دفعہ قید کا احساس ہونے لگا ایک ہندو اسٹنٹ سپرٹنڈنٹ لالہ بشنداس بترا احاطہ کا انچارج تھا اپنی نفرت چھپانے سکا مجھے اور اسحاق کو جیلر نے پریس بھجوا دیا یہ سب سے ہلکی مشقت تھی۔ بورٹل جیل کا پریس لاہور سنٹرل جیل کے پریس کی ایک شاخ تھا ایک بڑی سی بارک میں کچھ ٹریڈل مشینیں لگی ہوئی تھیں جہاں صرف قتل کے مقدموں کی مسلیں کمپوز ہو کر چھپتی تھیں میں نے بہت جلد کمپوزنگ کا کام سیکھ لیا لیکن ابھی پورے طور پر قابو نہ پایا تھا کہ اپنے ہی ہاتھوں ایک اُمتاد آڑھی۔

عبد الوہاب پریس میں ایک نیک دل اور متشرع مسلمان افسیر تھے میرا ایک بیڑنگ خطا یہ عنایت شاہ

ایڈیٹر سیاست کے نام لے گئے لیکن دستی پہنچانے کی بجائے ڈاک میں ڈال دیا۔ میں نے لکھا تھا کہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک ہمیں ہو رہا ہے میں اگ-اگ کر دیا ہے اگر دس روز تک لیجاہ کہا گیا تو ہم بھوک بٹائل کر دیں گے۔ ہمیں قطعاً علم نہ تھا کہ ڈاک سنسر ہوتی ہے اور سنسر ہونے کے بعد اس پر ایکس بھی لیا جاتا ہے۔ یہ عبدالوہاب کو پہلے سے اس کا اندازہ تھا۔ خط بکڑا کبھی آئی رُئی نے جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کو بھیجا اس نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھجوا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے انکو آری شروع کر دی جیلر جو مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم پر قدرے حیران تھا اب پتھر ہو گیا میں نے سنسر سے واقف تھا نہ اُس کے سانچے سے نہ کبھی یہ پیچ ہی پڑا تھا سخت پریشاں ہوا۔ جیلر کو اصرار تھا کہ جو شخص یہ خط لے کر گیا تھا اس کا نام کون میں کسی طرح بھی نیار نہ ہوا ایک دو ساتھیوں نے کمزوری دکھائی مگر عبدالوہاب کا راز نہ کھلا ڈوڈو ڈوڈو بلا وجہ معطل کئے گئے ایک کی ترقی روک لی گئی دوسرا برخواست کر دیا گیا مجھے ریس سے قصوری لائن بھیج دیا گیا۔ جہاں چوبیس گھنٹے تنہائی میں بند رہنا ہوتا ہے اور کسی کو نہ بکتے کی آواز بھی نہیں آتی قصوری لائن بورڈ جیل کا مذاق خانہ ہے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے دو پاگلوں سے واسطہ پڑا۔ دونوں قیدی تھے لیکن ماؤف ذہن! مشقت ان کی قیدیوں کی پٹائی تھی جو قیدی بھی یہاں لایا جاتا اُسے شرط باندھ کر پٹینا ان کا کام تھا۔ میں پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی غرانا شروع کیا ان کا مودہ تھا کہ پہلے اس کے گرد نبتے پھر لٹا پنچوں سے شروع ہو کر گھونسوں تک پہنچتے پھر ٹوٹے ہوئے جوئے اٹھا لیتے اور کان پکڑو اگر مشق کرنے جمہدار پاس بیٹھا تا مشا دیکھنا اور مزے لیتا جب قیدی بے جان ہو جاتا تو پھر اُسے نہلا دھلا کر کوٹھری میں بند کر کے پندرہ سیر گندم کا کھوکھا آگے رکھ دیا جانا کہ شام تک بیسو؟ ورنہ بھر پٹائی ہوگی۔ ان پاگلوں نے میرے ساتھ تھوڑی سی رعایت کی یعنی بے جان تو نہ کیا لیکن ہلکان ضرور کیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ سیر گندم تو بڑی چیز ہے مجھ سے پاؤ بھر گندم کا پنا بھی محال تھا کہاں نلم کے ہاتھ کہاں چکی کا مٹھا؟ بہتری کوشش کی لیکن آدھ پاؤ آٹا پنا بھی مشکل ہو گیا۔ کھڑی چکی نے نہ صرف تھکا دیا بلکہ ہتھیلیوں میں چھالے پڑ گئے۔ میں ایک تجربہ میں

مگر ساتھ ساتھ ایک ہاتھ ہی میں جی چھوٹ گیا نام حوصلہ نہیں ٹوٹا۔ بسا اتراس سے صرف پتھر ہی انداز کر سکتے ہیں آگے  
 بڑھائیں۔ نسوپی گیا کسی ہر ظاہر بہ کیا لانا کی دنابل گئی ہے قصوری اعلا طویل کے مجرموں کا قید خانہ ہے یہاں وہی  
 دار فہ اور جمدار کسانے مانتے ہیں حور نم دک م کے، صاف سے ماری مول باہنس انب پنہانے میں لطف  
 آتا ہو۔۔۔ اس اعلا کا انیارج اسٹٹ بادی بھی سنت گیر ہونا ہے اتفاق سے عمار انیارج ایک خوش طبع  
 برہمن نھا جو ہم سے انصاف کرنا چاہتا اور ان بہ برہمن کے ملاف تھا مگر مجبور تھا۔۔۔ کیونکہ دو روز جمدار  
 محمد خان اور غلام حسین فطرنا بوجہ تھے جب تک اذیت نہ پہنچائیں ان کی طبیعتیں بے مزہ رہیں۔۔۔ میرا  
 مجرم بہ تھا کہ میں نے چوری چھپے ایک چٹھی مکھی تھی لیکن جو کچھ اس میں درج تھا وہ غلط نہیں تھا ہم واقعی سختی  
 محسوس کر رہے تھے اور ہیں جن جن کر ایک دوسرے سے الگ کیا گیا تھا۔ اسکی سزا مل علی تھی ایک ماہ قید تنہائی  
 ان پر روز کی میٹائی گندم کی پانی اور کان کیڑوانی مسزاد تھے۔ پھر اندر تو بہ سو۔ ہا تھا باہر کا علم ہی نہ تھا کہ کیا  
 ہو رہا ہے؛ اس سارے عرصہ میں عزیزوں سے ملاقاتیں بھی بند کر دی گئیں جو کھانا پہلے روز قے لایا تھا  
 اب ہنسی خوشی کھا ہتا جوں توں کر کے یہ دن بھی کٹ گئے لیکن اپنے بچھے بعض ایسی تلمیاں چھوڑ گئے جن کے  
 نظور ہی میں وحشت تھی۔ فی الجملہ یہ پہلا تجربہ تھا آخر مجھے قصوری پکیوں سے نکال کر دو۔۔۔ سے اعلا میں  
 بھیج دیا گیا یہاں ہم دو چار ساتھی رہ گئے اور اکٹھے تھے بان بیٹے مالکانے بنائے شہید گج ڈینس کمیٹی  
 نے ہماری اپیلیں دائر کر رکھی تھیں دن اونے پونے اسی رہے تھے۔۔۔

### ذوق و شوق

مباد ماغ شروع سے سیاسیات کی طرف راجع تھا بلکہ میں چوتھی جماعت ہی سے زمیندار پڑھتے  
 پڑھتے ایک سیاسی طالب علم ہو گیا تھا بال بھارت سبھا کے بعد میرا رخ پلٹ گیا کانگریس کی مکین ستیہ گرہ  
 ختم ہوئی تو میرے اندر کا دلولہ ماند پڑ گیا تھر کب کشمیر میرے سامنے اُبھری اور طوفان بن گئی میں نے اُس میں

کوئی دلچسپی نہ ہو، ایک دم میں ابھی پڑھ رہا تھا دوسرے دن نے اپنی طبیعت کو ادب میں لگا لیا اور شاعری کے کورس میں قدم رکھ چکا تھا جولائی ۱۹۳۵ء میں شہد گنج کی افتاد آٹری۔

بزم اردو کے نام سے ہم نے ایک مجلس بنا رکھی تھی جہاں ہرابت وار کو جمع ہوتے اور آپس میں ادبی و شعری مذاکرہ کر لے اس مجلس کا سالانہ انتخاب تھا جنرل سیکرٹری شپ کے لئے مجھ میں اور مرزا ادیب میں مقابلہ تھا میں ہی منتخب ہوا انتخاب سے فارغ ہو کر حسب معمول شاہی مسجد فارغ کیا میں وہاں نٹو پارک کی سمت کے حجروں میں عموماً پڑھنا پڑھاتا باشعر کہا کرتا تھا۔ ایک بچہ میں لپٹا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا کہ حافظ معراج دین (سیکرٹری انجمن فرزندان نوحید) آگئے کہنے لگے۔

”ہاں پڑے کیا کر رہے ہو چلو جلسے کی صدارت کرو زیادہ سے زیادہ تین ماہ قبل ہی خدمتِ اسلام کا تہ تیغ ہے لیڈر کپڑے ماچکے ہیں ہمیں کچھ کرنا چاہیے وہ دیکھو دس بارہ ہزار آدمی مسجد میں جمع ہو چکے ہیں۔“

گزشتہ رات شہد گنج کی مجلسِ دفاع کے لیڈر مولانا ظفر علی خان سید حبیب ملک لال خان میاں فیروز دین احمد وغیرہ گرفتار ہو چکے اور انہیں موبہ کے مختلف اضلاع میں نظر بند کروایا گیا تھا یہ جلسہ اخباروں کے مخفی اعلان پر ہو رہا تھا کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا اس نے حافظ معراج دین سے عذر کیا نہ مانے، حیظتندہاری اور بدرعی الدین اتفاق سے وہاں موجود تھے انہوں نے بھی زور ڈالا اور طوعاً و کرہاً مجھے منبر تک لے گئے۔ نعرہ تکبیر۔۔۔ الشاکر۔

### پہلی تقریر

حضرات! اس جلسہ کی صدارت اردو کے مشہور شاعر اور ادیب شورش کاشمیری فرمائیں گے حافظ جس نے تحریک کی چودہری مولانا بخش نے تائید اور جس صدارت کی کرسی پر بیٹھ گیا سترہ سال سے کم عمر کا ایک لڑکا لوگوں

کی نگاہ میں کیونکر چمپا؛ منبر کا احترام تھا بادلوں کا دلوار۔۔۔۔۔ تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو مجھے مطلق احساس نہ رہا کہ زندگی میں پہلی دفعہ بول رہا ہوں میں جو اسکول کی بزم ادب میں دو لفظ کہتے ہوئے کانپتا تھا یہاں بے روک ہو کر بول رہا تھا جس طرح اب چھوٹا بچہ آپانک ریگنے لگتا پھر ریگتے ریگتے ایک دن چلنے لگا ہے ای طرح میں بولنے لگا آپانک بہرہ کھل گیا۔

کچھ معلوم نہ تھا کیا کہہ رہا ہوں لیکن جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اس میں میرا جوش اور جذبہ شامل تھا میں نے جذباتی فضا پیدا کرتے ہوئے کہا

”گوری چڑی والے گورنر کو راستہ سے ہٹ جانا چاہیے وہ ایک گندانا تک کھیل رہا ہے جو کچھ بھی وہ کر رہا ہے ہم اس سے باخبر ہیں وہ ہمارے صوبہ میں خون خرابہ کرانا چاہتا ہے۔ شہید گنج مکھوں نہیں کرانی اور گورنر نے گرواتی ہے مسجد تو ہم نے کر ہی رہیں گے آج نہیں کل لیکن ہم دلی کے لال تلحہ پر بھی پرچم اسلام لہرانے کا نتیجہ کر چکے ہیں۔۔۔۔۔ انعرہ ہانے تکیر سے فضا معمور ہو گئی دیر تک نعرے گونجتے رہے عمر اور خطابت میں بہت دور کا فاصلہ تھا مگر لوگوں کے نعرہ ہانے تحمین نے مبرے ارد گرد ہالہ بنا لیا جس سے میرا حوصلہ اور بھی جوان ہو گیا۔۔۔۔۔ یہ اعلان کر کے کہ دوسرے دن پھر یہیں اور اسی وقت جلسہ ہو گا میں اپنے دوستوں کے ہمراہ غائب ہو گیا پولیس نے اسی رات ہمارے گھروں میں جھابہ مارا بعض کو بدلیا حافظ معراج دین نے پولیس کو خاصا پریشان کیا وہ برقعہ پہن کر عورتوں میں گھس گئے لیکن پولیس نے نکال لیا میں اس رات گھر سے ماہر رہا لاہور سے چھ میل دور ساندھ میں راوی کے کنارے ایک دوست کے ہاں رات کاٹی پولیس گھر میں اور ”سیاست“ کے دفتر میں ڈھونڈتی پھری ہی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ میرزا معراج دین اور سید عنایت شاہ میں تو تکرار ہو گئی تھی کہ روزنامہ ”سیاست“ اور میرزا معراج دین ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔

سید عنایت شاہ، سیاست مرحوم کے مالک و مدیر مولانا سید حبیب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے

دو بیٹے عطا۔ اللہ شاہ ہاشمی اور عتیق اللہ شاہ ہاشمی مبرے ذاتی دوست تھے انہی کی وجہ سے وہ مجھے عزیز رکھتے بلکہ انہی کی طرح سمجھتے تھے میں ساندے سے علی الصبح چوری چھپے ان کے ہاں پہنچا تو انہوں نے مجھے دفتر کے اوپر کی منزل میں ٹھہرا دیا۔

ہم رات بھر جو کچھ سوچتے رہے ان سے ذکر کیا تو منع کیا فرمایا انفرادی تشدد حکومتوں کے مقابلے میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اول نوگورنر تک پہنچنا مشکل ہو گا اور پہنچ بھی گئے تو اس کا حاصل کچھ نہ ہو گا میں نے چند سوشلسٹ نوجوانوں کا ذکر کیا ان کا خیال تھا کہ تحریک کو فریڈر ڈارن رنگ دینے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دونوں قوموں میں تصادم ہو جائے گا لیکن مسجد کسی صورت میں بھی مسلمانوں کو نہ ملے گی جس مقصد کے لئے مسجد گروائی گئی ہے اور جو حاکمانہ ہاتھ اُسکے پیچھے کام کر رہا ہے اسکو بے نقاب کرنا چاہیے۔

شاہ جی نے اتفاق کیا نظر کے وقت جلسہ تھا حال یہ تھا کہ سی آئی ڈی والوں نے دقت ریاست کو رات ہی سے نگرانی میں لے رکھا تھا اسکے باوجود میں اور سید عطا۔ اللہ شاہ ہاشمی دفتر سے کسی نہ کسی طرح نکلنے میں کامیاب ہو گئے ساہ محمد غوث کے عقب سے ہوتے ہواتے دہلی دروازہ کی بد رو پر پہنچے وہاں سے گلیوں کا راستہ لیا پھر ان پریچ و تم کھاتی ہوئی گلیوں کے اندر سے شاہی مسجد تک جا لکھے چھوٹے دروازوں پر باوردی پولیس اور سی آئی ڈی کے پہرے دار کھڑے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ساوھی کے رخ سے بڑے دروازے کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے ادھی سیڑھیوں کے بلے کی ہوں گی کہ پیچھے سے کسی نے للکارا بڑہ شور مچا جا رہا ہے پکڑو ایک باوردی حوالدار لہنگا مگر میں نے پلٹا کھا کر اُسے ایسی ٹھٹھی دی کہ تو تڑوں کے بل زمین پر آ رہا۔ اور میں دو چار جھبتوں ہی میں مسجد کے اندر جا پہنچا۔

## بورسٹل جیل

بورسٹل جیل ضابطہ میں الٹی ٹیوشن کہلاتا ہے اسے اصطلاحاً جیل نہیں کہتے لیکن معنا جیل ہی ہے

جس سحرے نے اسکی بنیاد رکھی تھی وہ اس کے نتائج سے کالملاً بے خبر تھا ورنہ شاہد اس کی بنیاد ہی نہ رکھتا۔ یہاں کوئی ساعدی بھی سدھر نہیں سکتا جس بہاں کوئی قین سواتین ماہ رہا لیکن جو کچھ نگہ پر روشن ہوا یا جن باتوں کا جس نے مشاہدہ کیا اسکی بنا۔ پر میری رائے یہی ہے کہ بورسٹل جیل ایک لعنت ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک کے نوجوان بہاں رکھے جانے میں مگر ان کی طفلانہ طبیعت بہاں سخت مجروح ہوتی ہے مثلاً۔

- ۱۔ حکام ان قیدی بچوں کی نفسیات سے بالکل واقف نہیں ہوتے اور نہ سمجھتے ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ان بچوں کو جو ماحول کی وجہ سے باغیر ارادی طور پر کسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں ایک مستقامہ مفضلاً بگارتی چلی جاتی ہے۔ ان میں ایک جرم کے بجائے کئی جرائم نشوونما پاجاتے ہیں۔
- ۲۔ ان بچوں میں ادنیٰ درجے کے ملازم قیدی نمبردار اور طاقتور ساتھی جنسی میلانات پیدا کر دیتے ہیں جس سے وہ مفعولی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔

۳۔ چونکہ ساری فضا خوف پر مبنی ہوتی ہے اس لئے قیدی بچوں سے اس خوف کا شرمناک فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جنکلا پر پٹ۔ جنسی اختلاط کے لئے ایک گھناؤنی اصطلاح جس سے قیدی نمبردار کالی والے پیلی والے بلکہ بعض وارڈر بھی متمتنع ہوتے ہیں۔

ایسے قیدی جو کمزور ہوں یا مشقت کے ناقابل یا محنت سے جی چراتے ہوں جیل خانے کی سخت مشقتوں سے عاجز آکر خود سبردگی اختیار کر لیتے ہیں تمام بورسٹل جیل چونکہ عکبتوں پر مشتمل ہے اس لئے رات کے گھٹب اندھیرے میں قیدی نمبردار یا وارڈر منتخب لڑکوں کو ردیف کی صورت میں استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ وہ قیدی لڑکے جو باہر تمباکو نوشی کے عادی ہوتے یا پھر جنہیں جیل خانے کی خوراک نہیں بجاتی بسا اوقات ایک سگریٹ یا ایک کش کے لئے اپنے آپ کو خرابی جسم کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ ایک گرم روٹی۔ گڑ کی بھیلی۔ صابن کی ٹکیہ یا ایسی ہی کوئی دوسری شے، جیل خانے میں حصول جنس کا ذریعہ ہے۔

۵۔ ایک نلیل سخاہ کے ملازم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ان سبوں کے لئے صلح ہوگا محض خام خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادنیٰ سخاہ کے بھی ملازم ان قیدیوں کو بگاڑنے کے ذمہ دار ہونے ہیں وہ تمام جبریں جو کھانے پینے کے کام آتی ہیں اور جیل کی خوراک کا حصہ ہیں اگر کسی قیدی کی خانہ تلاشی میں نکل آئیں ذرا بد معاہسی ہے اور اس بد معاہسی ہی کے لئے جیل خانے میں بد معاہشی ہونی ہے۔

۶۔ جو نیچے قیدی ہو کر آتے ہیں انہیں بورٹل جیل کی فضا (الامات اللہ) جو بچ کر دیتی ہے۔ پھر باہر آکر یہی عادی بن جاتی ہیں۔

غرض ان ماسخوں کے برگ و بار بورٹل جیل میں عام نچے نظر۔ بظاہر وہاں اسکول بھی تھا کھیلوں بھی جس اور زراعت بھی مگر وہ نفسیات قطعاً ناپید نہیں جن سے ایک قیدی کی اصلاح ہو یا ایک کم سن عورت راہ راست پر اسکے۔ قیدی کام سیکھتے یا مشقت کرتے ہیں تو سہرا آموزی کے لئے نہیں بلکہ قید میں کٹوتی کے لئے جیسے جیل کی اصطلاح میں معافی کہتے ہیں۔ نتیجتاً بورٹل جیل کا سارا مواد خام رہتا بلکہ بگڑ کر بدبودار ہو جاتا ہے۔

## رہائی

ایک دن بیٹھے بٹھائے اطلاع ملی کہ اپیلیں منظور ہو گئی ہیں تب کارنلیس بیٹن جج تھے انہوں نے جرمانہ اڑا دیا اور قید سال سے گھٹا کر تین ماہ کر دی۔ ساتھیوں میں لازماً خوشی کی لہر دوڑ گئی چونکہ مجھے دو نو قریبوں میں دگنی قید اور دگنا جرمانہ ہوا تھا اس لئے ایک اپیل رہ گئی۔ رہائی میں دو ہفتے باقی تھے۔ مسٹر کارنلیس کا تبادلہ ہو گیا ان کی جگہ ایک کشمیری پنڈت اونکار ناتھ زتشی آگئے انہوں نے رہائی سے پہلے دوسری اپیل سن لی اور بالکل ہی چھوڑ دیا۔

غالباً اس فیصلے کے اگلے ہی دن ہماری رہائی ہو گئی۔ جیل پر اپنی سختیوں پر نادم تھا۔ میں منہ اندھیرے



دیکر دیا گھر سے کوئی موجود نہ تھا ہم بمشکل وارث روڈ تک پہنچے ہوں گے کہ اقربا آگئے ہیں ہاروں سے لا دیا اور ساتھ لے گئے مجھے یاد ہے جب میں ہمیشہ کے مکان پر پہنچا تو میرے دادا نے بچوں کی طرح روتے ہوئے مجھے گلے سے لگا لیا کہنے لگے ہمارے ہاں کبھی کسی کو ہتھکڑی نہیں لگی تھی تم نے ہتھکڑی بھی لگوائی —

گویا میں اس معزز ترین انسان کے نزدیک جو شرافت کا ایک پیکر تھا کسی ایسے جرم کا مرتکب ہوا تھا جو خاندانی شرافتوں کی روایت کے خلاف تھا۔

### سی آئی ڈی کے مسلمان اہلکار

باہر آکر دیکھا تو شہید گنج کا شعلہ کچلا اچکا تھا بعض عناصر نے حصولِ مسجد کے نام پر مجلسِ اتحادِ ملت قائم کی لیکن ان کا مقصد تحریک کو ٹھنڈا کرنا تھا جو انوں کا بھوشِ آندھی کی طرح اٹھ کر نبار کی طرح بیٹھ گیا۔ اب جو لوگ ”راہنما“ تھے ان میں مجلسِ اتحادِ ملت کے صدر پروفیسر ملک عنایت اللہ تھے جو کبھی الین سی کالج میں فارسی کے پروفیسر رہے تھے ان کے ساتھیوں میں زیادہ تر سرکاری مشینوں کے پھل پھول تھے یا پھر سی آئی ڈی کے گماشتے۔

یہاں نشاۃِ یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا کہ انگریزی عہد میں پنجاب سی آئی ڈی کے مسلمان افسروں کا رول کیا رہا، انہوں نے کس قسم کے کارنامے انجام دیئے یہ تمام چیزیں ایک طاقتور قلم کی منتظر ہیں۔

بوسے گل نالہ دل دو دہ چارخ محفل میں اس حکایت کا ایک حصہ آچکا ہے۔ ممکن ہے شہید گنج کے اہل علم میں ان افسروں کا حق نہ ہو لیکن اس سے جو تحریک پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی اس کے اتصال و زوال میں ان کا ہاتھ ضرور تھا اور یہ تمام راز رفتہ رفتہ کھلتے گئے۔ پیر جماعت علی شاہ پنجاب کے نامور پیر تھے بعض اصلاح میں ان کا اثر بھی تھا۔ کئی مصلحتوں نے اکٹھا ہو کر راولپنڈی میں شہید گنج کانفرنس کی راہیں انہیں امیر ملت نامزد کیا گیا۔ پیر صاحب انتہائی سادہ نیک دل اور آخری حد تک غیر سیاسی آدمی تھے۔ ان کے

گرد و پیش عوام سرکاری لوگ رہتے جو انہیں ادھر ادھر ہونے دیتے تھے۔

پیر صاحب نے راولپنڈی کے اجتماع عام میں اعلان فرمادیا کہ مسجد شہید گنج مسلمانوں کو نہ ملی تو میں  
 تنہا ہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر پھلانگ لگا دوں گا۔ اس اعلان سے خوش ہو کر لاہور کے مسلمانوں نے  
 پیر صاحب کا نارنجی جلوس نکالا لیکن یہ اعلان — اعلان ہی رہا چنانچہ یہ ایک اذیہ ہے کہ شہید گنج کا یہ  
 دور سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ میرزا معراج دین کے ہاتھ میں تھا انہوں نے اس بات سے لیکر اتحاد ملت  
 تک سب کو بالواسطہ اور بلاواسطہ اپنی جیب میں ڈال رکھا تھا۔

پیر صاحب کے گرد و پیش اس قسم کے لوگ جمع کر دیئے گئے تھے جو انہیں سرکاری منشا کے  
 تابع رکھتے۔ عام لوگ نہ صرف ان کے فرار سے بظن ہو رہے تھے بلکہ مطالبہ کرنے لگے تھے کہ شہید گنج کی  
 بازیابی کے سلسلہ میں سر صاحب ایسا وعدہ پورا کریں لیکن ان کے کانوں تک کوئی لفظ پہنچنے ہی نہ پاتا وہ  
 مریدوں کے رزم میں تھے۔ میر مقبول محمود اور کرم الہی وکیل عموماً ان کے گرد و پیش رہتے یہ دونوں سرکاری  
 طرف سے مامور تھے ایک روز میں حاضر ہوا تو یہ دونوں بزرگ دوسرے حواریوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔  
 حتیٰ کہ ڈاکٹر شیخ محمد عالم بھی دوزانو بیٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنے داؤں پر تھا میں نے چاہا کہ پیر صاحب کو لوگوں  
 کے جذبات سے مطلع کروں مگر کرم الہی وکیل نے روک دیا۔ حضور کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کر دو جو  
 ان کی طبیعت کے لئے بوجھ ہو۔ پیر صاحب فرما رہے تھے کہ جہاد فرض ہے میر مقبول زور دے  
 رہے تھے کہ حضور حج پر تشریف لے جائیں۔ شہید گنج کا قضیہ تو ہر حال میں طے ہو جائے گا حضور نے  
 آج تک حج اذیہ نہیں کیا۔

### عجیب کشمکش

اپانگ ہی حکومت نے سید حبیب اور میاں فیروز الدین احمد کو راکر دیا وہ لاہور پہنچے تو معاملہ

ڈانٹاں ڈول تھا۔ پیر صاحب کھک رہے تھے سید حبیب نے پیر صاحب کو ڈھب پرانے کی بہتری کوشش کی، لیکن بے سود آخر سالہا سال کے تعلقات توڑ لئے۔ پیر صاحب یہ کہہ کر حج کے لئے رعاہ ہو گئے کہ جہاں و ہتھوی کیا جاسکتا ہے لیکن حج ساقط نہیں ہوتا جب اُن سے کسی نے کہا کہ اس طرح مسلمان انہیں امریت تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے، تو غصہ سے کانپنے لگے فرمایا مجھے ایسی قوم کا امیر بننا منظور نہیں یہ لوگ مانیں یا نہ مانیں مجھے خدا نے امریت بنایا ہے میں سب ہوں اور سید تمام مسلمانوں کا سردار ہوتا ہے۔ لوگوں کے دیے ہوئے لقب کی مجھے پروا نہیں۔ تمام ارادت مندوں نے (جو اُس وقت حلف میں موجود تھے) صاد کیا۔ غرض پیر صاحب عقیدت مندوں کے تدارک کے لئے کر حج کو چلے گئے۔ میدان خالی رہ گیا سید حبیب اپنی جزوی رہائی کو حکومت کی چال قرار دیتے اور کوشاں تھے کہ تحریک دوبارہ زندہ ہو۔ لیکن ان کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں وہ تمام خاندانی اُمرا اور سرکاری فضلا جو ابتدا میں شہید گنج کے مجاہد بن کر نکلے اور تحریک میں مختلف کمیٹیوں کے کراؤ دھرتا بن گئے تھے اب فائزنگ کے دن سے غائب تھے۔ گورنر کی ایک ہی کھڑکی نے انہیں گھروں میں بٹھا دیا تھا وہ سید حبیب سے مصافحہ کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔

ادھر مرکزی حکومت اس ٹوہ میں تھی کہ یہ تحریک دوبارہ اُٹھے گی یا نہیں؟ گورنر مرکز کا مقرب ہو چکا تھا اور یقین سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ڈپٹی کمشنر سٹریس پریپ (جو سیکہ خاندان سے عیسائی ہوا تھا) گورنر کو یقین دلانا تھا کہ تحریک میں اب کوئی جان نہیں اگر تمام نظر بندوں کو رہا کر دیا جائے تو کوئی سا اندیشہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سٹی آئی ڈی اپنی کارگزاری دکھانے کی فکر میں تھا وہ لکھ چکا تھا کہ تحریک میں جاگ اُٹھنے کی علامتیں موجود ہیں اور کسی ایک وقت خاکستر سے چھکارا اُٹھ کر شعلہ جوالہ بن سکتی ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے ذرائع اور اپنے اپنے مواقع تھے۔ دونوں گورنر کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میرزا معراج دین یہ تاثر دے رہا تھا کہ مورخ شمال میں اشتعال موجود

ہے مگر وہ اپنے خاص ذرائع سے اس پر قابو پاسکتا ہے اور یہی اس زمانے کی سی آئی ڈی کے افسروں کا کمال تھا کہ اپنی ترقی و اعزاز کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتے تھے۔  
 پیر صاحب کا جج کو جانا تھا نہیں رہا تھا عوام ناخوش تھے میں نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے نہ صرف احتجاج کیا بلکہ یہاں تک کہہ ڈالا کہ

”جو لوگ ڈاکٹر اور اوڈو وائر کو سپا سنامہ دے چکے ہوں جنہوں نے پہلی جنگ عظیم میں انگریزی فوج کو تعویذ دے ہوں کہ ترکوں کی گولیاں ان پر اثر انداز نہ ہوں گی ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ شہید گنج کی بازیابی کے لئے اوڈو وائر کے کسی جانشین سے آنکھیں چاڑھ کرین گے ایک محتقانہ نواب ہے۔ یہ گدیاں انگریزوں نے ہمارے لئے نہیں ایسے لئے قائم کی ہوئی ہیں“

### میرزا معراج دین

اس تقریر کی رپورٹ میرزا معراج دین کے پاس پہنچی تو یاد فرمایا ایمر میں روڈ پر ان کا بنگلہ تھا بٹے تپاک سے ملے، کچھ دیر انداز تقریر کی تعریف فرماتے رہے پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔  
 آخر میں فرمایا کہ آپ لوگوں کو تو تحریک اٹھانی چاہیے مسجد نہ ملی تو یہ مسلمانوں ہی کی نہیں اسلام کی بے عزتی ہوگی۔ اللہ کا نام لے کر شاہی مسجد میں مورچہ لگا دو جس سے پچاس روپے ماہانہ پیش کرتا رہوں گا یہ میری طرف سے عام اخراجات کے لئے ایک حقیر سی امداد ہوگی۔ میرزا صاحب پچاس روپے کے نوٹ نکال رہے تھے میں نے روک دیا عرض کی آج رات مجھے سوچنے کی ہمت، دیجئے، کل شام کچھ عرض کر سکوں گا کہ تحریک چلا سکتا ہوں یا نہیں؛ کیونکہ جو کچھ میں نے محسوس کیا یا دیکھا ہے اس کے مطابق اب تحریک میں کوئی جان نہیں رہی اس قسم کے عناصر جمع ہو گئے ہیں جو میرے نزدیک مشکوک ہی نہیں بلکہ حصول مسجد

کے بچائے اپنے نام تمام دیکھتے ہیں میرزا صاحب نے بہر حال اپنا نقش جمانا چاہا اور اس خوش مسلوبی سے گنگو  
کی جیسے اُن سے بڑھ کر اسلام کلکتہ کی خیر خواہ نہیں اور اگر ان کے نسخہ کیمیا پر عمل کیا جائے تو مسیحا کا حصول  
آسان ہو جائے گا بلکہ یقینی —————

اُن کے جھگڑے نکل کر میں سید صاحب نے عنایت شاہ کے پاس پہنچا۔ میں اس قسم کے مواقع اور  
سوانح میں ہمیشہ انہی سے مشورہ لیتا تھا انہوں نے یہ ساری کتھا سنی تو مسکرائے فرمایا

”شاہ صاحب (سید حبیب) کی پہلی کوشش یہ ہے کہ مولانا نظیر علی خان اور دوسرے  
تمام نظر بند ہوں یا نہیں انہی کی رہائی پر اُندہ کے پردہ گرام کا انحصار ہے۔ ایس پر تاپ  
شاہ جی سے بات چیت کر رہا ہے۔ میرزا معراج دین کو پسند نہیں وہ اپنی چودہ ہراٹھ چاہتا  
ہے۔ خود دہلے معاملہ میں مجھ سے اُلجھ چکا ہے اُس نے گورنر سے کہا ہے کہ تحریک  
اندر ہی اندر لگ رہی ہے اور سید حبیب ہوا دے رہا ہے۔ اب چونکہ اُسے ہمارے  
تعلقات کا علم ہے اس لئے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے اس نے ہمیں پھانسا اور  
پھیلانا چاہا ہے۔ اس طرح وہ گورنر سے کہہ سکے گا کہ اُسکی اطلاعات درست تھیں۔  
شورش سید حبیب کا آدمی ہے وہ جانتا ہے کہ تحریک فی الحال بے جان ہو چکی ہے۔  
شاہ صاحب اور ہمیں گرفتار کرنے کے بعد وہ یہ کر بیٹھ بھی حاصل کرنے کی کوشش  
کرے گا کہ تحریک اس کی کوششوں سے فرو ہوئی ہے۔“

شاہ صاحب نے بعض ایسے نظر بندوں کا ذکر کیا جو اب بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے ہاتھوں  
میں تھے اور وہی کچھ کہتے یا کرتے جو وہ چاہتا تھا —————

اگلے روز میں نے نہ صرف اُسے ملنے سے انکار کیا بلکہ کہہ لیا بھیجا کہ آپ اس مقصد کے لئے  
کسی اور کو منتخب کر لیں میں خود فروشی کے کاروبار سے قطعاً نااہل ہوں۔

سید جب نے یہ سارا واقعہ ایس پر تاپ کو سنایا اس نے گورنر سے کہا۔ گورنر نے میرزا معراج دین کو طلب کیا۔ میرزا معراج دین نے گورنر سے کیا کہا۔ خدا بہتر جانتا ہے مگر سید جب سے اُس کی لڑائی تیز اور مستقل ہو گئی۔ ادھر میرزا صاحب مجھے فنا کرنے پر تزل گئے۔

### چودھری مولا بخش

ایک نوجوان مولا بخش گجر ہمارے ساتھ ہی قید ہوا اور ساتھ ہی رہا ہوا تھا وہ میرے پاس آیا اور زور دیا کہ تحریک شروع کرنی چاہیے۔ بس نے اس سے بھی یہی کہا کہ لوگوں میں ہمت نہیں، موقع نکل چکا ہے قومی جہاد نو کیا ہو گا فرقہ وارانہ فساد ہو جائے گا مولا بخش نہ مانا امین الدین صحرائی کے پاس پہنچا وہاں سے ملک عنایت اللہ کے ہاں گیا ملک صاحب نے اٹھ کر ملک، محبوب احمد کو ساتھ لیا اور میرزا ظہور الدین کے گھر پہنچے صلاح مشورہ کیا طے پایا کہ امرتسر چلیں وہاں سے یوسٹر چھپوائیں اور آئندہ جمعہ کو سول نافذی شروع کریں۔ امرتسر میں شیخ غلام محی الدین اتحاد ملت کے معتقد تھے انہوں نے ہمت کر کے اشتہار چھپوا دیا۔ یہ لوگ اشتہار لے کر لاہور واپس آ گئے لیکن یہ راز بھی قبل از وقت افشا ہو گیا اشتہارات چسپاں ہونے سے پہلے ہی پولس کے ہاتھ آ گئے۔

چودھری مولا بخش جمعہ کے روز شاہی مسجد پہنچ گیا اور لوگوں سے سارا قصہ کہہ ڈالا ہر ایک کا نام لیا کہ فلاں فلاں مسورہ میں نہر کب نکھا مگر اس وقت سب غائب ہیں لہذا اب وہ اکیلا ہی شہید گنج کو جا رہا ہے باہر نکلا تو پولیس نے گرفتار کر لیا اسی دن ضمانت ہو گئی لیکن یہ ایک دلچسپ ناٹک تھا جس کے ہدایت کار میرزا معراج دین تھے اُن کی چال کامیاب رہی چودھری مولا بخش نے اگلے روز شاہی مسجد میں ڈبیرہ ڈال کر سحر کب چلا دی۔ مولا بخش نے باقاعدہ محافظانہ دھاہر روز چار آدمیوں کا ایک قافلہ شہید گنج کی طرف جانا کبھی اُسے دروازے پر پکڑ لیا جاتا کبھی شاہی محلہ کے آس پاس کبھی نوگزے کی قبر کے

اردگرد کبھی پانی والے تالاب کے چوک میں۔ مولانجش اس دولہن میں معراجدین سے باقاعدہ ہدایت لیتا تو اسی کی بولی ہوتی رہا ایک دن اُس نے ہم سب کے خلاف جو منہ میں آیا کہہ ڈالا جس سے ہمارا یقین پختہ ہو گیا کہ اس ڈرا سے کامیرو ڈیوسر میرزا معراجدین ہے۔ ہم نے لاکھ چاہا کہ اس کا توڑ کریں لیکن سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کیا کریں

انہی دنوں مسٹر الیسر اے ڈی ایم لاہور کی عدالت میں پنجاب سوشلسٹ پارٹی کے دو نوجوانوں کامریڈ مبارک سائفر اور کامریڈ موہن لال کے خلاف مقدمہ چل رہا تھا کہ انہوں نے اپنی تقریروں میں شہید گنج کے انہدام کو نہ صرف انگریزی حکومت کی سازش قرار دیا بلکہ گورنر پر سجدہ ڈھوانے کا الزام لگایا ہے۔ اُن کا بیان تھا کہ آئندہ انتخابات میں فرقہ واریت کو پروان چڑھانے کے لئے مسجد گروائی گئی ہے۔ میری ان نوجوانوں سے علیک سلیک تھی ہم کبھی کبھار نخرکیب کاؤرخ سنوارنے کے لئے آپس میں صلاح مشورہ کر لیتے تھے۔ میرے قبضے میں کچھ کاغذات تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ مسجد شہید گنج پر جس شخص نے سب سے پہلے گنتی چلائی وہ ایک سکے سب انسپکٹر بننا سبب ہے۔ اسی طرح کی بعض اور معلومات بھی تھیں۔ ان نوجوانوں نے صفائی کے گواہوں میں میرا نام بھی لکھوا دیا میں نے عدالت میں پیش ہو کر سب سے پہلے اپنی حفاظت کا یقین چاہا میں نے کہا اگر عدالت مجھے یقین دلادے کہ میرے اگلا وقت پر میرے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا تو میں بہت سے واقعات عدالت کے نوٹس میں لانے کو تیار ہوں۔ عدالت نے آدھ گھنٹہ تک اجلاس ملتوی کر دیا مگر آدھ گھنٹہ بعد عدالت نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا مسٹر الیسر نے کہا جو کچھ کہنا چاہو اپنی ذمہ داری پر کہہ سکتے ہو طرزموں نے احتجاجاً صفائی ترک کر دی۔ شام کو میرزا صاحب کا ایک سب انسپکٹر میرے ہاں آیا ڈرا تا دمکاتار میں نے ٹکا سا جواب دے کر چلنا گیا۔

## یعسوب الحسن

یعسوب الحسن ہمارے ساتھ تھا ہم نے اُسے مولانا بخش اور معراج دین کو بے نقاب کرنے کے لئے آمادہ کیا؛ وہ مان گیا سی آئی ڈی کو ہر بات پہنچ جاتی ہے یہ بات بھی پہنچ گئی۔ اب یہ کہنا مشکل ہے ہوا کیا؟

\_\_\_\_\_ آدمی رات گزری ہوگی کہ پولیس نے مولانا بخش کو مسجد سے گرفتار کر لیا۔ صبح شہر میں بڑا حال ہو گئی۔

ہم نے فوراً ہی یعسوب الحسن کو شاہی مسجد بھجوا دیا اُس نے پہلے ہی دن تحریک کالب دل بھدیل ڈالا سی آئی ڈی کی درپردہ سازشوں کو بے نقاب کیا ایک ایک افسر کا نام لے لے کر اُس کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اُس نے کہا — یہ خانہ خدا ہے یہاں انگریزوں کا کوئی خانہ ناد نہیں رہ سکتا۔ میں سی آئی ڈی کے کارندوں سے کہتا ہوں کہ وہ فوراً ہی مسجد خالی کر دیں اور آئندہ سے مسجد میں داخل نہ ہوں آج کے بعد انہوں نے مسجد میں قدم رکھا تو مجھے ان کی نشان دہی کرنی ہوگی۔ پھر میں ذمہ دار نہ ہوں گا کہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے اس اعلان کے ساتھ ہی مامورین اُٹھ کر چلے گئے۔ یعسوب کی ان دھمکیوں سے سی آئی ڈی میں خاصی ہلچل مچ گئی دوسرے دن نماز ظہر کے بعد لوگ جلسہ کی تیاری کر رہے تھے کہ ایسا ایک چودہری مولانا بخش اُٹپکے اور یعسوب کے برابر بلکہ منبر کی بلانی نشست پر فروکش ہو گئے۔ پرسوں گرفتاری آج رہائی ہمارے لئے کوئی معائنہ تھا۔ ہم خوب سمجھتے تھے کہ میرزا صاحب گھبرا گئے ہیں اور تحریک پر ہمارے قبضہ کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ مولانا بخش یہ دوسری دفعہ رہا ہوا تھا کسی نے اُس سے یہ سوال نہ کیا کہ یہ ڈرامہ کیا ہے؟

جس شخص کو پولیس راتوں رات چھاپہ مار کر لے گئی ہو اُس کا دوسرے ہی روز چھوٹ جانا اور





سرگرمی کا حامی نہیں۔ یعوب کو مسجد میں واپس آجانا چاہیے۔ ورنہ مجھے اس سے لاتعلقی کا اعلان کرنا پڑے گا۔ طوفانوں کو ہالے عیوب اسی شام واپس آگیا۔ مولانجش نہیں چاہتا تھا کہ عیوب اُس کے ساتھ رہے اور خطابت و قیادت تقسیم ہو اس کے لئے جائے رفتن نہ یا تے ماندن کا مرحلہ تھا وہ مجبور تھا عیوب نے آتے ہی تحریک کو پھر سے تیز کرنا شروع کیا وہ تمام چالیں جو سی آئی ڈی چل رہی تھی اُس نے بے نقاب کر دیں مولانجش ہتیرا سٹپا یا لیکن بے سود۔ عیوب نے لوگوں سے کہا کہ رات بھر مسجد میں رہا کریں چنانچہ ہر روز کوئی چار اور پانچ سو کے درمیان لوگ مسجد ہی میں رہنے لگے۔

سی آئی ڈی نے عیوب کے بارے میں گفتنی و ناگفتنی باتوں کو عام کیا جب اس میں ناکامی ہوئی تو پھر ایک گماشتہ کو مقرر کیا کہ مسجد میں ہر رات چائے کی بوتلیں پکیتی ہے اس میں کوئی خواب آور چیز ڈال دی جاتے لوگ سو جائیں گے تو پولیس کو چھاپہ مارنے اور عیوب کو پکڑنے میں آسانی ہوگی، یہی ہوا لوگوں نے چائے پی اور لاشوں کی طرح لیٹ گئے۔ مولانجش عیوب کو حجرہ میں لے گیا رات دو بجے کا وقت تھا سی آئی ڈی کے اہلکار سہمے ہوئے سالیوں کی طرح صحن میں پھر رہے تھے جب ہر چیز اُن کے نقطہ نگاہ سے ٹھیک ہو گئی تو پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مسجد میں داخل ہو کر عیوب کو گرفتار کر لیا۔ مولانجش بھی پکڑا گیا عیوب کو مسجد ہی میں سی آئی ڈی کے حکام نے بُری طرح پٹیا پھیر چھاؤنی کے پولیس اسٹیشن میں لے گئے میرزا معراج دین نے چودہری مولانجش کی تو خوب آدب بھگت کی، کرسی پر ساتھ بٹھایا مگر عیوب کو نہ صرف یہ کہ مرصع گالیاں دیں بلکہ طمانچے اور گھونٹے مار مار کر اٹھو کر دیا جہاں تک بن پڑا ذلیل کیا۔

مولانجش معمولی لکھا پڑھا آدمی تھا کوئی کاروبار نہ تھا پیسہ اخبار میں چار روپے ماہوار پرائیک رہائشی کو اڑھارے رکھا تھا ہمیں اس کا بھائی دودھ دہی کی دوکان کرتا تھا۔ اُسے پھر ماہ کی سزا اور بی کلاس دی گئی عیوب جو بی لے تک پڑھا اور ایک کھاتے پیتے گھرانے کا نوجوان تھا

سی گلاس میں رہا۔ اُسے نہ صرف مختلف مقدموں میں پھنسا دیا گیا بلکہ جیل کے حکام کو اس پر سختی کرنے کی تاکید کی گئی۔ اٹھارہ سیرگندم کی پسائی اور قید تنہائی —————

### قائد اعظم کی آمد

اس اثنا میں قائد اعظم لاہور تشریف لاتے انہوں نے تحریک کا جائزہ لیا پھر مختلف لوگوں سے مل کر صورت حال معلوم کی آخر گورنر سے مل کر تمام نظر بندوں اور قیدیوں کو رہا کر دیا قائد اعظم دہلی میں واپس آئے سے مل کر آئے تھے اور یہاں اس طرح کی بد امنی کے خلاف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں اور سکھوں کے اکابر پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا کہ وہ مل ملا کر شہید گنج کے قصص کا حل نکال لیں۔ ہم نے قائد اعظم سے کہا کہ مولا بخش اور دیگر گرفتار شدگان رہا ہو گئے ہیں مگر بحسب الحسن سی آئی ڈی کے عتاب کی وجہ سے رہا نہیں ہوا اُسے بھی رہا کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ دو سو ٹیلٹ نوجوانوں کا مرٹڈ مہن لال اور کامرٹڈ مبارک ساغر کو بھی انہیں بھی شہید گنج ہی کے ضمن میں قید ہوئی ہے۔ قائد اعظم نے ان کے مقدمے کی نوعیت پر بھی ہم نے واقعات بیان کئے کہ انہوں نے حکومت پر الزام دھرا تھا کہ شہید گنج کے انہدام کی وہ ذمہ دار ہے اور آئندہ انتخابات کو اپنی مرضی کے مطابق لڑنے کے لئے اُس نے یہ ناکرہ پایا ہے۔ قائد اعظم نے ان نوجوانوں کے بیانات کی نقلیں منگوائیں مقدمہ کے دوسرے کاغذات دیکھے پھر حامی بھری۔ چنانچہ بحسب کے ساتھ ان کی رہائی کے احکام بھی اسی روز جاری ہو گئے۔

مولانا ظفر علی خان احکام نظر بندی کی تیغ کے کوئی چار روز بعد لاہور پہنچے باقی تمام نظر بند رہا ہو کر فوراً ہی لاہور چلے آئے کچھ دنوں کے لئے چل پہل ہو گئی۔ "زمیندار" اس وقت بند پڑا تھا جاری ہو گیا۔ دفتر زمیندار میں اتحاد و ملت کی تشکیل نو کی گئی۔ مولانا ظفر علی خان صدر منتخب ہوئے حاضرین نے اتفاق رائے سے سید حبیب کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا۔ مولانا ظفر علی خان راضی نہ ہوتے انہوں نے شاہ صاحب

کی جگہ ملک لال خان کو جبریل سیکرٹری بنوا یا۔ شاہ صاحب ناراض ہو کر چلے گئے اور حسب سابق مولانا ظفر علی خان کے خلاف لکھنے لگے۔ مولانا سیاست کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سید حبیب نے الزام لگایا کہ موجودہ انتخاب سیرز معراجدین کے ایما سے ہوا ہے اور مولانا ظفر علی خان کے گرد وہ لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ جن میں سے اکثر معراجدین سے بہابات حاصل کرتے ہیں۔ مولانا کے لئے کوئی سال الزام بھی قابل اعتناء نہ تھا انہوں نے ایک ورکنگ کمیٹی بنائی جس میں مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم بھی شامل تھے لیکن دونوں کا ذہن کانگریسی نکھامیاں فیروز الدین احمد سلم لیگ کے تھے۔ ملک لال خان کا اپنا کوئی ذہن نہ تھا مولانا محمد اسحاق مانسہروی کو احرار سے سخت عناد تھا۔ خدا بخش اعظم ابوسعیدانند اور مصطفیٰ شاہ گیلانی کا اور چھوڑ یہ تھا کہ مولانا ظفر علی خان کے عقیدت مند تھے میں بھی تھا اور محبوب بھی ظاہر ہے کہ ہم دونوں مولانا ظفر علی خان سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے ہمارا ذہن اصلاً انقلابی تھا۔ ہمارے علاوہ ورکنگ کمیٹی میں مولانا کے بھائی چودہری علام حیدر ان کے بٹے مولانا اختر علی خان بھی شامل تھے۔ اس مجموعہ امداد نے جو کارنامے سر انجام دئے ان کا ذکر اس کتاب کا حصہ نہیں جو کچھ ہوا ایک طربہ افسانے اور خزینہ نادل سے کم نہیں میں نے اپنی سرگذشت بوستے گل نالہ دل دو دو چراغ مغل میں اسکی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔

احرار نے جو شہید گنج کے ہاتھوں پٹا گئے تھے مولانا ظفر علی خان اور ان کے رفقاء کو ہدف مطاع بنانا شروع کیا جلال دین نام کا ایک درزی انارکلی میں بمبئی کلاتھ ہاؤس کی پشت پر خیاطی کی دوکان کرتا تھا۔ اُس نے خاصا روپیہ کمایا اور اب شیرنگ نام کا ایک روزنامہ نکال رہا تھا۔ ادارہ زمیندار کے کچھ سالقبہ ارکان بھی اُس کے عمل میں تھے۔ ان لوگوں نے مولانا ظفر علی خان اتحاد ملت اور ہم ایسے نوجوانوں کو جو تقریر کے میدان میں بڑے لمبے تھے قلم سے زخم پہنچانا شروع کئے۔

## پولیس میں خار و خس

میں نے جو اس نثرکیم میں اپنا مکاشفہ شامل ہوا تھا عجیب و غریب چیزیں دیکھ رہا تھا۔ کئی چہروں سے تقابلیں اور تریبی تقییں انگریزوں کے پروردہ سرکاری مسلمان جو آزادی آگئی تو آزادی کے علمبردار بن گئے۔ ہیتہ ہی سے مسلمانوں کی عزت نفس کے بیوہاری تھے۔ انگریزوں کے ادنیٰ اتارے پر مسلمانوں کے بڑے سے بڑے موقف کو چھوڑ جاتے، ملازمین کا معاملہ ان سے بھی گیا گزرا تھا ان میں کچھ پستے دل کے بھی تھے مگر جب انگریز کا سوال آتا تو اس کے کسی اشارے سے سرتابی کا سوچ ہی نہ سکتے تھے۔

پولیس میں خار و خس عام تھے اور سی آئی ڈی کے خطاب یعنی منتہ افسر تو آلا ماشاء اللہ اپنی ذاتی اور خاندانی ترقی کے لئے ہر موکرہ سر انجام دینے پر تیار رہتے۔ پنجاب میں احرار انگریز دشمن طاقتوں کا ایک فعال گروہ تھے مگر شہید گنج میں مار کھا گئے اب جو عناصر اتحاد ملت میں جمع تھے ان میں کانگریسی ذہن رکھنے والے بھی حصول مسجد کی بجائے رسوائی احرار کے لئے کوشاں تھے۔ اتحاد ملت کا پورا کنبہ سرکاری افسروں کی جیب میں تھا اور مولانا ظفر علی خان بالواسطہ انہی کے ہاتھوں میں تھے۔ میں جو اس کوہ میں بالکل ہی نووارد تھا اور محض جذبے کی بنا پر چلا آیا تھا یہ سارا تماشا دیکھ کر جبران ہو رہا تھا۔

ذہن اور اہم پر تھا فائدہ یہ ہنچا کہ میرا ملکہ خطابت منجھ گیا۔ ایک روز میاں فیروز دین نے مجھ سے کہا آج رات میرے ساتھ میرزا معراج دین کے ہاں چلنا وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے انکار کر دیا میاں صاحب نے کہا دشمنی مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں وہ اچھا آدمی ہے ذرا مل لینا اور مل لینے میں کیا ہرج ہے۔ غرض میں ان کے ہاں میاں صاحب کی معیت میں حاضر ہو گیا۔ لیکن ان کی باتوں سے متفق نہ ہو سکا میں تنگی ترشی کے دن گزار رہا تھا۔ مگر کسی کی بھوٹی کوڑی کار و ادارہ تھا۔ جماعتی فنڈ سے امداد لینا گناہ کبیرہ سمجھتا میرزا معراج دین کا آلہ کار بنایا اس کی اسلام دوستی کے آگے جھکنا میرے نزدیک کچن بن

جانے سے بھی فروتر تھا۔ میرزا صاحب نے ڈرایا بھی اور دھمکایا بھی مگر لا حاصل میں اپنی رعوت لے کر واپس آگیا۔ کوئی ہفتہ بعد میں نے راولپنڈی سے انبالے تک دورہ کیا ہر جگہ جلسے ہوئے میرزا صاحب کا نام لے کر انہیں آڑے ہاتھوں لیا لیکن وہ ہضم کر گئے۔ وہ فتنم، ہوشیار، مستعد اور جاں نثار افسر تھے۔ ان کی انگریزوں سے وفاداری کا یہ حال تھا کہ ترکی میں خصوصی خدمات انجام دے آتے تھے مثلاً مصطفیٰ کمال کو قتل کرنے کی برطانوی سازش میں مصطفیٰ اصغیر کے مشیر رہ چلے تھے انہی خدمات کے صلے میں حکومت نے انہیں ادبی ای کا خطاب دیا تھا۔

### جلال الدین درزی

میرزا صاحب نے روزنامہ نیرنگ کے مالک جلال الدین درزی کو ٹھیکہ دی۔ وہ میرے خلاف جو کچھ بھی لکھ سکتا تھا لکھنا ہا بنے لاپور کے ایک جلسہ عام میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ سپین کا جوش نہا کچھ سخت سست کلمات بھی نکل گئے میرزا صاحب نے جلال دین کو تیار کیا اس تقریر کی بنا پر میرے خلاف ۳۰۲/۱۱ کا مقدمہ قائم ہو گیا برطانوی عہد میں حکومت کا یہ حربہ رہا کہ کسی نوجوان کو سیاسی زندگی میں ابھرنے نہ دو ابھرنے لگے تو صرف نظر سے کام لو جب اس سے بھی بات نکل جائے تو خریدنے کی کوشش کرو خریدنے میں ناکامی ہو تو ہڈام کرو بدنامی کا رگ نہ ہو تو پھر عذاب وابتلا میں مبتلا کرو۔ سرکاری گمانے کسی شخص کو بھی آسانی سے پولیٹیکل فیگر (POLITICAL FIGURE) سیاسی آدمی، بننے نہ دیتے تھے۔ ان حربوں کے بعد سیاسی مقدمے چلائے جاتے اور تعزیرات کی ان دفعات کو استعمال کیا جاتا جو ایک شخص کے اعتراف و جود کی دلیل سمجھی جاتی تھیں۔ پنجاب کی سیاسی زندگی میں اکثر یہی ہوتا رہا یہاں مسلمانوں میں کوئی سی انقلابی تحریک نہ چل سکی۔ سی آئی ڈی کے مسلمان افسروں کی اکثریت کا یہ چلن رہا کہ وہ ابھرتے ہوئے مسلمان نوجوانوں کو روکیں نہ رکیں تو لالچ دیں لالچ سے نہ مانیں، تو ذلیل







ان کی رسوائی ہوگی بلکہ ضمیر بھی ملامت کرتا رہے گا۔

برائے کارغشی جی کے لئے عذاب ہو گیا ان سے تمام سٹریٹیکٹ جیمین لئے پوسٹس نے ان سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ ویرتک ڈرانے دھمکائے رہے لیکن انہوں نے ایسا فیصلہ خسوخ نہ کیا یہی کہنے رہے کہ اپنے ہی بیچے کے خلاف وہ جھوٹی شہادت کہو نہ کہہ دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد پوسٹس نے کبھی اس سے رابطہ میدان کیا بلکہ منتقم ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کا وسیع ہوٹل برباد کر دیا۔ انہوں نے بہ سب کچھ بروکر سے بروٹس کیا لیکس کیا وہی جس کا فیصلہ ان کے نمبر نے کیا تھا۔

### عدالت میں

دیوان برہم ناتھ نے ایک دن عدالت کو پولیس افسروں سے خالی پایا تو مجھ سے مقدمہ کا پس منظر پوچھا میں نے تمام قصہ بیان کر ڈالا بڑا منشاثر ہوا بلکہ دکھ محسوس کیا کہ کوئی نوجوان بتھے نہ چڑھے تو سی آئی ڈی والے اس حد تک منتقم ہو جانے ہیں۔ اُس نے کہا گھبراؤ نہیں معاملہ کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں تم سے انصاف ہوگا۔ اور ضرور ہوگا۔ خلیفہ تجماع الدین کی بجٹ کے بعد عدالت نے ۱۱/۰۲/۲۰ کو نوڈیا کوئی ہلکی سی دفعہ لگا دی اور دو ہزار کی حاضر ضمانت پر تاسماعت مقدمہ مجھے رہا کر دیا۔ آقا بدار بخت خان نے ضمانت دی آقا صاحب ہر پیشی پر موجود ہوتے دیوان برہم ناتھ استغاثہ کی زنجیریں توڑنے کے لئے انہیں صفائی کی راہیں بتاتے۔ سی آئی ڈی کے عمر و عیار بھی سمجھ گئے تھے کہ ان کا دار خالی جا، ماہے انہوں نے ہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر نیران کے ترکش میں نہیں تھا ڈپٹی کنسٹبل نے مجسٹریٹ کو اشارہ کیا مگر چونکہ انگریز تھا لہذا جو ڈسٹری میں واضح مداحی کو عیب سمجھتا جب سی آئی ڈی کو یقین ہو گیا کہ مجسٹریٹ کا وہن میری طرف راسخ ہے تو میرزا صاحب نے فیروز الدین احمد کو بلایا اور کہا کہ وہ شورش کے معاملہ میں منتقم نہیں۔ اس سے کہو آئندہ زبان قابو میں رکھے وعدہ کر لے تو ہم اس مقدمہ میں اُسے چھڑا دینے کے لیے

تیار ہیں؛ میاں صاحب پیغام لائے تو میں نے ہر سچا بادا باد کہہ کر ٹال دیا ان سے کہا کہ اس قسم کے سمجھوتوں سے نہ تو اپنی سیاسی زندگی مجروح کرنا چاہتا ہوں اور نہ مجھے میرا صاحب سے دوستی پیدا کرنے کی خواہش ہے۔

میاں صاحب میرے معاملہ میں غالباً غلط تھے اور سمجھنے نہ تھے کہ جب کوئی پولیس مافسوسدی ہو جاتا ہے تو محبوب نوجوان کی زندگی کیوں متاثر ہوتی ہے۔ وہ اپنی سی کوشش کرتے رہے مگر میں ان نامحوں کی دسترس سے باہر تھا۔ آخر فیصلہ کی تاریخ آگئی۔ سب انسپکٹروں اس مقدمہ میں سی آئی ڈی کی طرف سے نگران تھا شرط باندھنا ہا کہ چھ ماہ بعد ہوگی اور ضرور ہوگی ہم کچھ نہ کہنے کی پوزیشن میں تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے تھے کہ دوران برہم ناتھ پر پولیس کا کوئی اثر نہیں وہ جو فیصلہ کرے گا اس کا اپنا فیصلہ ہو گا یوں بھی وہ اعلیٰ درجے کا خاندانی انسان تھا۔ غالباً راجہ زبیر ناتھ کا بھانجا یا بھتیجا تھا۔ اس کے بہت سے رشتہ دار اعلیٰ اہل عہدوں پر مامور تھے۔ وہ نوکری کو نوکری کے لئے نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے لئے ایک مصروفیت پیدا کر لی تھی۔ فیصلہ لکھنے یا حکم نانے سے پہلے وہ دو دفعہ ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا کچھ پوری بند ہونے کے وقت کوئی چار بجے کے لگ بھگ اس نے فیصلہ سنایا کہ

”ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۵۶۲ کے تحت ایک سال کے لئے دو ہزار روپے

کی ضمانت پر آپ کو رہا کیا جاتا ہے۔“

قدرتا ہم سب دوستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اندازاً ہم یہی سمجھتے تھے۔

### تخریب کی نشتِ اول

ان دنوں تمام ملک میں صوبہ جاتی خود مختاری کے تحت جنرل انتخابات (۱۹۴۷ء) کی تیاری کا چرچا ہو رہا تھا۔ گاس نے بھی لنگوٹ کس رکھا تھا۔ لگ کو بھی نامہ انظم زندہ کر رہے تھے۔ پنجاب میں

کانفرنس پارٹی کا ہولہ ہاتھ میں نے عسوس کی یکہ شہید گنج کی مائیشی دوڑوں کے حصول میں استعمال جو رہی ہیں۔  
 مولانا ظفر علی خان کے حکم اور زبان پر تو شہید گنج ہی کا نام تھا مگر ان کے ساتھ جو لوگ تھے وہ اپنے ہی مقصد  
 کی راہ پر تھے۔ عسوس ہوتا تھا جیسے ان کا مشن امور کو گالی دینا رہ گیا ہے یا پھر وہ اسمبلی میں ممبر منتخب  
 ہونے کے لئے جوڑ توڑ کر رہے ہیں۔ کسی امیدوار کے سامنے املا شہید گنج کی بازیابی کا مطالبہ نہ تھا  
 اور انا مشا۔ انشا جو سکتا ہے کسی کو اس خیال سے اختلاف ہو لیکن میں کم از کم یہی عسوس کر رہا تھا۔ نتیجہ بھی یہی  
 نکلا میں عمر کی اس منزل میں تھا کہ اس وقت لیڈروں کے ان ہتھکنڈوں یا مصلحتوں سے بالکل ہی  
 بے واقف تھا۔

### ناگفتنی و گفتنی

جوں جوں حالات گہر کر سامنے آتے گئے تو میں استعجاب بہتا گیا اور میں سوچ کے  
 داترے بناتا رہا۔ مولانا ظفر علی خان گھومتے پھرتے رنگوں پہلے گئے لوٹے تو اتنا تخیل معرکوں کا آغاز ہو  
 چکا تھا۔ جو وہ سپیہ اکتھا کر کے لائے جنرل سیکریٹری نے سنبھال لیا۔ ادھر ہم شہید گنج کانفرنس کی تیاریاں کر چکے  
 تھے۔ طے پایا کہ مولانا حسرت موہانی کو صدارت کے لئے آمادہ کریں۔ وہ کسی وجہ سے راضی نہ ہوئے ان کی  
 جگہ سید اشوکت علی کو صدر بنایا گیا۔ لاہور میں ان کا تاریخی جلسہ نکلا۔ کانفرنس اس ٹھاٹھ سے ہوئی کہ ملک  
 ناکر بھی ہزار ہا انسانوں کا مجمع ہو گیا۔ نتائج نے ہمیں سخت مایوس کیا۔ — مجھے ایک روز پہلے بعض  
 سرہنہ راز معلوم ہو چکے تھے یہاں تک کہ کانفرنس میں پیش ہونے والی قراردادوں کے متن سے بھی آگاہ  
 تھا۔ میرے علم میں تھا کہ غلام نلال قرارداد کا مسودہ نلال سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تیار کیا ہے اور اتنی رقم  
 کانفرنس کے نام پر غلام راہبانے حاصل کی ہے۔ اب جو کانفرنس میں یہی نقشہ جتنے لگا تو آنکھیں کھلیں۔  
 اتنا وقت کا نوجوان گروپ سول نافرمانی کا تہیہ کئے بیٹھا اور حکومت سے ٹکر لیتے پر تیار تھا۔ گورنر کا

خیال تھا کہ نیجائی مسلمانوں کو اپنے پشتینی وفاداروں کی معرفت رام کر لے گا اور معاملہ صرف احرار کی بربادی تک رہے گا جو سرکارِ وائٹمنار کے دل کا کٹنا بنے سوتے تھے مگر مسلمان عوام اور مسلمان خواص میں فرق تھا۔ شہید گنج نے اءار کو واقعی برباد کر دیا لیکن یہ سانحہ سرکار کے لئے بھی دردِ دہر ہو گیا۔ اب صوبائی حکومت کے اعضاء و جوارح اس فکر میں تھے کہ انتخاب میں شہید گنج کا اہتمام احرار کے خلاف استعمال ہو۔ مگر اس طرح کہ حکومت کے لئے بر لسانی نہ ہو۔ سی آئی ڈی کو ہم لو جو انوں سے ارادوں کا علم تھا۔ اس کا مفروضہ تھا کہ ہم نے اتحادیت کی لہڈرتب کے خلاف ہنگامہ کیا جو جو بھصان ہو گا اس کا فائدہ احرار کو پہنچے گا۔ سی آئی ڈی کے حکام نے اپنے طور پر اتحادیت کے بزرگوں کو بھی مطلع کر دیا وہ ہمیں راضی کرنے کی فکر میں تھے چنانچہ کانفرنس کے شروع میں بہرام راہنما ہمارے ٹنٹ میں تشریف لائے اور زرد رویتے رہے کہ ہم سول نافرمانی کا خیال چھوڑ دیں۔ ایک بزرگ نے کہا حکومت سے ٹکر لینے میں کوئی فائدہ نہیں اٹانقصان ہے یومیں تیار بیٹھی سے جونہی اس قسم کا کوئی فیصلہ کیا گیا تو ہم سب فوراً ہی گرفتار کر لئے جا میں گے پھر چوتھا ہی ہوگی اس کا آپ کو اندازہ نہیں وغیرہ۔

میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی جواں مردی نہیں کہ مسجد کے نام پر بے گناہ مسلمانوں کو مروا کر انکے لوہ کی اساس پر انتخاب لڑا جائے اور شہید گنج کو یکسر بھول جائیں۔ ڈاکٹر عالم نے وکیلانہ موٹگانیوں سے کام لینا شروع کیا فرمایا جب تک متادم عدالت میں ہے سول نافرمانی نقصان دہ ہے بلکہ فیصلہ کے راستہ میں مانع ہوگی۔ انتخاب میں حصہ لینے کا مطلب ہے کہ ہم اسمبلی میں جا کر اپنے جمنوا پیدا کریں اور مسجد کی بازبانی کے لئے قانون بنوائیں۔ ان باتوں کا ہم پر کیا اثر ہوتا؟ ہمیں پس منظر ہی معلوم تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب کو مخاطب نہ کر س مولانا سے مخاطب ہو کر عرض کیا کہ یہ لوگ شہید گنج سے دوست نہیں اپنی ذات کے دوست ہیں۔ میں یہ عرض ہی کر رہا تھا کہ مولانا اختر علی خان نے چونک کر فرمایا اس کا مطلب ہے کہ مولانا ظفر علی خان اس بڑھاپے میں جیل چلے جائیں اور وہاں مر جائیں۔ ”زمیندار“ بند ہو جائے

ان کی اولاد وزیر آباد جا کر کوئٹہ کی دوکان کھول لے۔ گدائی کرنی پھرے۔ - یہ کوئی دلیل نہ تھی اور نہ  
 اختر علی خان کی اس جذباتی شہدہ بازی کا کوئی جواب تھا اور نہ ہم اس بحث ہی کو جاری رکھ سکتے تھے۔  
 ہم نے مولانا ظفر علی خان سے عرض کیا ہم نوجوان آپ کو اپنے خوں سے لکھ کر دے رہے ہیں کہ حصول  
 مسجد کے لئے ہماری جانیں بھی حاضر ہیں۔ باز بانی کے منے کو کھٹائی میں ڈالنا مناسب ہوگا اور یہ گناہ کبیرہ  
 ہے کہ ہم شہید گنج کی اینٹوں کو انتخاب کے لئے استعمال کریں۔

## دل کے داغ

محل بے نتیجہ رخصت ہو گئی ایک ایک راز کھل کر سامنے آتا ہوا قرار دادوں کا وہی متن بھتا جو  
 ہمارے علم میں تھا۔ محرک اور موید بھی وہی تھے جو سرکار نے مفر کئے تھے۔ دو علم پن کے عجیب نظارے  
 بھے بعض ارکان ہمیں دیکھتے تو ہمارے ساتھ ہو جاتے۔ مولانا ظفر علی خان سامنے آتے تو انکے اشارہ ابرو  
 برقریب ہوتے آخری اجلاس میں ڈاکٹر عالم نے اپنی قرارداد پیش کرنے ہوئے دھواں دار تقریر کی مقرر  
 وہ بہت اچھے تھے لوگوں کو شیشے میں اتارنا انہیں خوب آتا تھا۔

قرارداد میں درج تھا کہ مجلس اتحاد ملت شہید گنج کے حصول کی خاطر انتخاب میں حصہ لینے  
 کا فیصلہ کرتی اور اس وقت تک راست اقدام کی ہر تجویز کو ملتوی رکھتی ہے جب تک انتخابات نہیں  
 ہو جاتے یا عدالتی کارروائی کا فیصلہ نہیں ہوتا۔

اس قرارداد سے لوگوں میں زبردست مایوسی پیدا ہوئی ہم نے یسوب کو آگے کیا اُس نے  
 قرارداد کی مخالفت میں ایک زوردار تقریر کی تو مجمع اس کے ساتھ ہو گیا اس نے کہا ہم شہید گنج کی اینٹوں  
 اور شہیدوں کے خون کو انتخاب میں ہرگز ہرگز استعمال نہ ہونے دیں گے یسوب کے بعد ابو سعید انور اور  
 آخر میں۔۔۔ میں نے تقریر کی۔ لوگوں میں ایک آگ سی لگ گئی عجب نہ تھا کہ پٹال ہی اُٹا دیا جاتا

مگر مولانا ظفر علی خان کی ایک انتہائی خوبصورت 'ادب' جذباتی اور اسلامی تقریر نے ہمارے احتجاج پر پانی پھر دیا  
 حاضرین تقسیم ہو کر رہ گئے۔ ملک لال خان نے کرائے کے دس بارہ رضا کار ہمیں ملعون کرنے کے لئے  
 لکڑے کر دیئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کانفرنس دوسرے دن پر متوی ہو گئی۔ ہم نے آپس  
 میں فیصلہ کیا کہ سبھی لکڑے باران دیدہ ہیں اور جو حالات انہوں نے پیدا کئے ہیں ان پر قابو پانا ہمارے بس  
 میں نہیں، بہتر ہو گا کہ احتجاجاً کانفرنس کے سارے نگرہی کو آگ لگا دیں۔ سوچی دروازے سے لے کر کبری  
 دروازہ تک ایک پورا شہر آباد تھا۔ باغ کے دورویہ کیمپ ہی کیمپ گڑے تھے۔ تھم دوست  
 سبیری اس تجویز سے متفق ہو گئے اور ہم نے دو بجے رات یہ تماشہ چاویئے کا فیصلہ کر لیا لیکن ہمارے  
 ہی ایک ساتھی نے جو ملتان سے مندوب تھا مولانا ظفر علی خان کو مطلع کر دیا جس سے بڑے لیڈر  
 جو کنا ہو گئے کوئی ڈر پڑھ بجے شب ملک لال خان میاں فیروز الدین احمد اور بعض دوسرے لوگ اجنبی چہروں  
 کی ایک کیمپ لے کر پنڈال پر قابض ہو گئے اس میں بہت سے بولس کنٹریبل بھی تھے جو سفید لباس  
 میں، مینا کاروں کی حیثیت سے آئے تھے میاں فیروز الدین خاکسار دوستوں کا ایک دستہ لیکر ہمارے  
 کیمپ میں آ بیٹھے دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے فرمایا کہ آپ لوگ غلط باتیں سوچ رہے ہیں  
 مولانا ظفر علی خان کو پنڈال میں آگ لگا دینے کی تجویز کا علم ہو چکا ہے اور یہ سب جوانی انتظامات آپ  
 لوگوں کے خطرے کی وجہ سے کئے گئے ہیں غرض اس طرح ہماری یہ اسکیم پروان نہ چڑھی اور کانفرنس طے شدہ  
 قراردادوں کے مطابق بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ میرا دل اس کے بعد اچاٹ ہو گیا میں نے خانہ نشینی اختیار  
 کر لی۔ میرے سامنے مطالعہ کا وسیع میدان تھا کتابوں میں ڈوب گیا خیالات شروع ہی سے قومی تحریک  
 کی طرف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال سے بڑی طرح متاثر تھا۔ علامہ اقبال کے کلام کا بھی طبیعت  
 پر اثر تھا۔ خود مولانا ظفر علی خان شہید گنج کی ہنگامہ برائی کے باوجود ابھی تک کانگریسی ذہن رکھتے تھے اور  
 زمیندار متواتر کانگریس کی حمایت کر رہا تھا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز مدینہ کی ادارت سے بلکدوش ہو کر

زمیندار کے چیف ایڈیٹر ہو گئے اور کانگریس کی حمایت میں ہمیشہ پیش تھے۔

میں کچھ زیادہ عرصہ خانہ نشین نہ رہ سکا مولانا ظفر علی خاں باہر نکال لائے اور مولانا عبدالقادر  
تصوری اور ڈاکٹر محمد عالم گرد ہو رہے تھے ان کا اتفاق تھا کہ ایکشن کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں قومی  
سیاسیات کا انحصار انتخاب کے نتائج پر ہے دو نو ذمہ دار کانگریسی تھے میں ان تجربہ بول کے باوجود  
نومرخصا سپر انداز ہو گیا پھر جہاں تہاں بن پڑا انتخاب میں حصہ لیا مگر دل کھٹا ہونا ہا کیونکہ ہر شخص قوم  
کے بچانے اپنی ذات سے متعلق سوچ رہا تھا۔

انتخابات ہو چکے تو نقشہ ہی بدل گیا احرار پٹ گئے جن امیدواروں نے شہید گنج کے حصول  
لایقین دلایا تھا وہ کامیاب ہونے کے بعد طوطا چشم ہو گئے۔ ان کے وعدے دوشیزہ کی کہہ مکر نیاں  
ٹکے لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے راجہ غضنفر علی خان اور ملک برکت علی راجہ نے فوراً  
ہی یونی انسٹ پارٹی میں شرکت کر لی۔ البتہ ملک برکت علی نے مرتے دم تک لیگ کا پنڈ نہ چھوڑا۔ ڈاکٹر  
عالم شہید گنج کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر کانگریس میں چلے گئے جب لوگوں نے اولینڈی کے جلسہ عام  
میں ان پر اعتراض کیا تو فرمایا کہ کانگریس نے انہیں اپنا کر گویا شہید گنج کی ماریا بی کا اصول مان لیا ہے  
انہوں نے لوگوں کو مغالطہ دیتے ہوئے کہا بے شک میں شہید گنج کے ٹکٹ پر منتخب ہوا ہوں لیکن  
کانگریس نے مجھے اپنا رکن بنا کر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ میرے چناؤ کی بنیاد درست ہے۔

### تیسری گرفتاری

ایکشن گنڈا تو کوئی میڈر اتھا دولت کا رخ نہ کرتا مولانا ظفر علی خاں اکیلے رہ گئے سردار سکندر جتیا  
نے ان کے بڑھاپے سے فائدہ اٹھا کر زمیندار کی طعیناتی کو روکا۔ ملک برکت علی نے شہید گنج کی بازیابی  
کے لئے پنجاب اسمبلی میں فرار داد پیش کرنا چاہی تو سکندر جتیا گھبرا گئے۔ گورنر آڑے آگیا اچانک ایک

ایسا پچھڑا کہ بل ہی رہ گیا تاہم کچھ دیر کے لئے شہید گنج سکندر حیات کے حلق کا کاٹنا بن گئی۔ احرار نے شہید گنج ہی کی آڑ میں جو ابی حملہ کیا سکندر حیات میری تقریروں سے ناخوش تھے انہوں نے مولانا مظہر حسین سے شکایت کی۔ مولانا کچھ کرنے سے قاصر تھے میں نہ مانا سرکار نے جنڈیالہ گورد کی ایک تقریر نکلوا کر میرے خلاف ۱۲۴ الف کا مقدمہ چلوا دیا۔ ضمانت ہونے تک میں دس بارہ روز امرتسر سب جیل میں رہا الزام تھا کہ میں نے ملک معظم کی حکومت کے خلاف لوگوں کو تشدد پر ابھارا اور مسلمان نوجوانوں کو مسورہ دبا ہے کہ وہ بھگت سنگھ اور دت کی طرح بم بنائیں، پستول چلائیں کیونکہ جب تک وہ ٹیرسٹ نہیں بنیں گے اس وقت تک ان کی تقدیر ہمیں بدلے گی انگریزی حکومت ہی کے خاتمہ پر ان کی قومی زندگی کے اجبار کا انحصار ہے میں نے سکندر وزارت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کہ شہید گنج کی ایڈٹوں پر اپنی عمارت کھڑی کر کے یہ لوگ اس سانحہ ہی کو بھول گئے ہیں۔ میرا جی کہہ مٹا تھا کہ مسلمان نوجوانوں میں ابک بھی انقلابی نہیں — اور جسارت و حرارت کے سارے دلوں ہتھوڑے نوجوانوں میں ماسے جاتے ہیں چونکہ میں نومش تھا اس لئے خطابت میں اگر مگر اور لیکن ویسکن کے پوند لکے سے بالکل ناواقف تھا۔ جو الفاظ میری تقریر میں موجود تھے وہ میں نے نہیں کہے تھے تاہم میرا جذبہ ہی تھا۔ مقدمے کا بنتا تھا کہ اتحاد ملت کے سبھی رہنماؤں نے آنکھیں بھر لیں وہ لوگ جو الیکشن میں بچھے جاتے تھے اب ان کا سایہ بھی نہیں مل رہا تھا۔

ڈاکٹر عالم جو مدت سماجت کر کے مجھے الیکشن میں ساتھ لیتے پھرے تھے ایک دفعہ بھی مقدمہ میں پیش ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے ضمانت اس طرح ہو گئی کہ پہلے دن جب مجھے گرفتار کر کے پنڈت و بٹنو بھگوان اے ڈی ایم کی عدالت میں پیش کیا گیا تو ڈاکٹر عالم کسی دوسرے مقدمہ میں وہاں موجود تھے مسری طرف سے بلنس ہو کر ضمانت کرا گئے لیکن ضمانت کا یہ حال تھا کہ اتحاد ملت کے کارکن مزدبیک نہیں آنے تھے کوئی دو ہزار کی ضمانت دینے والا نہ تھا آخر سب نلام محی الدین جو



مقامی حکومت کے کرتا و پرتا تھے کسی طرح راضی ہو گئے اور میں دس بارہ روز اندر رہ کر باہر آ گیا۔ یہ اس شہر کا حال تھا جو آئے دن میری تقریروں کا شائق رہا جہاں میرا اپنا گھر تھا میرا خاندان آباد تھا میرے دوستوں کا ہجوم تھا۔۔۔ والد اس لئے ناراض تھے کہ میں نے غلط راہ اختیار کی ہے اور حکومت کے کارکن ضمانت دینے سے اس سے رک گئے تھے کہ لاسور کے بڑے رہنماؤں کا اشارہ میرے خلاف تھا۔ وہ سردار سکندر حیات اور میرزا معراج دین کی خوشنودی کے تابع تھے۔

میں نے اس تنگدستی بلکہ فاقہ مستی کے زمانے میں بھی اپنا ہاتھ کسی شخص 'ادارے یا فرد کے سامنے نہ پھیلا یا اور آج جب اُن دنوں کی غیرت مندی کا خیال آتا ہے تو جی خوش ہوتا ہے کہ قدرت کاملہ انسان کو کیسی کیسی مشکلوں سے نکال کر لے جاتی ہے۔۔۔۔۔

گزر بسر کا بہ حال تھا کہ روٹی گھر سے کھانا کپڑا پٹا جھوٹا مل جاتا، جیب خراب تھا نہیں کچھ لوگ اشتہاروں کے مضمون لکھوا لیتے جس سے سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔

### ڈاکٹر سیف الدین کچلو

امرتسر میں پیشی تھی بس لاہور میں تھا دفتر زمیندار میں پہنچا صبح کا وقت تھا اختر علی خان سے پانچ آنے کرایہ مانگا قرض حسنہ! ان دنوں بس کا سہی کرایہ تھا مگر ٹکا سا جواب ملا جی میں آزرہ بھی تھا اور شرمندہ بھی، ریلوے پولیس لائنز کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو؟ عدالت سے غیر حاضر ہونے کا مطلب تھا ضمانت کی ضبطی با منوخی اور جیل میں واپسی، حسن اتفاق کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اپنی کاریں جا رہے تھے مجھے دیکھا تو موٹر روک لی بوجھا یہاں کھڑے ہو، عرض کیا امرتسر مقدمہ کی پیشی ہے بس کارا سٹو دیکھ رہا ہوں۔ بے بسی کا اظہار پھر بھی نہ کیا ڈاکٹر صاحب نے موٹر کا دروازہ کھول دیا۔ "اُد میں بھی امرتسر جا رہا ہوں۔" اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں سوار ہو گیا۔ پوچھنے لگے پیروی کون کر رہا ہے

کوئی ہونا تو کسی کا نام لبتا چپ ہو رہا آنکھیں ڈبڈبائیں فرمایا کن احمقوں میں پھنس گئے ہو، اچھا! تو میں پیش ہوں گا جس نے ڈاکٹر صاحب سے سارا قصہ کہہ ڈالا انہیں بہت دکھ ہوا انتخاب میں وہ بھی کامیاب ہوئے تھے مگر الیکس ٹرینول کی ہر بات سے نشست کھو بیٹھے تھے۔ میں نے ان کی حمایت و رفاقت میں کبھی کوئی کام نہ کیا تھا لیکن ان کے ادب و احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ کبھی نہ چاہا کہ میرا نام ان کے خلاف استعمال ہو یا سرے فلم و زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو گستاخی میں شمار ہو۔

میں ان کے کیمپ میں نہیں تھا لیکن انہوں نے میرے ساتھ جو لوگ کیا میرے دل پر آج بھی نقش ہے عدالت میں بہ التزام تشریف لاتے مقدمہ کی سپروی کرنے ساتھ لے جاتے مدارات فرزندے لاہور ہوتا تو امرتسر لے جاتے امرتسر ہوتا تو لاہور لے آتے اس معمول میں کبھی ناغہ نہ کیا۔ ایک روز کہیں باہر جا رہے تھے شیخ مسعود صادق کے والد شیخ محمد صادق کے ہاں لے گئے ان سے کہا کہ کل اسکی پیشی ہے میں ایک دن کے لئے باہر جا رہا ہوں ختم پیش ہو جانا۔ شیخ صاحب بڑے ہی زندہ دل بزرگ تھے مجھے ساتھ لیکر عدالت میں پہنچے کسی گواہ پر جرح ہونی تھی کوئی غیر متعلق سوال کر دیا عدالت نے کہا شیخ صاحب معلوم ہوا ہے آپ نے مقدمہ کا فائل ہی نہیں دیکھا۔ فائل دیکھا ہوتا تو مقدمہ کی رویت داد آپ کے ذہن میں ہوتی آپ اس سے مختلف سوال کرتے۔ آپ کے سوالات کا نفس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔۔۔ شیخ صاحب نے فرمایا اس مقدمہ میں وکیل تو ڈاکٹر کچھو ہیں وہ کسی کام سے آج باہر گئے ہیں مجھے کہہ گئے تھے اس لئے چلا آیا ہوں وہ بھی کشمیری، ملزم بھی کشمیری، میں بھی کشمیری اور آپ بھی کشمیری۔ نفس مقدمہ، غیر کشمیری ہے لہذا اسے دیکھنے کا سوال ہی بے معنی تھا۔

ویشنو بھگوان شیخ صاحب کے اس لطیفہ شعری پر سنس دبا اور جرح آئندہ پٹی پر اٹھادی۔۔۔

ڈاکٹر کچھو نے ایک دن موقع پا کر ویشنو بھگوان سے کہا کہ ملزم نو عمر ہے چھوڑ دو۔ مقدمہ کو طول دینے سے فائدہ؟ ویشنو بھگوان کے دل میں ڈاکٹر صاحب کا بے حد احترام تھا کہنے لگا مسٹر

سیکڑوں (ٹریڈ کسٹرز) مجھ سے دو دفعہ پوچھ چکے ہیں۔ صوبائی حکومت خاص دلچسپی لے رہی ہے وزارت  
 رام ہوجانے تو مجھے آسانی ہو جائے گی یا پھر اس قسم کی شہادت ریکارڈ پر آئی چاہیے جس سے تیرید ہوتی ہو کہ  
 ملزم نے تشدد کی ترغیب دی ہے جو سرکاری گواہ پیش ہوتے ان میں سے ایک ہندو گواہ ہی راستی پر رہا  
 اسکی شہادت کا نایاں حصہ میرے حق میں تھا ویشٹو جگوان نے مشورہ دیا کہ مولانا ظفر علی خان کیمٹن صدر  
 شہادت دیں کہ ان کی جماعت مسلمانوں کی جماعت ہے جو حصول مسجد کے لئے بنائی گئی ہے اس کی  
 جدوجہد عدم تشدد پر ہے۔ شورشیں اس جماعت کا ذمہ دار رکھتی ہے۔ اس سے یہ توقع ہی نہیں  
 کی جاسکتی اور نہ عقل سلیم مانتی ہے کہ ایک ایسی جماعت کے پلیٹ فارم سے اس نے مسلمان نوجوانوں  
 کو یہ تلقین کی ہو کہ وہ حصول مسجد کے لئے بھگت سنگھ یادت بن جائیں بہ لفظاً و معناً غلط ہے۔  
 ڈاکٹر صاحب نے لاہور بیچ کر مولانا سے ذکر کیا وہ راضی ہو گئے مگر شہادت کے روز انہوں نے  
 کمال کیا عدالت نے سوال کیا کہ آپ عدم تشدد کے حامی ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا —  
 بالکل نہیں اگر مجھے حصول مسجد کے لئے تلوار اٹھانی پڑے تو میں اس سے بھی گریز  
 نہیں کروں گا۔

عدالت نے پوچھا آپ کی جماعت اپنی جدوجہد میں عدم تشدد کی پابند ہے، انہوں نے  
 اس کی بھی تردید کر دی۔ فرمایا ہم عدم تشدد کو اختیار کر کے مسلمانوں کو بزدل بنانے کے حامی  
 نہیں ہیں —

مجسٹریٹ خندہ لہی کے ساتھ سنتار ہاڈاکٹر صاحب نے شہادت ختم کر دی — مجسٹریٹ  
 نے کہا آپ مقدمہ ہار گئے ہیں اس پر بھی ڈاکٹر صاحب نے مجسٹریٹ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر  
 لیا چونکہ مقدمہ کافی خراب ہو چکا تھا لہذا پانچ سو جرمانہ اور نا اجلاس عدالت قید کی سزا کاٹے ہو گیا۔  
 جس روز حکم سنانا تھا ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلوایا اور فیصلے سے مطلع کیا میں نے کہا ڈاکٹر صاحب



اگلے روز زمیندار میں ذیل کی نظم شائع کی، عنوان تھا ————— شورش کشمیری کے نام ————— اس نظم نے میرا حوصلہ جواں کر دیا پھر جب مولانا کا دیوان چھپ کر سامنے آیا تو مرتب نے ان بوجہی معلموں کے نکتہ نظم کا عنوان ہی بدل ڈالا —————

### شورش کشمیری کے نام

کیا حکومت نے چند دن کے لئے جو زنداں میں بند تجھ کو  
 تو شکر حق کر کہ راوختی میں پنچ رہا ہے گزند تجھ کو  
 جس آزمائش میں پڑنے والے حیات جاوید پا چکے ہیں  
 اس امتحان کے لئے کیا ہے ترے خانے پسند تجھ کو  
 جو تجھ کو متباد چھوڑ دیتا سمجھ کے صید زبوں تو کیا تھا  
 کشاں کشاں لے گئی چین سے قفس تک اسکی گنبد تجھ کو  
 وہی ہوا انداز بسلی کا جو شیوہ ترک نیم جاں تھا  
 اگر کٹانا پڑے محمد کے نام پر بند بند تجھ کو  
 زمیں کو لرزا فلک کو جکرا عسب کو گرما عجم کو تڑپا  
 ملا ہے فطرت کی ارجندی سے دل اگر درد مند تجھ کو  
 حسین کا سر ہے آسماں پر کہ رہ چکا تھا کبھی سناں پر  
 تو کم سے کم سرکفت تو ہو جا جو سر ہے کرنا بلند تجھ کو  
 بھرا ہوا زہر کا پیالہ جو آگے آئے تو اس طرح بے  
 کہ گھول کر گویا دے رہا ہے حریف ساغر میں قند تجھ کو







سنٹرل جیل لالہور (۲۳ مارچ ۱۹۴۷ء کی بجے) - منجھو دار

دعا دوست جو تختہ دار پر لٹک گئے مولف اس

کے یادمیت لہذا یہ سلام پیش کر رہا ہے



بجٹی پر مہمان نام کا ایک تہہ اور شخص جیلر تھا اور سپرنٹنڈنٹ وہی کرنل سوندمی۔ جو ان دنوں دو ماہ کی چھٹی پر تھا۔ قائم مقام سپرنٹنڈنٹ۔ پڈت من مو من ناتھ ایک خوش باش، خوش گفتار اور خوش طبیعت انسان تھا۔ بجٹی نے یرا نے چودہ نمبر میں بھجوا دیا جہاں مجھے عقیقی تھ چکوں میں رکھا گیا جو کئی سالوں اور دیواروں میں گھری ہوئی تھیں۔ اس وحشتناک تنہائی کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے، پہلے اس احاطہ میں سزائے موت کے قیدی رکھے جانے تھے۔ پھر نیا چودہ نمبر سا نوا اس احاطہ کے پہلے حصے کی جگہاں تو انہی کے لئے مخصوص رہیں مگر باقی دو حصوں میں جیل کے بد معاش یا خطرناک قیدی رکھے جانے لگے۔ جس قیدی نمبر دار کا بچہ پر پہرہ تھا اسے مجھ سے بات کرنے یا میرے نزدیک آنے کی اجازت نہ تھی۔ میں کوئی گھنٹہ بھر ٹہلنے کے بعد بند ہوتا تو نمبر دار پہلے حصہ میں چلا جاتا اور یہ تنہائی تھی۔ میں نے سوچا پھر ارادہ کیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ پڑھنا چاہیے۔ اس تنہائی کو ضائع کرنا نقصان دہ ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ کتابیں کہاں سے آئیں؟ باہر سے کتابیں منگوانے کی مجھ میں استطاعت نہ تھی اخبار سی کلاس کیلئے شجر ممنوعہ تھا اور میں سی کلاس کا قیدی تھا۔

جیلر سے درخواست کی کہ مجھے جیل کی لائبریری سے حسبِ نفاستفادہ کرنے کا موقع دیا جائے

وہ ان گناہوں سے لانسری میں سو سے کچھ کم انگریزی اور انہی ہی اردو کتابیں تھیں۔ سو پچاس اردو کے مابقی بھی تھے لیکن وہ قبیح ادبی دنیا ہی تھا۔ اس کے برعکس بھی پرانے تھے۔ میں نے کوئی دو ماہ میں یہ سارا شاکم کر ڈالا جو شخص سو برس ہو اور شورش رہا ہو اس کے لئے اس قسم کی تہنائی ضرور اذیت ناک ہوتی ہے مگر کتابوں کے استعاروں نے احساس ہی نہ ہونے دیا۔ ٹیگ بنانا میری شقت تھی۔ لیکن کوئی یوہنا نہ پھوڑنا اور جن دو درجن ٹیگ بنا کر پڑا رہنا سو جتا اور لیٹ رہنا بے دے کے ماحول کی لطیف تھی بازو اور عقب کی چکیوں میں بدیعان قیدی رہ رہے تھے جو اس جہنم میں بھی بہو وہ گفتار اور مکروہ انعام سے نہ جو کہے تھے۔ خدا کو مادارے کے بجائے آپس میں بے دھڑک باتیں کرتے یا پھر کم عمر نوجوانوں کے ہمانی لہف لگانے کی سوچتے۔ اس احاطہ کی بیرونی دیوار کے باہر پہلو میں نیا خود منہ بٹھا جہاں نئے موت کے فدی پڑے تھے مبرے کمرے کی لیشٹ پر انہی قیدیوں کا بلاک صاحب سب اچھا کابلکل بچتا اور مختلف احاطوں کے نمبر دار گنتی کے صحیح ہونے کی صدا کر چکتے تو پھانسی کی کوٹھڑیوں سے قرآن مجید کی آئین، جب جی کا باٹھ اور ویدوں کے اشوک سنائی دیتے۔ قرآن پاک اور چپ جی کا ورد گو بدار ہوتا کیونکہ مسلمانوں اور سکھوں کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ ہندو کو کوئی ٹاواں ٹاواں ہی فید ہوتا سلیم سن سری اکال کانعرہ بند کر کے اپنی عبادت ختم کر دیتے۔ مسلمان نعرہ تو کوئی بلند نہ کرتے البتہ تلاوت کلام پاک اور نعت خرائی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رکھتے۔ سب اپنے خدا سے گڑ گڑا کر معافی مانگتے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتے تاریخ کب ہے؟ وکیل کون ہے؟ آپس میں دعائیں دینے نمرات مستعمل مخصوص ہوتے۔ اللہ معافیاں دے گا۔ واہو رو کر پارے گا۔ پر اتنا جھلی کریں گے۔ آپس میں پوچھتے پھوڑنے متلا

کس کو مارا تھا؟

جی بڑا خنزیر مارا ہے۔

”مدا تو نہیں مر گیا ہے۔“

”بے گناہ ہوں پولیس نے پھنسا دیا ہے۔“

”گازوں بھر کا ناک میں دم کر رکھا تھا کہ پان کے اک ہی وار سے ٹھنڈا ہو گیا۔“

”اجی میں کیا مازنا گتا میرے ذمے لگ گیا ہے۔“

”مقابلہ میں ڈھیر ہو گیا ہے۔“

”... میری بہن کو چھڑا تھا میں نے ڈھیر کر دیا۔“

”تقدیر نے گھیر لیا ہے ورنہ میں تو بد معاش کو جہنم رسید کر کے بھاگ نکلا تھا۔“

”پولیس کا کرشمہ ہے قاتلوں سے رشوت کھالی مجھ غریب کو پھنسا دیا ہے۔“

”کئی پشتوں سے لڑائی چلی آتی ہے..... نہ اس طرف سے کبھی کسی کو سزا ہوئی نہ اس

طرف سے کوئی پکڑا گیا اب قمنٹ کے پھرنے مجھے پھنسا دیا ہے۔“

”اجی کافر کو مارا ہے سالہا بذر بانی کرتا تھا۔“

”اپیل کی ہوئی ہے تاریخ نہیں نکلی وہی ہو گا جو خدا کو منظور ہے۔“

مسلمانوں کے مقابلہ میں سکھ قیدی زیادہ ہوتے شاذ ہی کوئی بے گناہ ہوتا۔ کئی دہریہ ہوجاتے

انہیں آنر و فنٹ تک خدا یاد نہ آتا بلکہ اس حال میں بھی خدا کی نفی پر چہچہاے۔ کسی رد عمل کے طور پر خدا

کو نہ مانتے خدا ہوتا تو ہم پھانسی کیوں لگتے؟ لیکن اس قسم کے قیدی سو میں سے ایک بادو ہونے۔۔۔

بہر حال پھانسی کی ان کو ٹھٹھریوں بن خدا۔ رسول۔ بھگوان۔ پر ماتما۔ داگور و کا ذکر و اذکار عن الب

رہنا۔۔۔ میں اپنے بلاک میں اکیلا تھا دن تو کسی نہ کسی طرح گزر جانا کبھی ٹپھکر کبھی ٹیگ بنا کر

کبھی کو ٹھٹھری میں ٹہل کر لیکن دوپہر کا سائیں سائیں کرتا ہوا وقت تھوڑا سا ادا اس ہوتا۔ رات چھتی ضرور

مگر کٹ جاتی۔ کو ٹھٹھریوں میں روشنی کا انتظام تھا نہیں گھپ اندھیرے میں سو رہتا پڑھنا لکھنا ناممکن

راتیں ضائع ہو رہی تھیں رات کا آغاز پچھانسی کے فیدلوں کی غمناک آوازوں سے ہوتا تھا ہر سہے کہ دل پر کیا گزرنی ہے قرآن مجید ایک زندگی بخش کتاب ہے لیکن جب موت کا مسافر پڑھ رہا ہو یا مرنے والے کے سر ہانے پڑھی جائے تو عسوسات کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے۔

### شاعرانہ واردات

میں طبعاً شاعر تھا جمالیات اور ادبیات سے مجھے ہمیشہ ہی ایک فطری انس رہا۔ میرے تاثرات اور احساسات اس مضامین آزرده ہو جاتے ہر رات سونے سے قبل مغموم ہو جاتا اور زندگی کے نشیب و فراز پر سوچا کرنا۔ جس صبح کسی کو پچھانسی لگنا ہو وہ رات بے حد مغموم ہوتی۔ اس رات تمام عبادتیں اور آوازیں خود بخود سونچ و محدود ہو جاتیں محسوس ہوتا جیسے آنے والی موت نے سب کے لب سی دیے اور وہ یار اتے گفت گو سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہر روز سونے سے پہلے یہ دو چار گھنٹے میرے لئے بڑی کشمکش کے ہوتے۔ کبھی قفس کی طرح جی اٹھتا کبھی محسوس ہوتا کہ میرے جذبات نزع کے عالم میں ہیں

رفنہ رفتہ من ان آوازوں ان صدوں اور ان چنچوں کا عادی ہو گیا۔ میرے لئے بہ سب چیزیں روزمرہ ہو گئیں۔ جمعدار کبھی دروازہ کھول دیتے تو میں چوری چھپے ان فیدلوں سے مل لیتا قصوی فیدلوں اور موت کے مجرموں سے مل ملاقات بھی ایک تجربہ ہی تھا۔

### مذبح

میرے عتب میں دس چکباں تھیں ان میں بڑے ہی خطرناک فیدی بند تھے۔ پانچ لکھ پانچ مسلمان۔ یہ دسوں جیل میں بھی دس نمبر سے سمجھے جاتے اور ان سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔ صرف سپرنٹنڈنٹ کے ظاہری رکھ رکھاؤ کا احترام کرتے۔ سپرنٹنڈنٹ بھی سمجھتا تھا کہ خوف یا احترام مصنوعی ہے۔ بہ قیدی

پوشے گھٹے بند رہتے آدھ گھنٹہ صبح اور آدھ گھنٹہ شام اپنی اپنی چلی میں تھلانی کے لئے کھلتے۔ دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی دروازہ برد و بھجار اور دو نمبر دار ہر وقت موجود رہتے لیکن ان سے پھر بھی خطرہ ہی محسوس کیا جاتا۔ یہ قتلوں اور ڈاکوئوں میں لمبی سزائیں مجترب رہے تھے۔ ان کی چھڑی میں خوف نغابی نہیں یہ نایت درجہ بہادر انسان تھے۔ ان لوگوں میں قول کا سیما پن اور ساتھیوں پر قربان ہو جانے کا جذبہ وافر تھا۔ انہیں زیادہ دن تک ایک جیل میں نہ رکھا جاتا۔ بلکہ صوبہ کی مختلف جیلوں میں پھرایا جاتا۔ ایک دن فیروز پور سے دو قیدی اور آگے ایک سکھ ایک مسلمان لیکن دونوں ظالم قسم کے قیدی تھے سکھ قیدی سے بھجار کی چھڑپ ہو گئی ایسے قیدیوں کی عادت ہوتی ہے کہ جس جیل میں جائیں وہاں اپنا نقش جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادھر جیل والے بھی اپنا دبدبہ بٹھانے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے آخر دونوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے اس سکھ کا نام غالباً موہن سنگھ تھا۔ موہن سنگھ نے بھجار کو گالیاں دیں بھجار نے ڈیٹی جیل سے کہا۔ ڈیٹی جیل بھی گالی کھا گیا، جیل تک معاملہ پہنچا اس نے موہن سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی آف موہن سنگھ اپنی کھڑی پر لیٹا رہا اٹھا نہیں سپرنٹنڈنٹ ڈنڈا بٹری کی سزا دے گیا موہن سنگھ نے ڈنڈا بٹری لگوانے سے انکار کر دیا۔ کرنل سونڈھی سخت طبیعت کا آدمی تھا اس نے بید لگانے کا حکم دے دیا۔ موہن سنگھ پہلے کئی دفعہ بید کھا چکا تھا اب کے بھی کھا گیا اور بڑی بہادری سے جب تک بید لگتے رہے ست سری اکال پکاتا رہا۔ کسی موڑ اور کسی مرحلہ میں بھی جھکا نہیں ڈنڈا رہا۔ ایک دن اس نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا اس کے کمرے کی صفائی ٹھیک نہیں ہوتی خاکروب بول و براز اٹھانے میں سستی کرتا ہے۔ سونڈھی یہ کہہ کر نکل گیا کہ خود صاف کر لیا کرو۔ موہن سنگھ بی گیا اگلے ہفتے۔ سپرنٹنڈنٹ آیا تو اس نے بول و براز کا بھرا ہوا پیالہ اسکے منہ پر دے مارا جس سے اس کا سارا سوٹ لٹھو گیا جیل میں سپرنٹنڈنٹ پر حملہ قتل سے بھی بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ چاروں طرف ہنگامہ مچ گیا۔ ان موقعوں پر جیل کے ملازم اور نمبر دار ایسے قیدی کو آدھ موا کر دیتے ہیں مگر سونڈھی نے سب کو روک دیا فوراً گھر چلا گیا تھوڑی

سی در میں کپڑے بدل کر ٹاما میں لگا کر الٹی ہتھکڑی لگوائی جس پر سوچے میں جیل بھر کا فضلہ جمع ہونا تھا وہاں لے چلنے کا حکم دیا۔ وہاں پہنچ کر عملہ سے کہا اسے جوڑے سے بکڑ کر شباب کے حوض میں مسلسل غوطے دو اس نے مزاحمت کی گالی گلوں کا لیکن یہاں میں اکسلا تھا غوطے کھانا رہا گالی بکتا رہا جب نڈھال ہو گیا تو واپس کر دیا۔ کئی ماہ بھڑوں پھسوں اور زخموں سے لاپچار رہا مگر اس کے باوجود اس نے نہ کبھی سپرنٹنڈنٹ کا احترام کیا نہ عملہ کے احکام کو مانا۔ وہ جیل والوں کے لئے پرالم بنا رہا اور جیل والے اپنی خداوندی کے باوجود اس سے خائف ہی رہے۔

جیل ایک ایسی جگہ ہے جس کے بارے میں بہت کم سوچا گیا بلکہ سوچا ہی نہیں گیا انگریزوں نے جیل خانے نہیں بوجھڑ خانے بناتے تھے باعصاں خانے اصلاح کے عنوان سے بہت کچھ کہا گیا لیکن اصلاح معقود ہی رہی۔ جیل خانوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں شریف عیبی عیبی مجرم اور مجرم عادی ہو جاتا ہے جیل خانے اصلاح کرتے عبرت دلانے یا سبق سکھانے کے لئے نہیں بلکہ عملاً جرائم کے تربیت خانے معلوم ہونے ہیں۔ جن لوگوں کو پولیس ادارہ گردی کے الزام میں پکڑتی ہے یا جو لوگ جرائم کی پاداش میں قید ہوتے ہیں وہ ایک تربیت یافتہ مجرم کی حیثیت سے رہا ہوتے ہیں پھر ان کے دل سے جیل کا خوف ہمیشہ کے لئے نکل جاتا ہے اور وہ مجرم کرنے ہی میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

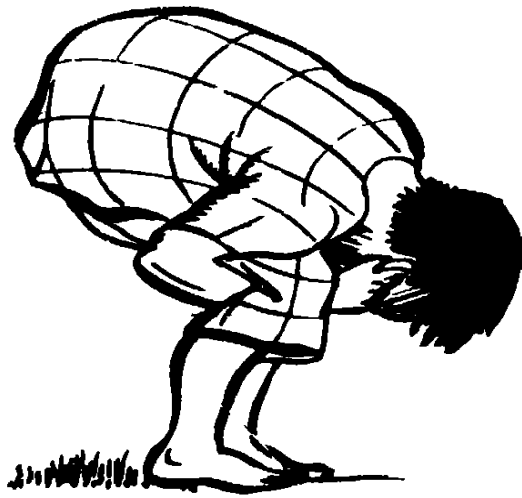
### جیل ہاؤس کوششیں

جیل اس وقت تک جیل ہے جب تک آدمی قید نہ ہو جب ایک دن جیل سے ہو آئے تو بھرید کا خوف باقی نہیں رہتا۔ پنجاب کی جیلوں میں جنہی اصلاحات بھی انگریزی عہد میں ہوتی رہیں ان کا کرڈلٹ زیادہ تر سکھوں کو جاتا ہے۔ سکھوں نے اخلاقی اور سیاسی دونوں طرح

جیل کو جیل نہیں رہنے دیا۔ حکام کا مزاج بدلا، بید کھاتے، چکیاں پیسیں، کوٹھو چلاتے، خراس میں جتے، ہتھکڑیاں لگوائیں، بیڑیاں پہنیں بھوک ہڑتالیں کیں، جانیں دیں، جو بن بڑا کہا مگر یہ منوا کے دم لبا کہ قیدی بھی انسان ہیں۔

سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال سے جیل خانے کے نظام کو ٹری حد تک بدل ڈالا۔ صوبائی حکومت نے ان کی بھوک ہڑتال سے متاثر ہو کر سرکاری وغیر سرکاری اراکان برمنٹنل ایک کمیٹی بنائی جس کا کام صوبہ بھر کی جیلوں کا معائنہ کر کے اصلاحی تجویزیں پیش کرنا تھا۔ چودہری افضل حق بھی پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی طرف سے اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انہوں نے جیل خانے کے حکام کی خداوندی کو ہلا دیا۔ بورڈسٹل جیل کا داروغہ خیر الدین اپنے وقت کا ظالم ترین جیل تھا۔ سارا جیل اُس سے تھر تھر کانپتا۔ کرنل چو پڑہ سپرنٹنڈنٹ ہونے کے باوجود اُس سے دبتا تھا۔ چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری، ڈی آئی جی، سی آئی ڈی حتیٰ کہ گورنر سے براہ راست مل لیتا تھا۔ بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھی اُسی کی نگرانی میں رہے۔ کرنل چو پڑہ مرہندو ہونے کی وجہ سے حکومت کو شاید بھروسہ نہ تھا اعلیٰ حکام خیر الدین سے فائدہ اٹھانے اور تمام اندرونی اطلاعات اُس سے حاصل کرتے تھے۔ خیر الدین کو چودہری افضل حق نے ناصا پریشان کیا وہ اس کی خدائی کے لئے گزر البرز شیکن تھے۔ خیر الدین نے رپورٹ کی کہ چودہری افضل حق جیل میں آکر نہ صرف عام قیدیوں کو اُکسانے بلکہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو بھی اگینتے ہیں۔ حکومت کے دل میں چودہری صاحب کے لئے پہلے سے کھوٹ تھا اس رپورٹ کی اڑنے کے اُس نے چودہری صاحب کو کمیٹی سے الگ کر دیا مگر اب تک وہ جیل خانہ میں بہت سی اصلاحات لوا چکے تھے۔ انتہائی منکر المزاج ہونے کے باوجود انہیں اپنے ن کا زمانے پر بڑا فخر تھا۔

22







جہاں بھی  
اگ وقت نظر  
خوشبو ہواست  
خوشبو ہواست

✓

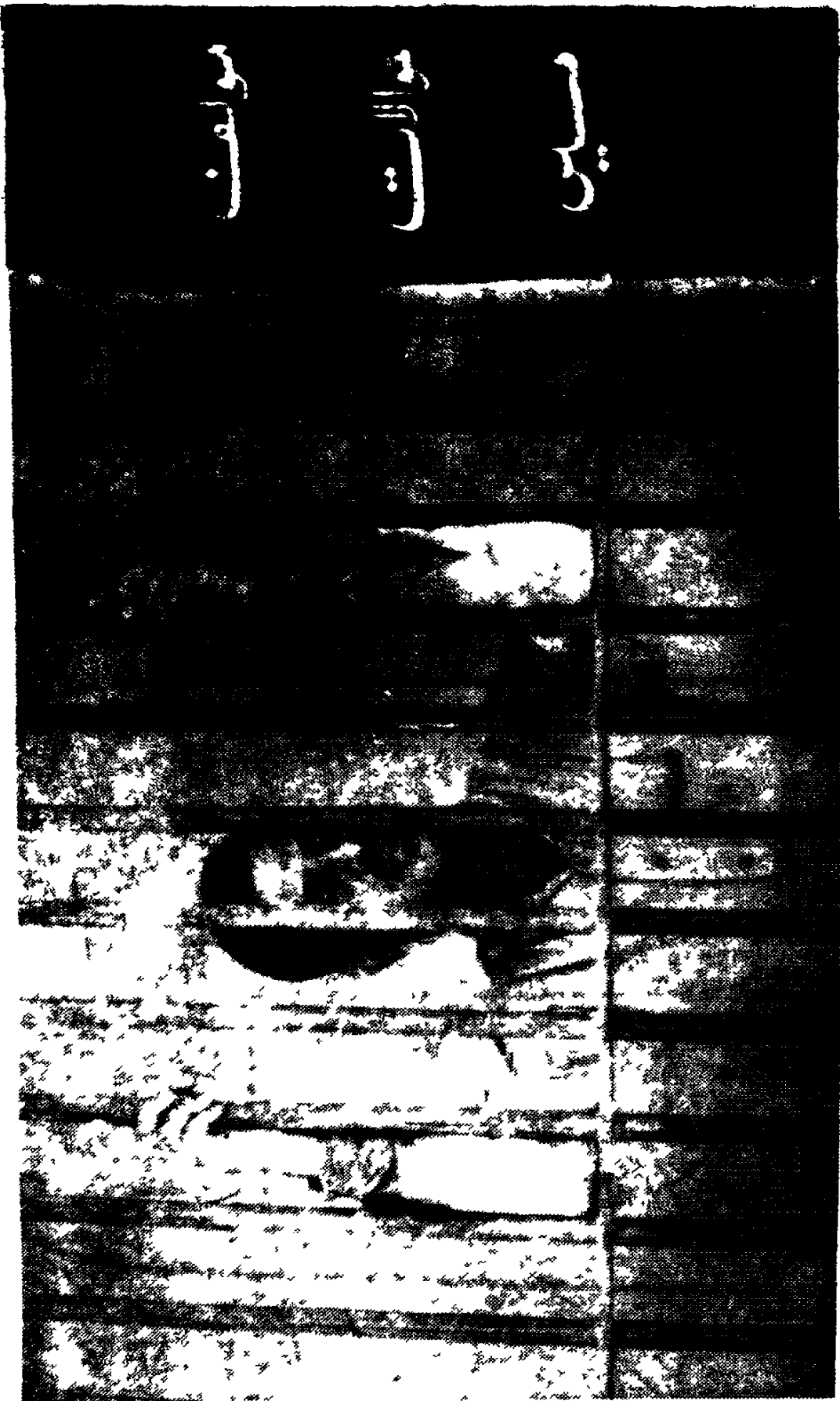


سیاست و نظام

پیش قدمی

صحیح کے اجازت

三 司 三







لاہور میں  
کی وہ بارگاہ  
بہار کی دفعہ  
مولانا سید محمد  
سید سید محمد  
سید محمد

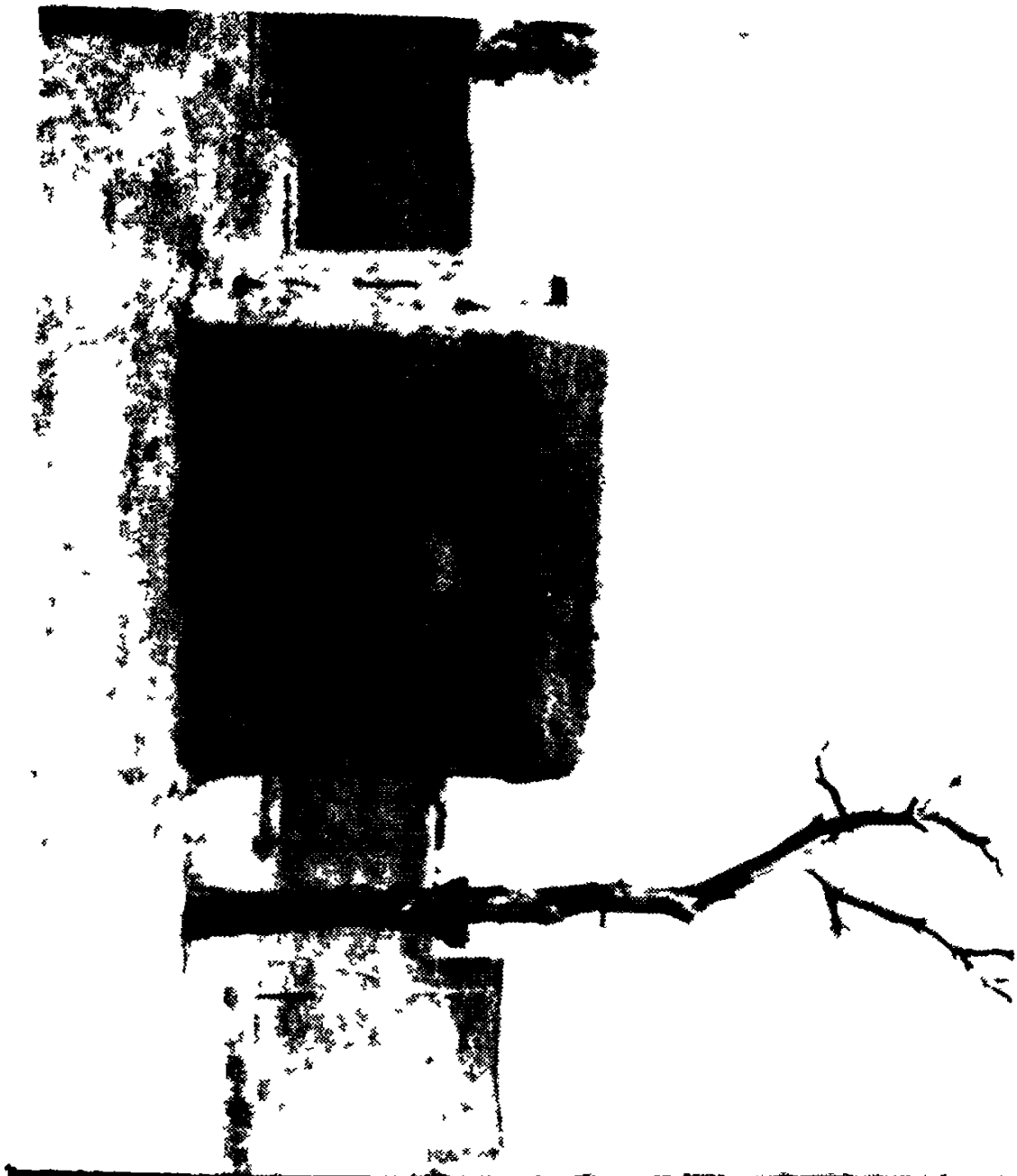


مسجد الامام

الرضا عليه السلام

في مدينة





خزمت اور دیوار  
دو لہو ابر طے گے  
اور سترک جیلے  
کے سب سے  
پہلے عمارت



## ڈاکٹر کچھو کو میری سزا یا بی کا دلی افسوس ہوا کچھ دنوں تکتے رہے کہ اتحاد ملتھی کیا کرتے ہیں! جب

اس میں بیٹہ چلا کہ ان لوگوں سے میری اپیل کے کاغذات بھی گم کر دیے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے مولانا ظفر علی خان سے شکایا کہا اب کن لوگوں کے فرسے میں ہیں۔ یہ لوگ تو آپ کو بھی بیچ کھائیں گے۔ مولانا ایسے ماہل سے متاثر ہونے والے انسان تھے اور ہر شخص انہیں متاثر کر سکتا تھا ان کا ایک ہی بیٹا تھا بدھ چاہنا مولانا لیکن دو جذبوں میں وہ انتہائی صادق تھے۔ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق دوسرا برطانوی سامراج سے دشمنی! بار لوگوں نے آخر عمر میں انہیں اس دوسرے جذبے سے عملاً سکدوش کر دیا مگر قلم کو مرنے دم تک استعمار کی حمایت سے آلودہ نہ کیا۔ یہ جذبہ آج تک ان کا رفیق رہا گو میرا سبھی راسخ جلد ہی ان سے مختلف ہو گیا لیکن وہ میرے اس جذبے کی ہمیشہ قدر کرتے رہے۔ فرماتے بہادر وہی ہو سکتا ہے جس میں حیل کاٹنے کی ہمت ہو۔ جو انگریزی حکومت سے نہیں لڑا وہ انقلابی نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر کچھو سے مرافعہ کے کاغذات کی گمشدگی کا سنا تو افسوس کرنے لگے اور وہ افسوس ہی کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ضلعی عدالت سے نقلیں لے کر ہائی کورٹ میں اپیل کر دی میں اس وقت تک چار ماہ کے لگ بھگ قید کاٹ چکا تھا جسٹس سکیپ نے اپیل سنی ڈاکٹر صاحب انگلستان میں ان کے ہم جماعت رہے تھے جسٹس سکیپ نے کہیں دیکھا تو ڈاکٹر صاحب سے کہا اس میں تو کوئی کنجائٹ نہیں۔ طرم سے پہلے ہی رعایت کی گئی ہے سزا کے مقابلے میں جرم سخت ہے ساری تقریریں تشدد ہی تشدد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تفریہ بنائی گئی ہے طرم عدم تشدد پر یقین رکھتا ہے اس نے وہ نہیں کہا جو رپورٹ میں ہے جسٹس سکیپ نہ مانے ڈاکٹر صاحب نے زور دیا کہ مرافعی نو عمر ہے انیس برس کے لگ بھگ آپ دیکھ لیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ جسٹس سکیپ نے مجھے ہائی کورٹ میں طلب کیا میری کم عمری سے متاثر ہوئے سوال کیا





ست قلعہ لاہور

اس کی دیواروں کے پیچھے سینکڑوں ماے گئے



اب تک میں اپنے ہی تخلص کا عکس نہا محض جوش، محض جذبہ، محض تورش یعنی مواد خام ———

قبذ نہائی نے مطالعہ کی عادت کو بچہ کر دیا اسکول سے نکل کر بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن حالات ناموافق تھے۔ حالات کی اس بے چاگی کا احساس میرے اندر ہمیشہ سلگتا رہا میں چھپنے سے زمیندار پڑھنے کا عادی تھا اس کے مطالعہ سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اُس زمانے کا زمیندار "گویا سیاسی مدرس تھا۔" اہل ان ہاتھ لگا تو کا یا ہی پٹ گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا رنگ مجھ پر تیز رونے لگا، کلام اقبال کا مطالعہ اس سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ میں اپنی ابتدائی عمر میں ایک ایسا مقرر بن گیا جو لوگوں کی طلب و خواہش کا مرکز ہو۔ مجھ میں نوجوان عمر کے باعث حالات کا رد عمل یہ تھا کہ میں انقلابی نوجوانوں کے ساتھ مل کر انقلابی بننا چاہتا تھا اور مجھے تشدد کی راہ اختیار کرنے سے بھی انکار نہ تھا لیکن ولولے اٹھتے اور ختم ہو جاتے، مسلمانوں میں اس قسم کے ساتھی نہ تھے۔ ہندوؤں سے اُس زمانے میں رسم و راہ نہ تھی ——— ملک میں جن راہنماؤں کا چرچا تھا گاندھی جی سرفہرست تھے بلکہ لیڈروں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ میں نے عدم تشدد کے فلسفہ پر اُن کی تحریریں پڑھیں تو مجھ پر خاصا اثر ہوا۔ اُن کے فلسفہ کا خلاصہ یہ تھا کہ عدم تشدد و مظلوموں کا موثر ہتھیار ہے۔ اس سے ایک نوجوان خراب نہیں ہوتا دوسرے



ہوتی؟ کوئی سوال کیا ہوتا؟ معلوم ہوتا تھا نیند اڑانے کا نسخہ استعمال ہو رہا ہے۔ ستم یا کرم کہہ لیجئے کہ لشکانے کے بعد دو بڑے بڑے بلب روشن کر دیئے آنا فانا پتنگوں کا لشکر جرات ٹوٹ پڑا آدھ آدھ گھٹے لوگوں کو اور طمانچوں کا لاد اچھوٹا رہا۔ رات بیت گئی فجر کی اذان بلند ہوئی۔ المدائبر کی صدائے الحاج نواب دین (سب الشیخ) کی خدائی کا بت نور ڈالا حاجی صاحب —————

الصلوٰۃ خسر من النوم ————— الصلوٰۃ خسر من النوم

(بند سے نماز بہتر ہے) ————— (مد سے نماز ہتر ہے)

یہ آواز پر آنکھیں ملنے ہوئے اٹھ بیٹھے وضو کیا مصلیٰ بچھا با اور نماز میں لگ گئے میری نیند جو بکر رات بھر معطل رہی تھی لہذا نماز بھی معطل ہو گئی میری نماز بھی گویا حاجی صاحب ہی ادا کر رہے تھے ————— دعا کر چکے تو مصلیٰ ہی سے فرمایا

”دیکھو ایک دن خدا کو بان دینی ہے۔ اللہ نے برطانیہ کو بادشاہی بخشی ہے“ و نعتوں سے سناو و سرل من تشاء اللہ جسے یا ہے عزت دیتا اور جسے چاہے ذلت دینا ہے۔ تم بادشاہوں کی مخالفت کر کے کیا لو گئے؟ کہ اڑوں کو مرنے دو۔ صاحب جو پوچھتا ہے سچ بتا دو۔ میں رسول اللہ کے مصلیٰ پر بیٹھا ہوں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ فجر کا وقت ہے۔ ذرہ اللہ تعالیٰ کی ثنا و تعریف مر رہا ہے تم مسلمان ہو اور مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ سچی بات پھانسی کے تختہ پر بھی کہہ دیتا ہے۔“

میں نے کہا

حاجی صاحب مجھے معلوم ہی نہیں کہ مجھے پکڑا کیوں ہے؟ اور آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ اتنے میں ایک دوسرا سب ان سپرڈ بنائے گئے رفا لیا ہی نام تھا) آبراجا تھکڑی کھول دی گئی۔ میں فوراً لیت گیا گھنٹہ بھر سونا تھا کہ حاجی صاحب اور سردار جی کے ٹھنڈوں نے جگا دیا۔ وقت کٹ گیا۔ بس شاخ کی طرح نازک تھا۔ نہ تھا کہا۔ اچانک مصلیٰ ہوئی دن چڑھے بخار ہو گیا۔ اگلی شام میرے بنی رہے قابو پا کر مجھے چھوڑ دیا گیا میں لوچیتا ہی

رہا کہ مراد فسور کیا ہے، مجھے کہوں بکڑا تھا؛ کوئی جواب نہ ملا میں قلعہ سے بیدھا دفتر زمیندار پہنچا مولانا ظفر علی خان  
 ودرے میں تھے مولانا اختر علی خان سے آپ بنتی کہی انہیں رنج ضرور ہوا۔ مرزا صاحب کو فون کیا میرزا  
 نے کہا ہم نے اسے پکڑا ہی نہیں بھوٹ بکنا ہے یہ ایک ساخانی لطفہ تھا۔ وہاں سے اٹھ کر ڈاکٹر عالم سے  
 ملا کہ حسب حال معلوم کر سں۔ وہ مرزا صاحب کے دوست تھے۔ مرزا صاحب یہاں بھی مگر گئے کہ نہ اسباب  
 ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ مہاں فرورالدين احمدان کے دفتر گئے وہ جی ہی بواب لاسے عرض سں سے  
 بکھپو اما سی جواب ملا۔ گو باجو میں آبا وہ مں نے کوئی خواب دیکھا تھا اور سرے سے یہ واقعہ ہی  
 نہیں ہوا۔

میں نے مرزا صاحب کا لول کھولنے کی ٹھانی مجھ سے وہ پہلے ہی نالال تھا مراد کوئی والی وارث  
 نہ تھا لولس نے مرے خلاف وہی سر با استعمال کیا جو اس ملک کے ناوار لیکن مخلص ہارکتوں بر استعمال  
 ہونا رہا۔ بجز سدرت کے قلعہ باحوالات میں لے گئے بٹو ادبا میروادیا۔ ممکن ہے مرزا انجام بھی وہی ہونا جو  
 اوم برکات بادوسہ سے لوتوالوں کا ہو جکا تھا میں حوش قسمت مھاچھٹ گیا اور سچ رہا۔

خاندان متمول ہونا تو نسا بد یہ سلوک نہ ہوتا۔ والد خوفزدہ  
 ہو کر بے لعلی ہو چکے تھے لیکن ان کے پہلو میں بہر حال باپ کا دل تھا کس سے کہتے اور کیا کہتے؛ ایک  
 محنت کنش انسان لہو کے گھونٹ ہی پی سکتا ہے اور وہی ہے مجھے۔ میں نے وزارت کے دروازے پر بھی دھک  
 دی جہاں پہنچا کہ کوئی سودا کرتا، کارکن یا کمیہ بنانے کے خواہاں ہوتے۔ فریاد پر کان نہ  
 دھرتے کوئی خداؤنی سے اسفسار کرتا اور مرزا صاحب کے جواب سے مطمئن ہو جاتا۔ افلاس نے  
 مجھے جھوٹا اور طاقت نے میرزا صاحب کو تباہ بنا دیا تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میں انتقام  
 لینے پر اتر آبا۔



## رشوت یا پیشکش

میرا انعام بھی قہرور وین برجان دور ویش کے مصداق تھا۔ ہر تقریر میں سرزاد صاحب میری گرم گفتاری کے نسانہ خاص تھے۔ دل تھا کہ حالات کی ان سر و مہر لوں کے ماہود جواں ہو رہا تھا۔ مجھ میں کوئی خچہ نہ تھا۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے ایک دوست کی گہزرت میں شادی بھی میں بھی برائتوں میں شامل تھا۔ مقامی احباب نے جلسہ کر ڈالا اور مجبور کیا کہ مسد فلسطین پر تقریر کر دوں ان دنوں یہی مسئلہ زوروں پر تھا میں نے اس پر ایک دعوایں دھار تقریر کی جو رات بارہ بجے تک جاری رہی تھوڑے دنوں بعد شہید گنج کا فیصلہ ہو گیا سکندر حیات نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر سب شہید گنج میں مداخلت کی گئی تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے بہت سے مندر لوٹانے پڑیں گے ہمیں اڑنے بھڑنے کے بجائے بہ قضیب صلح صفائی سے طے کرنا چاہیے کانگریس ہائی کمانڈ نے بھی سکندر کے اس رویاں کا خیر مقدم کیا۔ یہی بات مجلس احرار کے راہنما بہت پہلے کہہ چکے تھے لیکن اس وقت ان کی بات پر قہر و غضب ٹوٹ پڑا تھا۔ میں حالات کے اس افسوسناک پس منظر سے لفظ بہ لفظ واقف ہوتا جا رہا تھا۔ مجلس احرار کے زعماء سے میرا کوئی رابطہ یا واسطہ نہ تھا بلکہ اختلاف ہی تھا۔ مولوی منظر علی اظہر نے دیکھا کہ شہید گنج ان کا بیچا نہیں چھوڑتی تو علاج بالمثل کی ٹھانی سکندر وزارت کو زچ کیا اور اتحاد ملت کے زعماء کو بھی وہ نہ صرف خود فید ہو گئے بلکہ کسی سوزنا کاروں کو بھی قید کر لیا ہر روز احرار کا ایک جتھہ شہید گنج کی طرف مارچ کرتا ہوا دہلی دروازہ کے باہر بیٹھا جانا۔ اسی اثناء میں چودہری افضل صاحب سے میری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے بہت سے حقائق بے نقاب کئے کئی تحریروں دکھائیں میں کانپ اٹھا۔ میں نے لاہور کے ایک جلسہ عام میں اعلان کیا کہ سکندر حیات نے شہید گنج کی بازیابی کا وعدہ ایفا نہ کیا تو میں عید قربان کے روز ان کو ٹھی پر رضا کاروں کا احتجاجی جتھالے کر جاؤں گا۔ اس اعلان سے کھلبلی سی چڑ گئی اب معلوم ہی

دوسرا نھا کبھی مولانا ظفر علی خان آرہے اور سمجھا رہے ہیں کبھی ڈاکٹر عالم آبرا جتے ہیں میاں فیروز الدین احمد مجھے ایک بار پھر میرزا معراج دین کے پاس لے گئے۔ مسٹر بینٹ ڈی سی آئی جی سی آئی ڈی کے روبرو پیش کیا، کئی فریب دیتے گئے اسٹنٹ سب انٹلز بھرنی کر لینے کی پیشکش کی گئی۔

### شکار اور شکاری

اس تیسرے عبدالقادر نواب محمد ساہنواز خان ممدوت کی طرف سے متفضل و طبقہ دلوانے اور ایک مکان خرید کر دینے کی پیشکش لائے۔ خود نواب نے انہوں نے کھانے بڑبلا بارام کرنا جانا، بہ معمول سے مل کر کرنے کی کوشش کی۔ عرض حاردر سے بلہ بولا گیا لیکن میں حوفیساہ کر چکا تھا اس پر خط نسخ کھینچنا ناممکن تھا۔ چودہری افضل حق برابر مجھے ان چالوں سے مطلع کر رہے تھے عید میں دو بائین روزہ گئے، پھلے، میں نے اعلان کیا کہ مازمہ تباہی مسجد میں بڑبھوں گا اور وہاں سے جھٹالے کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جاؤں گا چودہری صاحب مجھے علامہ انبال کی کوٹھی برے گئے ان سے کہا

”یہ ہے شورش کاشمیری“

شورش کاشمیری! حضرت علامہ کے تہ سے رہتا ساہم تھا فرمایا

”سکندر کی کوٹھی پر جھٹالے کر جا رہے ہو“

”جی ہاں! چودہری صاحب لے جواب دیا۔“

”جو انوں میں جرأت اور حرارت ہونی چاہیے“

میں اُنکے سامنے مورتی کی طرح بے حس کھڑا ہاکی عظمت شخصیت کا رعب رومیں رہیں بڑھاری تھا۔ فرمایا

”گھبراؤ نہیں تم ایک انسان کے سامنے کھڑے ہو“

ساتم بہت اچھی تقریر کرتے ہو۔ اللہم زدود۔

میرے لئے یہ آزمائش کے دن تھے خوف بھی دلایا بارہا تھا اور لاپرواہی بھی دیتے جا رہے تھے فریب کا نانا بنانے والے عاقل نہیں تھے۔ جب کوئی ساحر یا سحر کا مہاب نہ سوا، تو امرتسر کا ایک مسافعی جو اس قسم کے کاموں میں اوروں کا بھائی بنانے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اس کی تمہارے سمناے پے اور وہاں ایک ناحتہ عورت سے بٹو ادے وہ تور محادے کہ اس نے مجھے چھیڑا ہے اسنے میں پولیس آجے اور گر مار لے۔ اس غرض سے اس نے ایک تمہ کو تیار کیا۔ صبح عبد مٹھی — اس اس بر عمل ہونا تھا۔ اس نے ہنبرامبور کیا کہ اس کے ساتھ چلوں لیکن میں کسی طرح نہ مانا مجھے ابک دوست کی معرفت اس سازس کا علم ہو چکا تھا رات تیسرو کے مکان پر کاٹی۔ علی الصبان سیدھا شاہی مسجد پہنچا ماز بڑھی، چودسری افضل حق کی سدارت میں جلسہ شروع ہوا مجھے دیکھتے ہی تماشا ٹانی عام کے چہرے تر رونی ہو گئے میں نے مختصر سی تفریح کی اور سورس کاروں کا جھفر لے کر ایک بھاری محوم کے ساتھ سکن رحمت خان کی کوٹھی روانہ ہو گیا لوگ عید منا رہے تھے میں جیل جا رہا تھا راستہ میں ہجوم ٹر عشا ہی گیا تمام راستہ یونی سنٹ وزارت مردہ باد اور سکندر حیات ہاے ہائے کے نعرے بلند ہوتے رہے ہمارا جلسہ راستوں کے پیچ و خم سے ہوتا ہوا لوہاری دروازہ کے چوک میں آ گیا وہاں ہجوم ڈگنا ہو گیا ہم نارکھی بازار سے ہوتے ہواتے جب بینک اسکو اتر نک پتے نو پولیس کی گاردوں نے روک لیا۔ والی ایم سی اے ہال اور بینک اسکو اتر کے درمیان کی سڑک پر پولیس نے حلقہ ماندھ رکھا تھا۔ مسلح کاروں، آہنی لاہاں، گھڑسوار اور اعلیٰ افسر آنا نا پنچ گئے مرزا محمد باقر سٹی کو تو ال نے آگے بڑھ کر سوال کیا

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“  
 ”سروا سکندر رحمت کی کوٹھی پر“

کیوں؟





کے بائیں بازو پر جوالات کا احاطہ تھا۔ جہاں جھولدریاں لگا کر مولانا منظر علی اعظم اور ان کے ساتھی رضا کاروں کو رکھا گیا تھا ان رضا کاروں میں ہر روز جارج کا اضافہ ہو رہا تھا ہمارا بہتہ جلاتو انہوں نے جیل خانے کی ساری فضا کمرہوں سے گونجا دیا ہم نے بھی گنتی کھٹے ہی نعرے بلند کرنا شروع کئے۔ سہلنے پہلے مولانا کو بلایا پھر مجھے آگے کھٹا کرنے پر راضی ہو گئے اور کوئی دو گھنٹے بعد ہم اکٹھے ہو گئے مولانا منظر علی اعظم اے کلاس تڑک کر کے سی کلاس میں رو رہے تھے۔ اٹھ امرتسری ابڈیٹ زنا بدار" جو اس وقت اتحاد ملک کے سزنی سکریٹری تھے اور احمد رضا کاروں نے انہیں اغوا کر کے ایک جتنے کے ساتھ بھجوا دیا تھا وہ ان سے الگ بی کلاس میں تھے، مگر سے دور ہی ابہیں راضی کیا اور سی کلاس میں لے آئے۔

ہمہ ماراں دوزخ ہمہ باراں بہشت

ہمارے خلاف دفعہ ہمہ کی خلاف ورزی کا مقدمہ چلا باگیا۔ کسی دن تک، کچھ ہی میں رونق رہی اسلحا۔ سے ماں کما کہ ہم سردار سکندر حیات وزیر اعظم کی کوٹھی پر ملہ بولنے کے لئے حارسے تھے میں نے سردار کی اور کہا کہ وہ بیلک کے منتخب کردہ وزیر اعظم ہیں ہم ابہیں پنا مانڈہ سمجھو عید کی مبارکباد دینے جا رہے تھے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ سردار صاحب نے مجھے بلا با تھا مجسٹریٹ نے فصلہ میں لکھا کہ ملزم اور وزیر اعظم میں حیثیت و مرتبہ کا بڑا فرق ہے لہذا میں مسلم نہیں کرنا کہ انہوں نے ملزم کو بلایا مو۔

### چار ماہ قید

میرے ساتھی رضا کاروں کو دو دو ماہ قید سخت اور مجھے چار ماہ قید سخت کا حکم سنایا گیا ہم نے سزا سن کر رنجوں سے کچھ ہی کا احاطہ گونجا دیا اتنا سنوڑ جا کہ کانوں ٹھی آواز سانی نہ دتی تھی۔ سردار بھاگ سنگھ بی ڈی ایس پی عرا ماہو انکلا اندر بڑوں کا پسیمی و فادار تھا ٹراختل بار رضا کاروں نے مذاق اڑایا حنف سا

کہا، اتنے میں مسٹرائف سی بورن ڈپٹی کمشنر بھی اپنے کمرے سے باہر آگئے محلّ سنگھ نے مجھے نشانہ بنا کر  
اسی ساری خرابی کا مدوار فرار دیا بورن میرے گرد ہو گیا۔

۔۔۔ تم کہا کرتا ہے

میں نے بھی ت کوٹ ہی کر دیا

’ہم نعرے مارتا ہے‘

بورن ”ادیو“

میں ادوہم

بورن کے چہرے پر غصّہ کی علامتیں شد بد ہو گئیں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ نہ سکا، اتنے میں ایک  
رسا کرنے بیب وغرب بولیاں بول کر اُسے ادر بھی خفا کر دیا وہ غصّے میں واپس چلا گیا کرنل سونڈھی  
کو لگا کہ اس حرکت پر انہیں سزا دی جائے۔ سونڈھی نے مجھے طلب کیا خط پڑھ کر سنایا میں نے  
اس سے کہا۔

یہ صحیح ہے کہ ہم نے انگریزی حکومت برباد اور برطانوی راج مردہ باد کے نعرے لگائے ہیں  
لیکن جیل میں نہیں جیل سے باہر، بورن ہمیں خود سزا دے اُس نے آپ کو کون چننا ہے؟ اس  
لئے کہ آپ مندوستانی ہیں۔ سونڈھی افسرانہ تمکنت کے ساتھ مسکرایا اور لولا۔۔۔ اچھا  
اندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

### قید یا میلہ

سیاخی تحریکوں میں عام ساتھیوں کی روزمرہ آمدورفت سے قید خانہ کی فضا ہی بدل جاتی ہے  
جیل سوشل سائنظر آتا ہے۔ کئی دفعہ ایک تفریحی ٹرین کا لطف آنے لگتا اور قید خانہ عیش خانہ ہو

مانا نہ پندرہ دن تک ایک میڈیسا لگایا مولانا مظہر علی اظہر سارا دن پھولداری میں پڑے رہتے وہ قرآن مجید حفظ کر رہے تھے اظہر ام قسری صوفی عنایت محمد سپروری صاحبی احسان احمد اور میں ایک ہی ٹینٹ میں تھے دن کا بیشتر حصہ مجلس آرائی میں کٹ جاتا۔

آخر یہ مجلس بھی اُجڑنے لگی اور اُجڑتی گئی۔ ایک شام چیف وارڈر بیڑیوں کا ایک انبار لیکر آگیا کہ ڈبرہ سورشکار میا نوالی چالان کئے جا رہے ہیں۔ لہذا بیڑیاں لگوانی جائیں۔

پوچھا چالان کب ہے؟

جواب ملا۔ — کل

سالار نے کہا تو کل بیڑیاں لگوانی جائیں گی، رات ہم بے آرامی سے نہیں کاشا چاہتے اسٹجیلر نے امر کیا جھگڑا سو گیا جب آتا تو تکرار ہوتی، بات نہ بنی آخر مولانا مظہر علی اظہر پھولداری سے نکلے جیلر سے مخاطب ہو کر پوچھا!

”بخشتی صاحب! چالان کب ہے؟“

اس کے منہ سے نکل گیا — آج

مولانا جاننے تھے کہ اس نے غلط کہا ہے غصہ میں کہا

”بخشتی صاحب! اگر چالان آج ہے تو کسی کو بیڑیاں لگوانے میں غدر نہیں اور اگر کل ہے اور آپ

آج بیڑیاں لگوارہے ہیں تو پھر آپ انہیں کبھی لے جانہ سکیں گے۔ یہاں گولی چلے گی لاشوں کا ڈھیر لگے گا اور یاد رکھیں ان رنسا کاروں پر اُس وقت گولی چلے گی جب مظہر علی کا سینہ گولی کھا چکا ہوگا۔

جیلر یہ کلمات سننے ہی بھاگ گیا۔ بیڑیاں لگانے والے منبر وار بھی چیف وارڈر کے ساتھ کھٹک

گئے۔ اگلے روز کوئی ڈبرہ سورشکار مولانا مظہر علی اظہر سمیت میا نوالی جیل بھجوا دیئے گئے۔ مظہر علی کو



جی مام رضا کاروں کے ساتھ بیڑیاں اور بھکڑیاں پہنا کر روانہ کیا گیا۔۔۔۔۔ اس امر کا مطلق خیال نہ رکھا گیا کہ وہ ایم ابل اے میں ایڈوکیٹ ہیں اور کوئی دوسری حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

### گجرات جیل میں

میری اس مختصر فہرہ کو حکومت نے کافی نہ سمجھا کیونکہ اہل کے پہلے جھٹکے جی میں رہائی کا امکان تھا۔ چنانچہ فلسطین کے مسئلہ پر گجرات میں جو آفر سر کی تھی وہ نکل گئی اور اس کی بنا پر برے خلاف ۱۲ مئی ۱۹۴۷ء کا عدومہ دائر کر دیا گیا۔ پولیس آئی اور لاہور سے گجرات لے گئی۔ وہاں رات شروع ہونے سے کچھ ہی بعد بیچا سچ اٹھا تو سب جیل کے انچارج اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رام لال کپور نے باو کیا۔ بڑے ہتک سے جیل وہ ہارٹل جیل میں رہا اور تب سے واقف تھا جیل خانوں کے انکیٹر جنرل کرنل پوری کا چہیتا تھا۔ انہیں باو کہتا عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی انہیں ملازمت ہی میں جواں مرگ ہو گیا سب جیلوں میں مستقل سپرنٹنڈنٹ نہیں ہوتے عموماً ایڈیٹینل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایکٹنگ سپرنٹنڈنٹ کے فرائض سرانجام دیتے ہیں لالہ لکھی واس سے ڈی ایم گجرات بہاں سپرنٹنڈنٹ تھے مقدمہ انہی کی عدالت میں تھا پیش ہوا تو وہ کچھ روکھے ہیں سے پیش آئے ہیں واپس آ گیا۔ کپور سے ذکر کیا کہ ذرا ان کے کان کھول دیں۔

### برطانوی خورزند

انگریزوں نے اپنی اعلیٰ ملازمتوں میں اس قسم کے ہندوستانی اور پاکستانی پیدا کئے تھے جو اس حسرت میں گھلے جاتے تھے کہ کاش وہ کسی انگریز کا جگر گوشہ ہوتے؛ ان کے لاشعور میں انگریزوں کا پاپ کا بیٹا نہ ہونے کی غلط تھی۔ اپنے ہی ملکوں کے ساتھ ان کا سلوک انتہائی نفرت انگیز تھا۔ وہ کسی فریب کی عزت نہیں کرتے تھے۔ وہ غلام آقا تھے۔ انگریزوں کے غلام، انہوں کے آقا، برطانوی عہد

- سبک سرونٹ کا لفظ سب سے زاوہ بے معنی رہا ہے مریبلک سرونٹ (الہامشا اللہ) جو مرکزی یا  
 سن سروس کا رکن بنا پتے آپ کو مدد سمجھتا اور سائلوں کو بندگان پر تقصیر،  
 سس ایک ایسا باسی رکن بن چکا تھا جو اپنی ذات پر اعمسا اور کھتا ہو اور اپنی عزت نفس  
 کی خاطر کرتے

مہری و اسگ کا وہی نتیجہ نکلا جس کی توقع تھی۔ لکھی داس سن دیکھنے آیا تو دوری سے انگریزی  
 میں مزاں برسی کی زور سے مصافحہ کیا بار بار کوئی تکلیف تو نہیں ہے پوچھا رہا کپورے کہا ان  
 کا نبال کھینے۔

### پراسرار حوالاتی

بی کلاس میں ایک قیدی تھا اس کے ساتھ کی چکی میں مجھے جگہ دی گئی یہ قیدی ایک معمر سکھ  
 تھا اور عنن کے مقدمہ میں ماخوذ ————— تیسرے یا پچھلے روز سرے ساتھ کی کوٹھڑی میں ایک ایسا  
 حوالاتی رکھا گیا جو اول نوعام جو الامیوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا دوسرے اسکی حرکتوں سے ظاہر ہوتا  
 تھا کہ جبے وہ پیری نگرانی کر رہا ہو یا پھر مجھ پر حملہ کرنے کی فکر میں ہے ————— میں نے کپور  
 سے ذکر کیا اس نے کہا ایک وار ڈر لگا دیتا ہوں لیکن اس کو بہاں سے بٹانہیں سکتا۔ یہ ایک پراسرار  
 جواب تھا میں نے اصیلت معلوم کرنے پر اصرار کیا تو کپور نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ یہ سی آئی ڈی  
 کافر سا وہ معلوم ہوتا ہے۔ بنظاہر یہ ایک مقدمہ میں ماخوذ ہے لیکن تمہارے قریب رکھنے کی جس بدای  
 کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے اس سے ہمارا شبہ قوی ہوتا ہے۔ ان معاملات میں ہم عاجز ہیں۔ میں نے  
 سعی محمد بنظاہر وہ بھی نام بتانا تھا کو ڈھب پر لا کر اندازہ کیا کہ میرا معراج دین کو جانتا ہے میرا صاحب  
 گجرات ہی کے رہنے والے تھے اور دو روز پہلے بگات سے ہو گئے تھے یہ جوابات میں نے بالواسطہ ماہل

کچھ سی محم کچھ زیادہ پڑھا لکھا بلکہ پڑھا لکھا ہی نہ تھا۔ ایک لمبا تازنگا نمبر دا جو ہمارے بلاک کا پیردار  
 تھا۔ اُس کے مندرجہ میں اپنی نیند کے آخری دن گزار رہا تھا سعی محمد کا تم نوالہ دسم پیارا تھا وہ نوٹس  
 میں ٹھہر کر تے شام کو لکھی داس معاہدہ کے لئے آیا تو میں نے شکایت کی کہ اس شخص نے  
 مجھے سکوک معلوم ہونا سے اگر مجھ پر کوئی حملہ ہو گیا تو ذمہ دار کون ہوگا؟  
 سپرنٹنڈنٹ نے کپور سے پوچھا کباج ہے؟ کپور نے سپرنٹنڈنٹ کو سارا سنا لیا اور  
 وہ سمجھ گیا کہنے لگا سعی محمد کو دوسری جگہ بھیج دو کپور بھیجا لیکن وہ حکم دے جا چکا تھا کہ سعی محمد کو  
 فوراً ہی دوسری جگہ بھیج دیا گیا مگر دو گھنٹہ بعد ہی معاہدہ صاف ہو گیا۔

### گرم دودھ

میں سردار کے پاس سر نہیواڑے اخبار پڑھ رہا تھا صرف صافہ بندھ رکھا تھا۔ خاں محمد  
 (قیدی نمبر دار) گرم دودھ کی اہلیتی ہوتی پتیلی لے کر عقب سے آیا اور میرے فریب پہنچ کر اس دور  
 سے ٹھوکر کھائی کہ اہلیتا ہوا وہیں سیر دودھ مسرتی پیٹھ پر گر گیا۔ کوٹھوں کا حصہ چوڑوں تک اس بُری طرت  
 مجلس گیا کہ میں تڑپنے لگا بھاگ بھاگ ہسپتال پہنچا ڈسپنسر موجود تھا اُس نے فوراً پٹی کر دی، ڈاکٹر کو بلا  
 بھیجا اس کے کانوں پر جوں مک نہ رنگی تھوڑی دیر پور مجھے غش آگیا آنکھ کھلی تو ڈسپنسر سر ہانے کھڑا  
 تھا ڈاکٹر ابھی تک نہ آیا تھا میں نے احتجاج کہا بے سود نوٹسے شب کے لگ جگ ڈسپنسر بھی جلا  
 گیا دودھ میرا پیتاب رک گیا ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور ٹرپا ہی رہا ڈاکٹر بھر بھی نہ آیا ڈسپنسر  
 آیا اور۔۔۔ بڑکی نالیوں سے پیشاب نکالنے لگا کھلیت بڑھنی گئی۔ اتنے میں رام لال کپور آگیا۔

میں نے اس بوچھڑی کے خلاف شکایت کی۔ اُس نے ڈسپنسر سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب  
 کہاں میں؟ وہ کہوں نہیں آنے؟ ڈسپنسر نے کہا کہ میں انہیں خود جا کر کہہ چکا ہوں مرضی کے مالک

ہیں مجھے لوٹا دیا ہے کہ خود دیکھ لو۔۔۔۔۔ معاً ڈاکٹر عالم کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جو منشی احمد دین نے سنایا تھا۔

### آتشک کا ٹیکہ

۱۹۳۱ء کی نکلین سٹیج گرہ کے زمانے میں ڈاکٹر عالم گجرات جیل میں بیمار ہو گئے تو انہیں بغرض علاج گجرات سے لاہور میو ہسپتال بھیج دیا گیا۔ یہاں غالباً عبداللہ نام کا ایک ڈاکٹر انہیں آتشک کا ٹیکہ لگانے پر متبار ہو گیا۔ یہی کام اُس سے پہلے ایک ہندو ڈاکٹر روشن لال کے سپرد کیا جا رہا تھا اُس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ ڈاکٹر عالم کو بھی آگاہ کر دیا، ڈاکٹر صاحب چونکہ ہونگے، عبداللہ ٹیکہ لگانے آیا تو ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف سرخ چھین لی بلکہ ہنٹرنکال کر سٹریٹ مارٹ شروع کیا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر کا جواب سنا تو مجھے اُس کے سنگدلانہ رویے پر سخت طعین آیا۔ میں نے کپور سے کہا میں سمجھ رہا ہوں کہ مجھے مار دینے کی سازش کی گئی ہے۔ میں اپنے اعزہ کو مطلع کر چکا ہوں مجھے کسی بالاسازش کے تحت قتل کیا گیا یا اس طرح ختم کر دینے کا رویہ جاری رہا تو فائل آپ ہوں گے ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ یہ کہہ کر میں نے زور زور سے نعرے لگانا شروع کئے سرکار مردہ باد ڈاکٹر مردہ باد معراج دین مردہ باد وزارت مردہ باد بہ مردہ باد اور وہ مردہ باد۔ صرف انقلاب زندہ باد۔

### شرمنگالی

کپور گھبرا گیا کہنے لگا گھبراؤ نہیں میں خود جا کر ڈاکٹر کو بلانا ہوں ڈاکٹر آ گیا اسے دیکھتے ہی میرا پارہ تیز ہو گیا ڈاکٹر صاحب میں کل دن سے مر رہا ہوں اس وقت رات کے دو بجے ہیں آپ کو

انہی دفعہ بلا گیا مگر آپ نے نوجہ ہی نہیں کی آخر اس سنگدلی کا آب کھے گا۔ کوئی حراز ہے، ڈاکٹر نے سنی اُن سنی کر دی مجھے غصہ آ گیا میں نے زخموں سے چورہینے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کو اس زور سے لالت رسیہ کی کہ وہ چونڑوں کے بل گر پڑا میں اُس وقت مرنے مارنے یزلا بٹھا تھا میری آنکھوں میں آن اور ہاتھ ڈاکٹر نے پہلے نو ذرا منگت دکھائی پھر نرم پڑ گیا منت سماجت کرنے لگا میں معررہ ہا کہ اب اس سے علاج نہیں کراؤں گا مجھے مار دے گا میرا معراج دین کا اجنت ہے کہ پورے جب ۔ کبھا کہ میری تکلیف بڑھتی جا۔ سی ہے اور ہشاب اعلیٰ تک نہیں آ رہا تو وہ صور سماں کو خواب پا کر سول سرجن کے ہاں گیا وہ لالہ تنہا کپور کے ساتھ چلا آیا۔ اُس نے ڈاکٹر کو بُرا بھلا کہا۔۔۔۔۔

حتیٰ کہ ہسپتالوں کے انسپکٹر جنرل کو رپورٹ کر دی۔ ڈاکٹر کو اس پر وارننگ ہوئی یا شاید کوئی اور سزا دی گئی اس ذاب تشریف نے اخباروں میں اس مطلب کے مراسلات چھپوانے نہ درع کر دئے کہ ضلع گجرات کا ہندو سول سرجن مسلمان عملہ کے ساتھ متعصبانہ سلوک کر رہا ہے جس سے عملہ میں اضطراب پھیلا ہوا ہے اور ملازمین اپنی نوکری خطرے میں سمجھتے ہیں۔

### پاگل قیدی

خیر یہ ایک ”جملہ معترضہ“ تھا سول سرجن ایک آدھ گھنٹے کی کشمکش کے بعد مٹیاب لانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اُس نے مبری بہت کے سوجھ حصہ پر پٹی کی جس سے مجھے نیند آگئی۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ دھڑام سے میرے سر پر ایک سٹول آ رہا اور ماتھا لہو لہان ہو گیا۔۔۔۔۔ تہ کارنامہ“ ایک پاگل قیدی کا بان کیا گیا جو میرے ساتھ کی بریک میں بند تھا۔ مبرے بیلاتے پہل میں ٹیسیاں بیجنے لگیں اسی وقت داروغہ آ گیا اور اس پاگل کو جو پاگل نہیں تھا وہاں سے نکال کر چکی بند کر دیا گیا۔ لازماً ڈاکٹر صاحب کی شرارت تھی۔۔۔۔۔ معلوم ہوا کہ سعی محمد خاں مجھے الگ ہوتے

نہ نہانتا رہا ہو گیا خان محمد کا تادلہ نہ دیا گیا اور ہانگل کا پتہ نہیں چلا کہ پھر کہاں ہے؟ مقدمہ کوئی حد پہنچنے جیتا رہا میں نے صفائی میں کوئی گواہ پیش نہ کیا۔ اس دوران میں صفائی کا کوئی گواہ ڈھونڈنا بہت تھ۔ گجرات سوہنی کا شہر ہے جہاں مٹی کے گھرے بھی عشاق سے دعا کرتے ہیں۔ جتنے دنوں میں رہا کسی سے ملانا، ان کی اب دفعہ شاہد کوئی اصرار دوست آیا تھا مگر میں اسے بالکل ہی نہیں جاسا تھا غالباً جو بہری اصل سن نے لاہور سے اسے لکھا تھا۔ پرانے سانھی غائب ہو چکے تھے جس نو جوان کی وہ سے گجرات میں اتحاد ملت کا چہرہ تھا وہ اب ہی جھنگ میں ڈپٹی کمشنر کے ہاں کلرک ہو گیا۔۔۔۔۔ البتہ حیرت شاہ وارثی کسی کام کے لئے گجرات آئے تو مجھے بھی ملے۔ دیر تک محبت کی باتیں کرنے رہے۔ شعر و شاعری کی ایک مختصر صحبت ہو گئی۔

### شاعر اور چناب

رات کا اندھیرا ہوتے ہی احساسات کی شمعیں روشن ہو جاتیں خیالات، کا بازار جگمگا اٹھتا شاعر جاگ اٹھتا اور کچھ دبر کے لئے چناب کے کناروں پر جلا جانا موجوں کو گنگناتا ہوا ہاتا کھینوں کی ہریالی سے گندہ مہبتوں کا پتہ پوچھتا ادھر ادھر کے کھڈروں سے مرحوم دنوں کی دھڑکنیں سنتا۔۔۔۔۔ کبھی بہ محسوس ہوتا کہ مہینوال چناب کے اس پار کھڑا عثم کا سازا اٹھا رہا ہے کبھی آنکھیں ملنے لگتا کہ سوہنی دریا کی خشکیوں میں گھری ہوئی ہے گھڑا گھڑا دھل رہا ہے طوفانی لہریں سوہنی کے ہونٹوں کو بوسہ دیتی اور ٹوٹی علی جانی ہیں۔ کبھی کسی موج سے طرح کی لے بلند سوتی ہے کبھی کوئی موج جسم میں جاتی ہے۔۔۔۔۔ سوہنی کسی ہے میں باہر کی اور ضرور جاؤ گی مسنوال میرا انتظار کر رہا ہے۔۔۔۔۔ "موجیں کستی ہیں" اد مبارک جا برے سا نظیر سے مال باپ کی لاج بھی جا رہی ہے تو اسے ساتھ معنی حسن ہی ہیں آبرو بھی لینے جا رہی ہے لیکن سوہنی اڑی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ فطرت گھڑے

کے کان میں جانے کیا کہتی ہے کہ گھڑا گھپنے لگتا ہے پانی میں گھل رہا ہے جسے کہہ رہا سو مجھے کھمار نے بنایا ہے میں انسان نہیں گھڑا سو اپنے خالق سے دعا نہیں کروں گا میں اس شخص کی بیٹی کو نہیں لے جاؤں گا جس نے مجھے بنا باہے خود ڈوب جاؤں گا اسے ڈو دو گا لیکن مینوال کا پر ایا ہاتھ میرے اتا کی بیٹی کو چھو نہیں سکے گا سو بہتی ڈوب جا سو بہتی ڈوب جانی ہے۔ سرجس کہتی ہیں شاعر تو بہاں کبانے رہا ہے جامہ ہی وفا کے گیت تراش بزدل کا سفید کنار سے پڑو مٹا ہے بہا در کا منجھدار

میں ————— اچانک شاعر تورش سو جا ماسی تورتس جاگ اٹھا اور سو جیتا کہ چناب کی لہریں میری غلامی کی زنجیروں میں میں ان زنجیروں کو لوڑ دو لگا ب ہاں مینوال نہیں جو ان پیدا ہوتے ہیں بن کی قیمت سترہ روپے ہے جو کعبہ کا غلاف بھاڑتے لند اور گونی چلانے گلی بونی میں گردیں کاٹتے اور خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کو قسطنطنیہ کے بازاروں میں بالوں سے یکڑ کر گھیننے میں اور سب بے غدرات انجام دے چکنے میں نواپن بازووں پر بندھے ہوئے نعونیوں کو چومے میں جو ان کے پیروں نے انہیں دینے تھے کہ ترکوں اور عربوں کی گولیاں ان تک آنے آتے ٹھنڈی ہو جا میں گی لیکن ان کی گولیاں ان کے سینوں کو پھیننی کر دیں گی۔ پھر معاً میں مڑا کر اٹھ بیٹھا جسے کوئی مجھے جگا رہا سو یا کسی نے مجھے جگا دیا ہو ————— ہائے ماہا! گجرات کا غلام دو سخنہ رات کے ساٹے میں بھڑھپراتی ہوئی دگداز آواز کسی پہلو بھی چین نہیں لیتے دیتی جس طرح سونے کو سہاگہ چمکا دتا ہے اسی طرح قید تنہائی میں مایا د، کو چمکانا بلکہ بھڑکاتا ہے۔

انسان شاعر ہو تو خوبصورت آنکھیں بڑا تک کرتی ہیں ————— جو کنٹیل مجھے جہل سے عدالت میں لے جانا اور واپس لانا تو عمر تھا انیس بیس سال کے پیٹے میں ہوگا۔ قدرت نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر آنکھیں دی تھیں۔ اردو نعل میں آنکھوں کی مستی، پلکوں کی خنجر زنی، نظروں کی دل فریبی اور مرگان کی تیر اندازی پر جو کچھ لکھا گیا سب اس کی آہوشچی کا اثاثہ تھا وہ مجھے ستھکری

اگنا میں اُسے ٹکڑے دیکھتا اور قدرت کا منن ہوتا کہ اُس نے اس حال میں بھی کتنا کم کیا ہے! کچھری بانے سوئے ہیں راس نہ کی لبانی کے لئے دعائیں کرنا مجھے مفردہ کی سماعت سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں صرف اسی کو دیکھا کرنا۔ ویسی پر بھگڑی کھولتا تو مجھے افسوس سزا کا شہان حلفوں کی عمدہ از ہوتی۔ مہر انبی سے کہو سر و مرشد ماسا شاید ہی کون دوان سو جو میں نے ان دنوں پڑھا ہو بھی مرے ماقلم کا سن آغاز ہے مہر احاطہ اسعار کے اعتبار سے گنج قارون ہو گیا۔

سہانے دن جلد گزر جاتے ہیں وصال میں قرآن کی ہلکی سی نرشی موندن رک کے چلنے میں لیکن جب محض وصال ہی دہ جائے تو آنکھ کی جھپکی میں عمر بھر کی حکایت ختم ہو جاتی ہے۔

### ایک سال قید

ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے ایک سال مانتقت قید کا حکم سنایا۔ اگلے روز مجھے لاہور منتقل کر دیا گیا خیال تھا شاید وہی کنسٹبل ہمراہ ہو مگر عام ساعرانہ آرزوں کی طرح یہ آرزو بھی مر گئی میں ایک دوسری گارڈ کے سپرد بیڑیاں کٹھکھٹاتا اور تھکڑیاں جھنجھٹاتا لاہور روانہ ہو گیا۔

پولیس نے اسٹیشن تک سواری کا اسطام نہ کبائی کلاس قیدی تھا پیدل بارہا تھا ہاتھوں میں ہنھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں کتا بوں کا ایک ڈھیر اٹھا رکھا تھا۔ جہے جہے سے سولہ برس کا دکھائی دیا اسے کیڑے پن رکھے تھے ایک خوش پوش مجرم یا ملزم کا اشتباہ ہوتا تھا۔ لوگوں کو کب خبر کہ کون ہے؟ کہہ دے آ رہا ہے، امد کہاں جا رہا ہے؟ کسی راگبیر کی نگاہ اٹھتی تو ایک نفرین قہقہہ کے ساتھ لوٹ جاتی یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ میں بیڑیاں پہن کر کھلے بازار میں اس طرح چل رہا تھا مجھے احساس ہی نہ تھا کہ پاؤں زخم کھا رہے ہیں۔ چھوٹے نہ بدھے ہوں نوٹھنے اور اسٹریاں لہولہاں ہو جاتی ہیں میں نے احتیاطاً چھوٹے بانڈھ لئے تھے پھر بھی خراش کی لذت چکھتا چلا جا رہا تھا۔ سامنے سے دو عورتیں



اُدھی تھیں ایک معز و دوسری جوان ————— معز نے جوان سے کہا  
 ”دیکھو! گبرو جوان ہے لیکن بڑے کاموں کے برے نتیجے جو بویا اب کاٹ رہا ہے“  
 ”کسی گناہ میں پکڑا ہو گا“ ————— جوان نے کہا  
 ”جو رسی کی ہو گی، یا کسی کی ماں بہن کو چھڑا ہو گا“ بڑھیا بولی  
 کنٹیبل نے معز کی بات کاٹنے ہوئے کہا  
 ”نہیں ماں جی! خلافت کا قیدی ہے“

مغربی پاکستان کے بعض سپاہیہ انضام میں قومی تحریکوں کے فیصلوں کو عموماً خلافت ہی کا  
 مدعی کہا جاتا تھا ابھی تک تو یہ خلافت اور تنظیم خلافت کے الفاظ کا اتر باقی تھا یا پھر ان فیصلوں  
 کو گماندہی جی کا سپرو کہا جاتا۔

بڑھیا نے سنا تو ٹھہریوں کا روپ بدل گیا جیسے معز چہرے پر رونق آگئی ہو ————— اُس  
 نے دعا دیتے ہوئے کہا

”خدا عمر دے اذکرے بننا! مشکلیں آسان ہوں، وہ مائیں نہیں سیرنیاں ہیں جو تم جیسے بچوں  
 کو چاہتی ہیں“ —————

میرا چہرہ قدرتنا شاشس ہو گیا راستہ بھر سو چتا رہا کہ انسان جہاں تا و افغان کے ساتھ بندیل  
 ہو یا تلے اور من الفاظ کے فرق سے نفسیات کتنی جلدی متغیر ہو جاتی ہیں —————

### دل کے معاملات

اس زمانہ میں مسافر گاڑیوں کے ڈبے عموماً خالی ہوتے تھے ماہ لوگوں کو بہ آسانی جگہ مل جاتی،  
 مسافر ہاٹھ جاتے تھے پولیس والوں نے ٹرڈ کلاس کے ایک چھوٹے سے ڈبے پر قبضہ کر لیا

مردوں کو تو ہوں نے گھسنے نیلے مگر وہ تو جوان لڑکیاں اپنی ماں کے ہمراہ سامنے کی نشست پر آ بیٹھیں، گاڑڈ نے بہت چاہا کہ زمانہ ڈبے میں چلی جائیں مگر وہ کسی طرح نہ مائیں، پولیس کو ”ھبکتا ہی پڑا گاڑڈی چلی تو نگاہوں کا تعاقب شروع ہو گیا۔ غلط ہے کہ محبت کی جاتی ہے محبت ہو جاتی ہے اس کا وار اتنا سخت سونا ہے کہ اسکی جھونک شاذ ہی کوئی سنبھال سکتا ہے۔ نگاہیں اتنی ظالم ہیں کہ زاہد خشک بھی آٹا ناچا کر کھانسی بھول جاتے ہیں۔ عابد دل ٹٹولنے لگتے ہیں وانشوروں کی عقل تکتے کھا جاتی ہے فلاسفوں کا تخیل پہر انداز ہو جاتا ہے رہ گئے شاعر تو وہ گویا ان کے خانہ زاد ہیں اور ادیب حلقہ بگوشی۔۔۔ بڑے بڑے سپہ سالار بھی ان کے اڑنگے بر آکر ٹختی کھا جانے ہیں اپنی صفوں میں خالد بن ولید ہوں پرانی صفوں میں نپولین بونا پارٹ، جسٹن و ونکو کو سنبھار ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ غالب سانسو، اقبال سانسو، کارل مارکس سانسو، جبرائیل، شبلی، سائیرنگار اور ابوالکلام سانسو، یہ سب اپنی رفتوں کے باوصف عشق کے کوچہ میں نکلے سہلانے رہے ہیں۔۔۔

بن لوگوں نے میدان جنگ کو لڑا دیا اکثر ملکوں کی ہیبت کے سامنے دم بخود ہو گئے نہ معرکہ میرے لئے نیا تھا میں نے قباز سے صبح اندازہ کیا کہ معرہ عورت ان کی ماں ہے اور بھٹیوں میں عمر کے اعتبار سے خاصا فاصلہ ہے۔

اُن کا آپس میں نام لینا ظاہر کر گیا تھا کہ چھوٹی کا نام ثریا بڑی کا نام خورشید ہے۔  
خورشید کے چہرے پر جیانے ہالہ کر رکھا تھا لیکن اندر خانہ چنپل نظر آرہی تھی گجرات سے لاہور۔  
تیک نگاہوں ہی نگاہوں میں دیوان مرتب ہو گیا۔۔۔ شرمیل کا فاصلہ جیسے کوئی فاصلہ ہی نہ تھا  
بغیر الفاظ کے گفتگو ہوتی رہی، نگاہوں نے صدیوں کی منہ لیس ہفتوں میں طے کر لیں، نظر اٹھی مطلع ہو گیا  
نظر گری مطلع آرہا، پھر جب لاہور کا اسٹیشن آیا تو میں نے محسوس کیا کہ دل گرفتہ سے باہر ہے اُد  
مہ سے دعا کر کے خورشید کے ہمراہ جا رہا ہے خورشید گاڑڈی سے اُتری اپنی تمام نظریں یکجا کر کے میرے

چہرے پر گلاڑیوں نظر میں جو کتنا چاہتی تھیں ایک ایک کی کہہ گئیں۔ پھر ان میں نم آگیا میں نے اس نم کو  
 جین لیتا چاہا مگر چن نہ سکا۔ خوبصورت بادوں کے کشکول میں یہ موتی ہمیشہ کے لئے رہ گئے جیب  
 کبھی قید کی تنہائیاں کاٹنے کو دوڑتیں ان کی چمک سے اندھیروں کو روشن کرتا۔ اکثر راتیں ان سے  
 جگمگایا کرتیں۔

---

لاہور سنٹرل جیل ٹھکانا بند ہو گیا وہی پرانا چودہ نمبر جہاں چھ سات ماہ پہلے رہ چکا تھا۔ اب یہاں ایک اور قیدی بھگوان سنگھ لوگو والیہ ۱۲/۱۱/۱۹۴۷ء میں درساں کے نئے قید تھا اور کئی مرتبہ سزا کاٹ چکا تھا جیل اور ریل دو جگہیں ہیں جہاں انسان بند ہی درست بن جاتے ہیں۔ ریل کی دوستی زبان کے ذائقے کی ہوتی ہے ذائقہ بدلا بات گئی جیل کی دوستی پائدار ہوتی اور اس رشتے کو درد و شکر استوار کرتا ہے۔ بھگوان سنگھ لوگو والیہ خاصی عمر کا بہادر شخص تھا۔ اس کی موجودگی کا فائدہ یہ ہوا کہ تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ ہم آپس میں سیاسیات پر بات چیت کرتے جس سے دن کا ایک بڑا حصہ بخوشی کٹ جاتا۔ لوگو والیہ سے سکھ پالیٹکس بکمال و تمام معلوم ہو گیا ہم دونوں کے مذاق میں بڑا فرق تھا وہ صرف سیاسی کارکن تھا اسے کتابوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی میں سیاسی بن رہا تھا اور تھا ادبی کتابوں کے بغیر گویا میں تھا ہی نہیں پھر میں ایک رومان میں سے گزر رہا تھا۔ —————

————— تیسرے روز مجھے دو خط ملے ایک والد کا کہ ہفتے کے روز ملاقات کو آرہے ہیں دوسرا خورشید کا کہ آپ کے ساتھ سفر کر کے کچھ پایا اور بہت کچھ کھویا ہے آپ کی تقریریں بھی سن چکی

ہوں دل پر ان کا نقش ہے کیا ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ میں آپ سے جیل میں مل سکوں؟ یہ میرا شوق ہی نہیں آرزو بھی ہے۔

میں اس خط کے بارے میں دو ذہنی کا شکار رہا ہو سکتا ہے کوئی چاہل ہو؟ ممکن ہے خوردشید ہی جو جواب دینے سے احتراز کیا ہفتہ عشرہ بعد ایک اور خط آگیا اتنا نفل کا شکوہ تھا میں نے پھر احتراز کیا اس نے علی التواتر کئی خط بھیجے بالآخر میں نے ایک پوسٹ کارڈ دکھا کہ جیل کے قواعد ہی کچھ ایسے ہیں کہ ملاقات کی اعانت منسکس سے ملتی ہے آپ کے مخلصانہ جذبات نے قید کی تنہا بہوں کو خوش کر دیا ہے۔ اس کرم فرمائی کے لئے شکر گزار ہوں یہ خط اس کے لئے گویا مصرع طرح ہو گیا۔ سال بھر خطوط کا انانتا بدھا رہا کتنے ہی خط جمع ہو گئے۔

### ۴۱ نمبر

میں چودہ نمبر سے نکلنا چاہتا تھا۔ یہ جیل میں جہنم تھا۔ کوئی درماہ کے لگ بھگ وہاں رہا۔ لوگوں کو اللہ کا چالان ہو گیا یا شاید اُسے بی کلاس مل گئی اور وہ اپنے دہے کے قیدوں میں چلا گیا جیل نے مجھے چکر منشی بنا کر پہلے احاطہ میں بھیج دیا۔ میں اب دوزخ سے اعراض میں تھا بلکہ مغالبت بہشت میں۔ ایک تو احاطہ کی آٹھ بیرکوں کا منشی دھڑے روز بہت سے حوالاتی آتے جاتے تھے حیروں کو دیکھنے سے اہر کے حالات معلوم ہوتے پھر چکر منشی ایک بڑی چیز تھی۔ جیل میں دو بڑے احاطے تھے باقی تمام حصے تقریباً چکیوں پر مشتمل تھے ان میں سب سے بڑا سیاست خانہ تھا جہاں نو دس قیدی ہفتہ عشرہ کے لئے رکھے جاتے یا پھر جن قیدیوں کو ضابطہ شکنی میں بند کیا جاتا دوسرے احاطے میں زیادہ تر لمبی قید کے منتقل قیدی رہتے تھے ہر بارک کے ساتھ کارخانہ تھا جہاں قیدی مختلف مشقت کرنے پہلے احاطہ میں بھی بارکوں کے ساتھ کارخانے تھے مگر ان میں زیادہ تر نمبر دار رہنے یا کتنی بڑھ جانے کی صورت میں قیدی رکھے جاتے

یائے میں بان بٹنے منج کرٹنے اور درسی بننے کا کام ہوتا تھا۔ مبرواروں کے احاطہ کا نام بڑھی خانہ تھا چھانسی گھر کے دائیں طرف اور سنٹرل جیل پریس سے ملحق شاہی قیدیوں کا بلاک تھا۔ یہ ریسیٹ ہاؤس کے طرز کی دو چھوٹی عمارتیں تھیں جن کے بغل میں پریس تھا اسکی لیت پر بی کلاس قیدیوں کی مارک بھی اُس کے سامنے دوسرے احاطہ میں گورہ وارڈ اور اسے کلاس کے پوٹیکل قیدیوں کا بلاک تھا۔ اس کے ساتھ ہسپتال اور ہسپتال کے مابین بارو کی طرف دھوبی گھاٹ، لنگر خانہ، وردی گودام، پرانی حوالات اور ٹیریسیٹ وارڈ، جسے ہم کس کا احاطہ بھی کہتے واقع تھے۔ ان کے پیچھے سبزیوں کا ذخیرہ اور پانی کا ٹینک تھا پھر ڈیوٹی کی طرف ٹکڑے موق کے ساتھ ساتھ پراشاہی احاطہ رنگت خانہ اور خراس گھر تھا۔ ڈیوٹی اور ہسپتال کے وسط میں جیل خانے کا محران چیف ہڈ وارڈ اور بیٹھنا۔ اس جگہ کو چکر کہتے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جہاں کوئی نصف درجن قیدی غشتی تمام جیل کی گنتی کا حساب رکھتے۔ ڈیوٹی کے دائیں بازو کی طرف بنا جوہر منبر یعنی خیالسی کے قیدیوں کا بلاک تھا۔ غرض تمام جیل اسی طرح بھیلایا ہوا تھا۔ ایک بڑے گاؤں کی طرح جوئے طرز پر آباد کیا گیا ہو لیکن اس میں کچی اور پتی دونوں طرح کی عمارتیں ہوں۔

### اسیر اللغات

جیل خانے کا اپنا ایک لغت ہوتا ہے ماحول کے مطابق خاص خاص الفاظ خاص خاص مفہوم کے ساتھ رواج پاجاتے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں قیدیوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی بیکارہ یا اک باریا۔ دوسری دوبارہ۔۔۔۔۔ دوبارہ قیدی اُسے کہتے ہیں جو دھوکے چوری جیب تراشی اور اسی قسم کے لچر جرائم کا عادی ہو اور ایک سے زائد دفعہ قید کاٹ چکا ہو ان دوبارہ قیدیوں کے لئے بعض جلیں مخصوص تھیں مثلاً صوبہ کے کسی حصہ میں کوئی دوبارہ قیدی ہو اُسے عموماً منگمری جیل بھجوا دیا جاتا۔ بیکارہ قیدی

اُسے کہتے ہیں جو بعض مردانہ دفعات میں ماخوذ ہو مثلاً قتل، سیاسی دفعات یا اسے حرم جو خرابی اخلاق کے عام تصور سے خارج ہوں یکبارہ قیدی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ پہلی دفعہ کاسزایافتہ ہو۔ اُس کا انحصار دفعات کی نوعیت پر ہے۔ حوالاتی اس ملزم کو کہتے ہیں جس کے خلاف مقدمہ میں رہا ہو۔

انسان۔ انسان کو کس طرح کاٹنا اور معافی (کٹتی) کا لالچ ایک قیدی کو دوسرے قیدی پر کس طرح حکمرانی کی ترغیب دیتا ہے اس کا اندازہ قیدی مہدیاردوں کے وجود سے ہوتا ہے۔

قید کی دو قسمیں ہیں۔ قید محض اور قید سخت۔ کوئی ماکارہ شخص ہی قید محض کاٹتا ہوگا ورنہ ہر محض قیدی اپنی قید با مشقت کر لیتا ہے۔ قید محض میں قیدی کے لئے کوئی فائدہ نہیں، نہ خوراک، نہ پانی، نہ گرمی ہے نہ عام قیدیوں کی سی آزادی۔ تمام دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے رہنا آدمی کو ویسے ہی قتل کر دیتا ہے۔ پھر جیل خانہ خلقتہ بُری بلا ہے باہر کے لوگ قید سخت کا مطلب کوئی عذاب سمجھتے ہیں حالانکہ مراد اس سے یہ ہے کہ قیدی سے کام لیا جائے صرف مشقت کے لفظ نے مفہوم کو مجروح کر دیا ہے ورنہ جیل میں ہر کام منع ہے۔ مثلاً قیدیوں کو پڑھنا مشقت ہے حرکت کاٹنا مشقت ہے۔

منشی سونا مشقت ہے لفافے بنانا، چھین بنانا، سوت اٹیرنا، بان بنانا، صفائی کرانا، اردلی ہونا، کھانا پکانا، کھانا کھلانا، غرض وہی کام جو ہم باہر کی دنیا میں کرتے ہیں اندر کی دنیا میں مشقت ہیں۔ چونکہ قید کے تصور میں کھردرا پن ہے اور قید بہر حال ایک سنگینی بلکہ جانگنی کا نام ہے اس لئے لازماً اس سے بہتت ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانہ میں جو قیدی بنایا جاتا اس سے مہفتہ عشرہ حکلی سپانے، کواہو میں جوئے، یا فرا س میں رگادیتے تھے، یا پھر جیل خانے میں ہمد معاشی کرنے پر چلی بند کر دیتے، اور اٹھارہ سیر گہیوں مسوائے مگر اس کا مشقت سے نہیں معناسزا سے تعلق تھا۔ مشقت کا فائدہ یہ ہے کہ قیدی کو مطالبہ کے مطابق قید میں چھوٹ مل جاتی ہے یعنی سال قید ہو تو اس میں تین ماہ یا اس کے

گڈ جگ کا حصہ معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ قیدی کا جال چلن ٹھیک رہے اور وہ باقاعدہ مشقت گزار رہا ہو۔ یہ معافی جھوٹ یا کٹوتی اور اصل مشقت کا معاوضہ ہے جو بہرہ یا مشقت قیدی کو ملتا ہے اور جب وہ جیل میں کوئی بد معاشی کرنا ہے تو اسی معافی میں سے دن کاٹے جاتے ہیں، محض قیدی کو ہر حال میں پوری قید بھگتنی پڑنی ہے سخت قیدی کی چھوٹ مقررہ معاوضہ میں سے کٹ جاتی ہے۔ مثلاً سال قید ہو تو محض قیدی بارہ جینے گزار کر رہا ہوگا لیکن سخت قیدی نے جمنی معافی حاصل کی ہوگی اسے منفی کر کے باقی معاوضہ کاٹ کر رہا ہوگا دس جینے ساڑھے دس جینے، نو جینے بہر حال اس کا انحصار چھوٹا رہے کہ اُس نے کتنے دن کی معافی لی ہے۔ جھوٹ کی مراعات ان قیدیوں کو حاصل ہوتی ہیں جن کی قید تھماہ یا اس سے زائد ہو اس سے کم مدت کے اسپرڈل چھوٹ نہیں ملتی ہے۔

عام قیدیوں کو ہر سہ ماہی پر بارہ دن، بٹے والے کو پندرہ دن، کالی والے کو اٹھارہ دن اور پیپی والے کو چوبیس دن معافی ملنے سے اس آغری رعایت میں لاگری ردوٹی پکانے والے اور اب اسنو دوشی بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی قیدی کا چال چلن سال بھرا اچھا رہا ہو تو وہ پندرہ دن مزید معافی کا حقدار ہوتا ہے جسے جیل کی اصطلاح میں پندری کہتے ہیں۔ جیل خانہ کا انسپکٹر سنل سالانہ انسپکشن کرتا ہے تو ہر قیدی کو کچھ دن کی معافی دے جاتا ہے ہر وہ قول و فعل یا چیز و ناچیز جس پر جیل خانوں کے اندھے نانون کی مہر ہر بد معاشی ہے مثلاً اُس زمانہ میں کتاب کاغذ اور مشیل رکھنا بھی بد معاشی تھا۔ جیل خانے کے حکام خلاف وضع قطری کے مرتکب قیدیوں کو اتنی سخت سزا نہیں دیتے تھے جتنی کاغذ اور مشیل برآمد ہونے پر ایک قیدی کو دی جاتی۔ پولیٹیکل قیدی کے پاس قلم اور کاغذ کا ہونا سنگین قسم کی بد معاشی تھا۔ ہر قیدی کا ایک ہسٹری سبٹ ہوتا ہے جسے جیل کی اصطلاح میں ٹکٹ کہتے ہیں تمام معائنات، مستقیں، سزائیں، تبادلے اور ریمارکس اس میں درج کئے جاتے ہیں۔ ہر ٹکٹ کے روز تمام قیدی اپنا اپنا ٹکٹ ہاتھ میں لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ صفیں بندھی ہوتی ہیں۔



سپرٹنڈنٹ آنا اور سامنے سے گزر جاتا ہے بعض قیدی طلب و احتیاج کے مطابق سوال بھی کرتے ہیں۔

### وحشی تصویریں

سنٹرل جیلوں کے سپرٹنڈنٹ عام طور پر آئی ایم ایس تھے دوسری جنگ عظیم کے دوران آئی ایم ایس آفسیئر قریب قریب سبکہ دہش ہو گئے مدۃ العمر و ستوریہ رہا کہ سنٹرل جیل کا سپرٹنڈنٹ اور میڈیکل آفسیئر ایک ہی شخص ہو۔ ڈسٹرکٹ جیل کا سپرٹنڈنٹ اور سبڈیکل آفسیئر عموماً الگ الگ ہوتا بعض جگہ سول سرجن کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ سب جیلوں میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو سپرٹنڈنٹ کے زائد بعض تفویض کئے جاتے۔ انگریزی عہد میں کسی راجہ یا نواب کو بھی اپنی ریاست کے لوگوں پر وہ حقوق حاصل نہیں تھے جو جیل خانے کی مخلوق پر سپرٹنڈنٹ یا جیلر کو حاصل رہے۔ کرنل بارکر کی سبکہ دہشی کے بعد کرنل پوری انسپکٹر جنرل اور کرنل چوہڑہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل بنا دیئے گئے۔ کرنل سونڈھی لاہور سنٹرل جیل کے سپرٹنڈنٹ تھے اس تثلیث نے جیلوں کو خوفزدہ رکھا لیکن سیاسی قیدیوں کے ساتھ رعایتیں بھی کیں، لالہ منوہر لال وزیر خزانہ اور جیل خانہ مقرر ہوئے تو ان کا زور بندھ گیا۔ چونکہ یہ ہندو ذہن رکھتے تھے اس لئے انہوں نے ملازمت میں فرقہ واریت کو ہوا دینے میں حصہ لیا اپنے عہد میں تو کسی مسلمان سپرٹنڈنٹ کو اُبھرنے دیتے اور کسی مسلمان افسر کو آسانی سے ترقی دیتے تھے نتیجتاً مسلمان افسروں کے دل ان کے خلاف تھے قیدیوں سے بھی ان کے سلوک کا یہی حال تھا ہندو مجرمین مقابلتاً کم ہونے سے سیاسی قیدیوں میں ان کی اکثریت ہوتی اور اپنی خارجی طاقت کے باعث ڈٹ کے رہتے۔ سونڈھی سکے قیدیوں سے بہت نالاں تھا کیونکہ وہ سرکش تھے۔ مسلمان قیدی زیادہ تر عاجزی سے دن کاٹنے کی کوشش کرتے افسروں کے اردلی عموماً مسلمان ہونے ایک دن کی معافی کے لئے ساتھی کا گلاٹ سکتے اور جیل کی خبروں سے افسروں کو ہر لحاظ باخبر رکھتے تھے۔ سکھوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر

پر بیدار کھا کھا کے جیل کا نظام ہی بدل ڈالا تھا سہت سی سہولتیں انہی کی وجہ سے جیلوں کو حاصل ہوتی تھیں قید کاٹنے کے معاملہ میں وہ بڑے سہادر تصور کئے جانے اور بے شبہ بہادر بھی تھے۔ جیل کے اکثر بنگاے انہی کے دم قدم سے تھے وہ خراب خوراک پر احتجاج کرتے اور بڑی جرأت سے بھوک ہڑتال کر کے اپنی بات منزالیتے۔ وہ کسی افسر سے گائی نہیں کھانے تھے کوٹھڑی میں جتنے، خراس چلانے اور چسکی پینے میں ان میں کمال حاصل تھا شقت سے وہ کبھی جی نہ چراتے، تصوری لائن میں بھی انہیں کاچر پانٹھا بید بڑے سولے سے کھانے اور بید کھانے سے پہلے عموماً انہوں کھا لیتے جس سے ایک غنودگی پیدا ہو جاتی۔

بیدار نے برہنگی قیدی مقرر تھا۔ بید و طرح کے ہوتے ہیں ایک عدالنی جو خونخوار نہیں ہوتے۔ دوسرے تصوری جو جیل خانے میں قصور کرنے پر گائے جاتے ہیں۔ یہ بید بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ قیدی کو لیل کانسٹ بندھا کر ٹنگلی پہ باندھ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سما دیکھ لیتا ہے دو خاکروب رک رک کر آتے سامنے سے بیدار تے ہیں۔ بیدار سے بڑتا ہے لیکن کھنچاؤ لکیر کھینچنے کی طرح ہوتا ہے۔ نتیجہ پہلے کھال پھٹی پھر گوشت کٹتا آخر میں لہو کی بھوار بہ نکلتی ہے۔ جب ایک دفعہ کوئی بد معاش "بید کھالیتا ہے تو وہ مشکل سے قابو میں آتا ہے اسکو قیدیوں میں ایک طرح کی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے خود جیل کے افسر اس سے خوف کھاتے اور گھراتے ہیں۔ سوندھی سکھوں سے بوجہ ناراض تھا اکب وہ اس کے وقت میں بارہا جماعی بھوک ہڑتالوں اور قواعد شکستیوں کے ترکیب ہو چکے تھے دوسرے وہ خم ٹھونک کے مقابلہ میں اترتے رہے تھے۔

### زبردست اور زبردست

ایک دفعہ خراب آٹے کی وجہ سے خراب روٹی پکنے لگی تو سکھ قیدیوں نے احتجاج کیا سوندھی نے

لگا سبواب دیا۔ سکھوں نے مشورہ کر کے سارے قیدیوں کو ساتھ لایا۔ روٹی کو صحیح کرانے میں انہی کی ہمت کو دخل تھا۔ ایک زمانہ تھا روٹی میں آدھا آٹا، ایک حصہ چھان اور ایک حصہ مٹی ہوتی تھی سکھوں نے مورچے باندھ کر ان خرابیوں کو رفع کروایا یہاں بھی انہوں نے تمام جیل میں بھوک بڑھال کرادی ان عاصدہ میں نظام مختل ہو گیا اگر کچھ لوگ کھانے پینے پر تیار تھے تو ہڑتالیوں نے اجتماعی ذلت سے لائنگریوں کا داخلہ روک دیا سالن وغیرہ چھین کر زمین پر ڈھیر کر ڈالا سونڈھی پہلے دن تو خوردہ آیا جیلر کو بھجا جیلر سخت مزاج تھا اس نے اولیٰ احاطہ کا رخ کیا اور ذرا درشت لہجے میں ہڑتالیوں سے مخاطب ہوا تو انہیں بھی طیش آگیا آٹا فانا دلا گیا ہو گیا جیلر نے گالیاں دیں جیلروں نے اوسے کی طیشیں اور کٹوریاں بھینکیں عجب منظر تھا۔ قیدی کہتے ہیں حرامزادہ وہ کتنا ہے تم سب حرامزادے ایک طرف غل مچھتا تیری ماں کی وہ کتنا ہے تم سب کی ماں کی

————— اب چاروں طرف سے اینٹیں برسنے لگیں جیلر بھاگ کر وسطی برج پر چڑھ گیا وہ اوپر سے اجماعی گالی دے رہا ہے قیدی نیچے سے بک بک کر رہے ہیں اتنے میں الارم ہو گیا گارویں آگس سونڈھی بھی آپہنچا بگڑے ہوئے قیدی کہاں رکتے ہیں طرفین میں گالیوں کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ آخر شام تک قابو پایا گیا ایک ایک بارک کا عاصدہ کر کے لیڈر قوم کے سکھ قیدی چن چن کر نکالے گئے اور گھنٹی گھر (تمام جیل کا وسط) کے میدان میں ٹکٹی لگا دی گئی۔

یہ نظارہ بھی عجیب و غریب تھا جس مرواگی اور جرات سے ان قیدیوں نے بید کھائے یا مقابلہ کیا وہ بے شبہ لائق تحسین تھا۔ فیروز پور کا ایک مسلمان نوجوان عبدالغنی بھی ان کا سرفہ تھا اس نے بیس (۲۰) بید کھانے کے بعد اپنے اوپر فرضی غشی طاری کر لی۔ سونڈھی نبض دیکھنے آگے بڑھا تو اس نے پھر یہی لیکر اس زور سے اُس کے منہ پر طمانچہ مارا کہ بلبلا اٹھا۔

کئی دن جیل میں کر فو سائگار ہا لیکن اس تمام جبر و تشدد اور ظلم و ہمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیدی جیت گئے روٹی صاف ہو گئی۔ سونڈھی کے دل میں ایسی گرہ پڑی کہ اُس نے ملازمت بھرنے تو کسی



## بابا طالب خاں

طالب خاں ہم سب میں بڑا تھا کہولت کی عمر میں اس کی دلاہی کے بال کھڑی ہو گئے تھے اسی  
 میں ہم کچھ دن پہلے جی اکٹھے رہے تھے۔ پابند صوم و صلوة، انتہائی نیک دوست نواز، چیف بڈ وارڈر  
 بابا سکندر خاں کا اردلی، جن جوالاتیوں کا گھر سے کھانا آتا انہیں اپنی نگرانی میں کھلاتا خود دوپہر کی روتی کے لئے  
 ٹاٹڑ، مولی پودینہ، پیاز، ہری مرچ، وغیرہ کی چٹنی تیار کر لیتا جو ہم سب مل کر مزے سے کھاتے جیل کا  
 پکوان ہمیشہ ہی بد ذائقہ رہا ہفتہ میں دو بار ساگ، دو بار بھنڈی توری، ایک دفعہ ملوہ کدو اور دو دفعہ  
 ایسا ہی کوئی کچرا جس میں نون نہ مرچ۔ میرے ذائقے نے کسی دور میں بھی ان بڑیوں کو قبول نہ کیا البتہ  
 بعض والیں بڑے شوق سے کھاتا رہا۔ خصوصیت سے ماش کی وال، مونگ کی وال سے میرا جی گھبراتا  
 تھا بہر حال ہم اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے تھے رات کو جاے کپنی توجو بابا طالب کے  
 ذمہ ہوتی وہ کسی نہ کسی طرح چائے کا پکیٹ حاصل کر لیتا نئی یا پرانی ٹکٹوں کے گتے اڑا کے اگل جلاتا،  
 ٹین کے ایک بڑے سے ڈبے میں پانی اُباتا پھر اس میں چائے اور گڑ ڈال دیتا خوب جوش آچکتا تو تین  
 کے ڈبوں کو بھر بھر کر مزے مزے میں چسکیاں بھرتے۔ اتنا لطف آتا کہ جیسے ہم کسی شاہ کے دسترخوان  
 پر ہوں یہ روز نہیں ہو سکتا تھا اکثر نامہ بھی ہو جاتا معمول یہی رہا جب تک ہم اکٹھے رہے چائے  
 میں گڑ باگڑ میں چائے پیتے رہے۔ ہمیں میں ایک آدھ دفعہ تھوڑا سا دودھ مل جانا تو چائے کا رنگ  
 بدل لیتے۔ یہ گویا یوم عید ہوتا۔ جیل میں دودھ حاصل کرنا آسان نہیں وہاں دودھ کہاں؟ دو تہائی پانی  
 لیک تہائی دودھ۔ میڈیکل آفیسر جس قیدی کے بارے میں یہ سمجھ لے کہ سارے کچھ ہے تو پاؤ بھر دودھ لگا  
 دیتا ہے تقسیم کنندگان پانی ملا ملا کر دودھ تقسیم کرتے ہیں۔ بعض قیدی جو تفتے کے عادی ہوتے اور  
 سگریٹ کاکش لگاتے بغیر جی نہیں سکتے۔ اپنا پاؤ بھر دودھ لیمپ کے ایک سگریٹ یا دو پارکس میں

فردت کر دیتے اور یہ کاروبار جیل میں عام ہوتا تھا۔

### قید کیا ہے

قید نظام سگ و نشتن ہاں سب رہنے کا نام نہیں انسان اپنے دن ہر طرح کاٹ لیتا ہے۔ قید  
مہم ہے اسان کی اپنی مرضی کے ٹوٹنے اور برائی مرضی کے چلنے کا۔ اسان نہ اپنی مرضی سے مسکراتے نہ اپنی  
مرضی سے سوے نہ جاگے نہ کھائے نہ پئے نہ پھرے نہ اٹھے نہ بیٹھے نہ بولے یہ ہے قید اور اسی  
کا نام ہے جس اندھے انسان نے جیل مسوئل بنایا تھا اس نے صرف انعام و سزا کو سامنے رکھا اور  
کچھ سوچا ہی نہیں۔ وہ انسان کی داخلی سرتت سے واقف تھا جو عام لوگوں میں مشترک اور اٹکل ہوتی  
ہے۔ وہ مردوں کی اسذرت کا خواہاں تھا۔ کوئی عادت انسانی فطرت بن حانی ہے تو وہ مالی یا بدلی نہیں  
عالمی، سکم لوہاں سے بدلنے یا ناسے یا اور ہونے ہیں۔ جیل کے حکام و احکام ہی انسانی  
مردوں کو مادی مادی اور مادی قیدلوں کو عالم فیدی بنا دتے ہیں اب زمانے میں جیل خانے جرائم  
کا ٹرننگ کول ہے۔ کیونکہ سزا کا مقصد اصلاح نہیں انعام تھا۔

### سکرٹ نوٹشی

جیل خانے میں سب سے بڑی چیز سکرٹ نوٹشی ہے۔ سکھوں کی بہادری کا سبب یہ تھا کہ وہ  
اس سے محفوظ تھے لیکن مسلمان ناہد و مادی اسات کے بڑی طرح شکار تھے جیل میں اول درجہ کا  
سکرٹ نہ آسکا تھا نہ کوئی لاما اور نہ کسی میں اسطاعت تھی۔ لمب کا سکرٹ جیل کا سناٹا سمجھا جانا اور بھی  
حکام ان دنوں بازار میں ڈوبی کی قیمت اٹک آنہ تھی اندر جار آنے یعنی جارگنا مسافح لیکن یہ منافع نہیں  
ہے اور تے والوں کا اٹک (Risk) تھا اور وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر یہ کر کے نکلے۔

سگرٹوں کے ڈبے یا تو بٹے دروازے یعنی ڈیوڑھی سے آتے تھے اس صورت میں وارڈز کو دربان اور  
 مدین کی معرفت کسی اسٹنٹ جیلر یا جیلر سے سودا کرنا پڑتا تھا۔ یا پھر ہر دنی پنجہ کے قیدی وارڈوں  
 سے مل کر باہر دیوار سے ڈبہ پھینکا جاتا اور اندر سے بیوپاری اٹھالیتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ چنگی تیری  
 مدد کی بمبئیوں یعنی پیسوں میں رکھ کر لے آتے۔ فروخت کا طریقہ انکا گندہ تھا کہ طبیعت متلا جاتی، یعنی  
 ڈبی لنگوٹ میں موالیہ ثلاثہ کے ساتھ باندھ کر گاہک تک پہنچائی جاتی اور بہ تلاشی سے بچنے کا سہل طریقہ تھا  
 سگرٹ ہر شخص نہیں خرید سکتا تھا کوئی ایک خریدتا لیکن پیتے بہت سے تھے اس کا ایک نتیجہ یہ تھا  
 کہ کم عمر بلکہ چوبیس پچیس سال تک کی عمر کے قیدی محض سگرٹ کے لئے درسروں کے سٹھے چڑھ کر حنفی  
 کھانے پر راضی ہو جانے بہ بات جیل کے حکام بخوبی سمجھتے تھے مگر حتم پونسی سے کام لیتے کرنل سونڈھی  
 خلاف وضع فطری کے ترکیبیں کو اول تو سزا ہی نہ دینے اور جو سزا دینے وہ انتہائی نرم ہونی ان کا کہنا  
 تھا کہ یہ ایک فطری تقاضا ہے اس سے جیل کے نظم کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا یہ دو قیدیوں کا ماہمی بھجوتہ  
 ہے اب سنا ہے کہ سگرٹ نوشی کی قیدیوں کو اجازت ہو گئی ہے لیکن اس سے پیدا شدہ خساروں  
 اپنی جگہ قائم ہیں کیونکہ جو لوگ جیل جاتے ہیں ان میں اکثر سگرٹ خریدنے کی استطاعت ہی نہیں  
 رکھتے وہ نشہ کے عادی ہو کر خراب کاری ہی سے سگرٹ حاصل کر پاتے ہیں۔ قومی اور سیاسی تحریکوں کو  
 اکثر اسی سے نقصان پہنچا۔ چودھری افضل حق مرحوم نے لکھا ہے کہ نخر بک گنبر میں سگرٹ نوش رضا کاروں  
 کا وجود آخر وقت تک ایک پرابلم بنا رہا۔ احرار نے جتنا فنڈ جمع کیا اس کا بڑا حصہ رضا کاروں کو سگرٹ دینا  
 کرنے پر صرف ہوا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی مختلف کتابوں اور تحریروں میں سگرٹ کے خلاف  
 بہت کچھ لکھا ہے وہ اس بارے میں بڑے ہی دردناک واقعات سنایا کرتے تھے۔

کئی تحریکوں میں سگرٹ نوش قیدیوں اور حوالاتیوں نے وہ گل کھلائے کہ بعض موافق پر  
 شرمندہ ہونا پڑا۔ اس قسم کے لوگ جوش میں آکر جیل تو چلے جاتے ہیں مگر وہ نہیں سکتے نتیجہ یہ نکلتا

ہے کہ معافی مانگنے والوں کی ایک ڈارنگ جاتی ہے باپھر بڑے چھوٹوں کے ساتھ جنسی معاملہ کرنے سے نہیں چوکتے یہ حصہ آخری حد تک افسوسناک ہوتا ہے سگریٹ کا بدل تمباکو ہے جسے بڑا کہتے ہیں یہ بھی اندر ہنگامتا ہے مگ بڑا معمر اور باوضع قیدی کھاتے ہیں۔ کانگریس نے اپنی تحریک کو اس طرح ڈھال لبا تھا کہ اس قسم کی کرداروں اس کی راہ میں مانع نہ ہوتی تھیں۔ پھر اس میں حصہ لینے والے لٹائے پنیے کھرانوں کے لوگ نھے ہماری طرح نہیں کہ جیب و دامال میں نقد دم کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

بابا طالب کو مسلمانوں کی اس کمزوری کا بڑا خیال رہتا وہ خود تو بڑا کھانا مگر مسلمان نوجوانوں کے لئے ادھر ادھر سے سگریٹ مانگ لاتا ملک راج بھی بڑا کھانا باقی ہم سب سگریٹ تمباکو سے متفر تھے۔

### انتقام کا پھکر

بابا طالب نے اپنے ناندا نی دشمنوں کو قتل کیا اور اب چودہ سال کی سزا بھگت رہا تھا اس سے پہلے بھی دس سال کاٹ چکا تھا اس کے بڑے بھائی کو جس خاندان کے لوگوں نے قتل کیا اس نے اس خاندان کے تین لگے بھائیوں کو باری باری قتل کر ڈالا پہلی دفعہ دس سال قید ہوا دوسری دفعہ چودہ سال تیسری دفعہ پچاس لگیا لاہور ہی میں اُسے پھانسی پر لٹکایا گیا اس کے دربار ایک چوہی صندوق میں لاش لے گئے اور اپنے گاؤں میں دفن کیا اس دفعہ میں لاہور میں نہیں تھا بلکہ منگرمی سنٹرل جیل میں تھا ٹرانسفر ہو کر لاہور پہنچا تو یہ سانحہ معلوم ہوا غور کیجئے ایک شخص جیل ہی میں پلتا رہا جوان ہوا بوڑھا ہوا اور آخر موت کے منہ میں چلا گیا اس میں ایک قاتل کی عادتیں بالکل نہ تھیں وہ واقفہ ایک تریب انسان تھا لیکن انتقام کی آگ نے اسے پاگل کر رکھا تھا ہم اُسے اکثر سمجھاتے کہ باا دس سال پہلے کاٹ چکے ہو چودہ سال اب کاٹ رہے ہو بڑھا پاسر یہ آگیا ہے۔ جانے دو لیکن اس عنوان سے



کچھ سنٹا ہی ر تھا وہ کہتا تھا کہ یہ بہارا خاندانی شمار ہے جب تک ہم ایک خون کا بدلہ تین خون کر کے نہ لیں ہماری  
ہمتیں دو وہ نہیں بخشیں۔ وہ اس معاملہ میں پتھر کی طرح سخت اور فولاد کی طرح مضبوط تھا۔

پتی خند لوری کر کے رہا۔ اس خند میں بعض قبیلے اتنے سخت ہیں کہ آج تک فضا صیاب دے سے اپنے آپ  
کو باہر نہیں لاسکے، افراد کے قتل کا یہ سلسلہ پشت پشت سے چل رہا ہے اور اس معاملہ میں وہ کسی مذہب  
، بن پر، فقہ اور مرشد کی نہیں مانتے۔ یہی ان کا مذہب اور یہی ان کا مرشد ہے۔ مرحوم پنجاب کے  
کچھ اضلاع میں تو یہ خوب نہیں ہے لیکن وہ اضلاع جو سرد سے ملنے ہیں یا صوبہ کے وسط میں ہیں ان  
میں انتقام کی یہ آگ ہمیشہ روشن رہی ہے۔ بعض اضلاع میں دلیرانہ قتل کئے جاتے ہیں بعض میں بزدلانہ۔  
مثلاً ڈیرہ غازی خاں انتہائی پس ماندہ ضلع ہے یہاں کی زمینوں اور خرتیوں پر تین داروں کا قبضہ ہے  
لوگ اپنی آبروئیں تک گروی رکھ دیتے ہیں۔ سبکدروں کینے نمٹداروں اور وڈروں کے پستنی غلام ہیں  
بچے ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے زمیندار مادہ اور زر کے مقررہ نرخوں پر انہیں  
خرید لے لے ہیں۔ قتل عام ہوتے ہیں لیکن قانون کی زد سے بچنے کے لئے حد درجہ شرمناک طریقے اختیار کئے  
جاتے ہیں مثلاً الفت نے بے کو قتل کیا گھر چنچ کر سوی کو قتل کر ڈالا پھر بے کی لاش کو اٹھا کر گھر لے  
آیا اور دونوں کو برہنہ کر کے ایک ساتھ لٹا دیا۔ پھر پولیس کو اطلاع کر دی کہ انہیں اس حالت میں دیکھ کر بہ حالت  
غضب اُس نے قتل کر دیا ہے سال بھر میں بیسیوں قتل ہوتے ہیں۔ بعض اضلاع میں عورتیں اٹھا  
لینا یا مویشی بھگا کر لے جانا بہادری سمجھا جاتا ہے۔ بہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ان اضلاع کے لوگ  
انفرادی خونریزی یا رہزنی میں تو انتہائی دلیر ہیں مگر اجتماعی طور پر ان میں قومی یا سیاسی مردانگی کا شائبہ  
کب نہیں بلکہ اس رُخ سے انتہائی بزدل ہیں ان اضلاع سے آج تک نہ کوئی قومی لیڈر شپ پیدا ہوئی  
اور نہ ان اضلاع کی مٹی سے کوئی ایسا شخص اٹھا جو نابغہ یا عبقری ہو یہ لوگ آزاد ہو کر بھی غلام ہی ہیں  
اور اس زمانے میں بھی قرونِ مظلمہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

## اضلاع کی فطرت

ڈومرہ غازیخان ایشیا کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ اس کا طول اتنا ہے جتنا لاہور سے دہلی لیکن سرب تمندار اس سارے ضلع کے خداداد میں کوئی مزارع ان کی جھوٹی قسم کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا ذہنی افلاس کا یہ عالم ہے کہ ان کے نزدیک تمندار ہی ماورن اللہ ہیں۔ ملاش لوگ اسنی بولیوں کے پیٹ پیچ دیتے ہیں لڑکی کے پیٹ کی قیمت زبا وہ پڑتی ہے عام خورد میں لڑکی کی سدائس کے لئے بریفیر مینانی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو تمنداروں کی عظمت اور پردوں کی کرامت کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ حد ابھی کوئی چیز ہے۔ سن بلوچی زبان میں علاقہ کو کہتے ہیں اکثر تمندار بقلم خود ہیں خود ہی مقدمہ بناتے اور خود ہی سزا دیتے ہیں۔ مامی مرحوم میں ایک بلوچ نے کسی کی بکری چوری کر کے ذبح کر ڈالی مقدمہ پیش ہوا۔ تمندار انہما کر رہا تھا کھڑے۔ یہ کھڑے سدھ سنا اور ڈیصد سنا دبا کہ یہی چھری اس بلوچ کی معد میں دسے دنی مائے جینا پنچ فوراً عمل کیا گیا اور وہ بے چارہ عالم بفا کو سدھا گیا۔

سردھ سدھ اور بلوچستان میں بھی انسانی خون کی رفتار یہی ہے۔ صرف اسباب قتل اور طریق قتل میں فرق ہے ان اضلاع کے باشندوں کی یہ عادت گویا ان کی فطرت بن چکی ہے انگریزوں نے انکی اس فطرت کو پروان چڑھایا اب یہ ایک بے قابو ذہنیت ہے جو پیروں نبردوں زمینداروں اور ان کے گائستوں کی بدولت پختہ ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اضلاع میں قتل کی بیشتر وارداتیں زمینداروں اور گدھی نشینوں کے ایسا سے ہوتی ہیں اور ان میں انہی نفوس قدیمہ کے اغراض مشومہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

## عبرت کا ورق

جب کبھی سزائے موت کے قیدیوں سے گفتگو کا موقع ملایا ان کے مقدمات کی نوعیت

معلوم کی تو اس کی تہہ میں مد اوت کا یہی چکر نکلا۔ بابا طالب پھانسی پا گیا اب اسکی قبر بھی مٹ چکی ہوگی مگر پچیس ستیس سال بعد بھی اس کی تصویر نظروں میں گھوم رہی ہے وہ قاتل ہونے کے باوجود ایک انسان تھا محض نسلی عصبیتوں نے اسے قاتل بنا دیا تھا۔ ہمارا دوسرا دوست ملک راج گجرات کے قصبہ جلال پور میں کارہنے والا اور عمر بد تھا اُس نے ایسی بہن کو ایک نامحرم سے آشنائی کے باعث قتل کر دالا۔ ایک بڑھالکھا اور سمجھدار نوجوان تھا اس نے پہلی دو قیدوں میں مجھے بڑا آرام پہنچا باخدا متشکر بارہ ماہیں جبار ہوا تو اُس نے آنکھوں میں رانیں بسر کیں۔ ڈیوٹی سے فارغ ہوتا تو میری خدمت کرنا۔ نام میدان و عافیت سے گزاری رہا ہوتے ہی اگرہ جلا گیا وہاں شبیشہ بیچنے کی دوکان کی۔ پنجاب سے اس کا دل بھر کا تھا و د اور نوجوان عبدالباقی اور میگھ راج نھے نوجوان کیا بالکل ابتدائی عمر میں دونو بھانسی پا گئے۔ عبدالباقی امرسر کارہنے والا تھا آج کل کے بے قابو نوجوان کی طرح کھلندرا۔ اُس نے خان بہادر بڈھے شاہ کے خوبو نوجوان بیٹے کو قتل کیا تھا۔ خان بہادر پہلے محض بڈھے شاہ تھا پھر علاقہ کے تھانیدار کا اعزازی مددگار ہو گیا۔ سید عطا۔ اللہ شاہ بخاری کبھی اس کا سلام قبول نہ کرے۔

تساہ جی جامع مسجد خیر الدین (امر سر) میں جب کبھی جمعہ کی نماز پڑھتے یا پڑھانے جاتے تو دروازہ پر خان بہادر کھڑا ہوتا وہ جھک کر سلام کرتا مگر شاہ جی خلاف عادت جواب دے بغیر منہ پھر کر اندر چلے جاتے، ایک دن نماز مندوں نے باصرار پوچھا ماجر کیا ہے؛ شاہ جی نے ہونہ ہاں کر کے ٹال دیا آخر ایک دن فرمایا بات کوئی نہیں ہے میں کسی ایسے شخص کا سلام ہی قبول نہیں کرتا جو انگریز دوست ہو یا ز مندوں نے بعض افراد کا ذکر کیا جن کا شاہ جی سلام قبول کرنے لور وہ انگریز دوست تھے اس پر تساہ جی نے اصل واقعہ بیان کیا کہنے لگے مارشل لاء میں نیشنل بینک کے فرنگی منیجر کو کسی شخص نے چھت سے زمین پر پھینک دیا تھا وہ گرا اور ہلاک ہو گیا۔ پولیس نے مجرم کو بہتیرا تلاش کیا مگر نہ ملا۔ مفتول کی بیوی نے قصاص کا مطالبہ کیا حکومت نے التامی اسہار لاکھ جو شخص مجرم کا پتہ دے گا وہ اتنے ہزار روپے کا حقدار ہوگا۔ ڈپٹی کشر



## عبدالباقی

عبدالباقی — ایک نچلا نوجوان تھا موت کا خوف اُسے تھا ہی نہیں جس روز اُسے پھانسی دی جا رہی تھی اس دن بھی مسکراتا ہی رہا۔ گول مٹول چہرہ، ہنسنے لگا، تیکھے، گورازنگ، گھنگھر بادلے بال، تختہ دار پر بھی اکر کے رہا، سوندھی نے پڑ کر بھنگی سے کہا کہ اس کے گلے میں ذرا ٹیڑھا سہ ڈالو تاکہ جاں نکلنے میں ذرا وقت ہو، یہی ہوا۔ عبدالباقی دیر تک تڑپتا رہا آخر جان ہار گیا وہ خان بہادر کے بیٹے پر جی جان سے عاشق تھا۔ رفاقت میں قتل کر ڈالا اُسے یقین تھا کہ آئندہ زندگی میں دونوں کی ملاقات ہوگی اور اسی یقین کے ساتھ اس نے تختہ دار کو لبیک کہا۔ جس صبح وہ پھانسی پارہا تھا اس رات دیر تک گانا رہا اُس نے دوہوں مصرعوں گیتوں اور ماہوں کے دفتر آلاب ڈانے، لفظ بھر کے لئے بھی تالو سے زبان نہ لگائی موت کو موت ہی سمجھا چند دن ہمارے ساتھ رہا تاریخ پر امرتسر چلا گیا وہاں سے موت کی سزا پا کر لاہور آ گیا یہاں اپیل تک رہا جب اپیل خارج ہو گئی اور رحم کی درخواست بھی ضابطہ کے مطابق مسرد ہو گئی تو موت کی طرف اس تیزی سے قدم بڑھا کر چلا جیسے ماں نے اسی دن کے لئے جنا تھا۔ بڑے بڑوں حاجی پھانسی کا تختہ دیکھ کر لرز اٹھتا ہے اور سینکڑوں سو رامت کو سامنے ہا کر سہم جاتے ہیں لیکن عبدالباقی موت سے اتنا مطمئن تھا جیسے رہا ہو رہا ہو اور اس کے لئے یہ سعادت بڑی ہی سید ہے —!

## میگھ راج

میگھ راج ایک دھان پان نوجوان تھا۔ رنگ گہوں کے خوشوں کی طرح مات، گھلا نورانی، قامت لستہ اور منحنی، آنکھیں روشن اور سحرک ماٹھا کشادہ، ناک سلواں بڑا ہی خوش اخلاق اور

خوش اطوار اس کی باض میں مومن میر غالب احض حسیط بیدم اور انہال کی بہت سی غزلیں درج  
 نہیں رات کے مار بک سناٹے میں الایتا تو سمان بندھ جانا قدرت نے اسکی آواز میں جاو بھرو یا تھا  
 مالکوں میں نوہر شخص کا لہنا ہے لیکن وہ عمدہ ماہیاری میں گانا طبعیت موم کی طرح گھٹنے لگی۔ محسوس  
 ہوا جسے زحیریں ٹوٹ رہی ہوں وہ خور بھی غمگین تھا اور اسکی آواز سے بھی آنسوؤں کا رشح ہوتا  
 ہا۔ عموما بیدم کی یہ غزل گہا ہے

وہ چلے بھٹک کے دامن مرے دست نالواں سے

اسی دن کا آسرا بھا بھجے مرگِ ناگہاں سے

ما بھر میں اس سے یہ گرا با کرتا ہے

وہ حرف راز جو مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں

حدا مجھے نفس جب بے یل دے تو کہوں

کیا لمحے تھے وہ اجبے جہنم میں جنت آگئی ہواں شب آریوں کا رنگ ہی اور تھا معلوم ہوا

کہ میگھ راج اندر ہی اندر کھٹنا چلا جا رہا ہے اور کسی خاص بوجھ سے ہڈوں کا ایک ڈبھرہ گیا ہے

ایک روز اُس سے ڈاکڑ سے چھٹی لی اور بارک میں لیٹ کر ہلکے ہلکے سروں میں گانا رہا ہے

فرقت میں زندگی مجھے اپنی اکھر کئی

اے مرگ ناگہاں تو کہاں جا کے مر گئی

اُس کے گالوں پر آنسو ڈالے موٹے موٹے فطر سے تھے۔ میں نے پوچھا میگھ راج کیا ہو

گیا ہے ہٹانے کے لئے ہنسنا لیکن آنسو رخساروں پر بے حروف عبار میں چھوڑ چکے تھے۔ میں نے

اسے استفسار راج کیا تو اسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ٹپ ٹپ آنسو آنسو ہی آنسو آخر اُس

نے اپنا غم کہ ڈالا اپنی بیس سالہ بیوی ساوترمی اور اپنی کم سن بچی شکنتلا کی یاد میں استکبار تھا۔



چلی جائیں اور مسرودہ کر آجاتی ہیں۔

بگھ راج نے بچوں کی طرح ملک بک کر دنا مسرودہ کیا معلوم ہوتا تھا بانی ندبوں سے اُجھل اُچھل کر کناروں پر آ رہا ہے سارا دن رونا ہارات مجلس لگی۔۔۔۔۔ تو اس کی طبیعت میں قدرے رکوں پیدا ہوا مگر غم لگتا اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

کوئی جا رہا ہے ڈی پی سیٹڈنٹ جیل سرور ہر جن سنگھ نے مجھے دفتر میں بلا کر پوچھا۔۔۔۔۔  
تمہارے اعظم میں بگھ راج نام کا کوئی قبہ می ہے یاں نے کہا جی ہاں کہا جاؤ اس کو لے آؤ اس کی ملاقات ہے میں بگھ راج کو بلا لایا ہم دفتر پہنچے تو جیلر نے بگھ راج کو حسرت سے دیکھ کر کہا۔  
”بدبخت تیری مسکوں بھوٹ گئی ہے؟“

جیلر نے کہا۔۔۔۔۔ اس کو بھانسی گھر لے جاؤ اس مد لصب کی سزا ایل میں نہیں سال سے موت

ہو گئی ہے۔

جیلر نے ذرا ہی ہنکڑا یا، سنا دس اور چوہہ نمبر میں لے گیا بگھ راج کا رنگ ردو پڑ گیا۔  
آنکھوں میں آنسویر گئے لیکن اُس نے ذرا ہی ضبط کیا جیسے وہ اس وقت رونے کے لئے تیار نہ تھا۔  
آخری حسرتوں کے سوا اس کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ کوئی ہفتہ بھر میری طبیعت کا سکون ہلا رہا ایک ہی جیل میں رہنے کے باوجود ہم آپس میں نہ مل سکتے تھے اور نہ یہ درد بانٹا جاسکتا تھا۔ نمبر داروں کی معرفت دن میں دو بار دفعہ سلام آجاتا یا کبھی رات کے ساٹھے میں دُور سے اُس کی آواز سنائی دیتی کوئی غزل گارہا ہوتا۔ آواز سے رس اور روپ دونوں اڑ چکے تھے درد اور سوز رہ گئے تھے کبھی کبھار چوری چھپے اُس سے مل بھی آتا وہ صرف موت کے دن گن رہا تھا کہ تاریخ کب مقرر ہوتی ہے؟  
ہم میں اننا پیار ہو گیا تھا کہ ہم دونوں انہماکی گہرے دوست بن گئے تھے ایک دن وہ گردن غموٹلے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا میں نے کہا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو اور اپنا کس اُس کا



پہنٹ گیا ہو — کہنے لگا شورش بھائی میری سادقہ اور میری شکستہ کو خط لکھ دو کہ ہم سوگ میں  
میں گے جہاں نہ پھانسی کا قانون ہے نہ موت کی سزا نہ کوئی مہنت ہے نہ کوئی پارو۔ اس کی  
ٹھکسی بندھ گئی، آواز زندہ گئی، کوشش کے باوجود اور کچھ کہہ سکا، میں نے حوصلہ بندھانا چاہا مگر وہ  
جانتا تھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محض تسلیاں ہیں۔ قانون کے سامنے سب بے بس ہیں آخر پھانسی  
پانے کی تاریخ آگئی جب اسکو تختہ دار پر لے گئے تو سپرنٹنڈنٹ نے حسد کا ہنسا کیا تمہاری کوئی  
خواہش ہے؟ تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو؟

بیگم راج نے کہا جی ہاں مجھے شورش کا شمیری سے ملا دین وہ میرا دوست ہے میں

اس سے ملنا چاہتا ہوں

اور کوئی خواہش؟

”جی ہاں اس سے پہلے کہ یہ رسم میرا منکا ڈھکا دے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس تختہ

پر ایک غزل گاؤں“

سپرنٹنڈنٹ نے اس کی یہ دو درخواستیں پوری کر دیں۔

بیگم راج تختہ دار پر کھڑا تھا اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے مجھے دیکھتے

ہی اس کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں غالب کا یہ مطلع اٹھایا۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے

جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

دو تین دفعہ یہ شعر اٹھا بٹھا کر پڑھا پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

سپرنٹنڈنٹ، جیلر، مجسٹریٹ، گارڈ خا کرو ب سب کے چہرے اٹکبار تھے لیکن قانون کی آنکھوں

میں کوئی آنسو نہ تھا اس کے چہرے پر کالی ٹوپی ڈال دی گئی سپرنٹنڈنٹ نے اشارہ کیا خا کرو ب نے

سزا کا فیصلہ ہو گیا۔ راج ساؤتھری ڈسکنٹا کہتا ہوا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ڈسکنٹا کا لاس کی بجلی میں ڈوب کر رہ گیا اور "ت" ہونٹوں پر جم گئی۔

میں نے بعض ہندو دوستوں کو اس کے اہم سنسکار کے لیے کہلا بھیجا تھا اور وہ راولپنڈی جا کر اس کو ہی اور بجلی کو لے آئے تھے۔ نفس باہر زبانی کی بوسہ استی کے رضا کاروں سے ارہی مبارکی ا تسمان بھومی سے گئے سنٹرل جبل کے آہنی دروازے جوں کے توں کھڑے تھے، سنگین تماشائی کی طرح بے حس و حرکت، قفا آرزو، تدریب خاموش، لاس چپ چاپ، دونوں ہاتھ (اہلیہ اور بچی) دو ہتھ مار مار کر بیٹھ رہے تھے۔ قانون جتا کے سعدوں کی نگرانی کر رہا تھا اور انصاف ارتھی کے گردا گرد دیر سے دار تھا۔

یہ مارچ یا اپریل ۱۹۳۹ء میں رہا ہو کر راولپنڈی پہنچا وہاں ساؤتھری اور ڈسکنٹا سے ملا۔ دکھ ہوا کہ تین برسے ماہانہ کی ایک کوٹھڑی میں کرشن کی بانسری کا نسوانی روپ اذیت کے دن کاٹ رہا ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں سانس برس کے لئے پھر قید ہو گیا۔ ۱۹۴۳ء کے آخر میں رہا ہوا۔ اب زمانہ بدل چکا تھا اور اس طرح کی سبھی یادیں مرحوم ہو گئی تھیں فسادات بہار کے دنوں میں پٹنہ گیا تو جس بیٹھ ہاؤس میں قیام کیا وہاں گیا کے ایک زمیندار کا نوجوان لڑکا ادب پندر عرف بچہ بابو بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑا خوش مزاج بار باش انتہائی عبا بن ہر رات ستر کے لئے کھلونا ڈھونڈھنا میں کوئی کتاب یا اخبار لےنے اُس کے کمرہ میں گیا تو پلنگ پر ایک سران وجود پڑا تھا میں ٹھٹکا معامیری نگاہیں اُس کے چہرے پر لگ گئیں اُس نے بھی ناک فوراً ہی منہ پھیر لیا آنکھیں جھکا لیں رگ اڑ گیا یوں ہو گئی جیسے زمین میں گر گئی ہو، میں نے کہا ساؤتھری

وہ خاموش رہی میں نے دوبارہ سہ بارہ کہا ساؤتھری ساؤتھری

ساؤتھری نے بڑے ہی آرزو لہجے میں کہا "بھیا پر نام"

”تم کہاں؟“

اوپندر جھو بھکارہ گیا ساؤتری اپنی جگہ سے اٹھی اور میر کی طرح نکل گئی جانے جاتے صرف  
 یہ کہنا اس میں ایک دیشیا ہو چکی ہوں۔ میگھ راج کی پتی اُس کے ساتھ ہی پھانسی پاگئی تھی  
 میں اس ساؤتری کا سایہ ہوں انصاف کے دونوں ہنس بھائی اور پتی تینوں کو موت  
 کے گھاٹ اتار دیا ہے“

یہ ساؤتری بھی بہت گیا۔ تین چار سال بعد ۱۹۴۹ء کو مجھے ایک خط ملا جو کئی آوارہ تینوں  
 سے ہو کر فخرک پہنچا تھا اس میں لکھا تھا

بھیا — — — پرنام

میں آپ کے مٹر میگھ راج کی ودھوا ہوں۔ آپ مجھے ہٹنے میں ملے نھے میری بیٹی شکنتلا  
 کو آب جاننے اور پہچاننے ہیں۔ بٹوارہ کے وقت جو یہی وہ کہانی بڑی ہی دردناک ہے۔ شکنتلا کو  
 راولپنڈی کے گگ بھگ کسی اسٹیشن پر بلوائیوں نے اٹھایا تھا۔ وہ بہت دنوں لاہور  
 کے کنیا سہائیک آشرم میں رہی ہے اب کچھ پتہ نہیں کہاں ہے؟ آپ کھوج لگا  
 سکتے ہوں تو پتہ دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی آپ کے ایک سورگب ششی مہتر کی آمت  
 کو چہن ملے گا

”ایک دیشیا“

ساؤتری میگھ راج

خط ملا تو میں عرصہ تک بے چین رہا ”چٹان“ کی زندگی کا پہلا سال تھا میں نے یہ  
 سبھی کچھ اُس میں چھاپ دیا۔ ساؤتری کے الفاظ خون کے تھمے اور آگ کے انگارے تھے

ایہ روح فرساتھ تصویر آنکھوں میں گھومنے لگی۔

میکھ راج \_\_\_\_\_ پھانسی

اردو \_\_\_\_\_ قتل

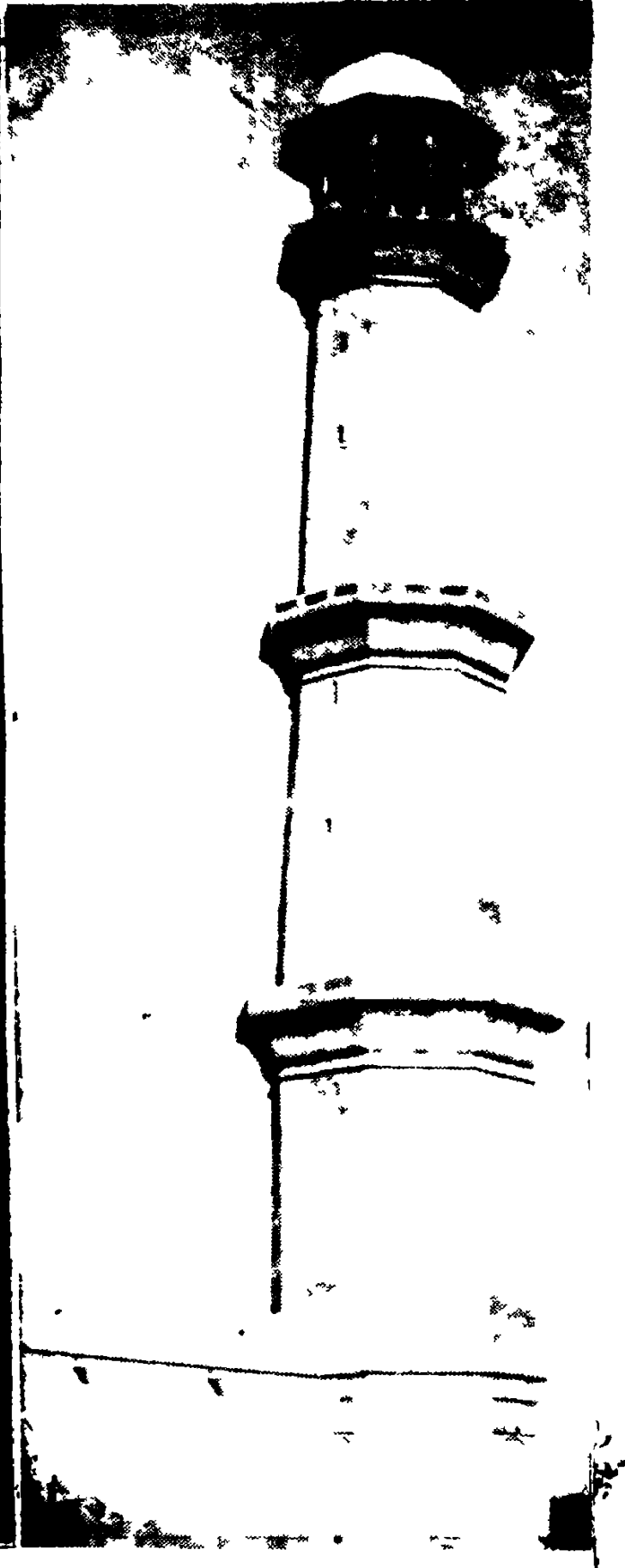
ساوتز \_\_\_\_\_ ریشما

شکنڈلا \_\_\_\_\_ اعجاز

ایک ڈرامہ مختلف سمن ہدایت کار سگدل نانوں کا اندھا انصاف ہے



میں  
 اہل نظر  
 کشور  
 پنجاب  
 بیزار





برطانوی پنجاب میں مسلمان سیاسی قیدی اکثر ابتلا و اہانت کا شکار ہوئے۔ بڑے بڑے رہنماؤں کی بات دوسری ہے لیکن مسلمان نوجوانوں کو عموماً ذلیل کیا گیا۔ تحریک خلافت کے مدد جب عام مسلمانوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرنی تو پنجابی مسلمانوں میں انقلابی نوجوانوں کا قہقہہ مچا رہا۔ وجہ ڈھکے چھپے نہیں اصل وجہ یہ تھی کہ پنجاب برطانوی حکومت کے لئے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اُسے یہاں سے مضبوط اور مستحکم چاہیے تھا اور جو یورپ کے میدانوں افریقہ کے صحرائوں ترکوں کے دروازوں اور عربوں کے گھروں میں گھس گھس کر اُن کے لئے لڑنا رہا بلکہ مقامات مقدسہ کی انٹل سے انٹل بجانے میں بھی سمجھکا نہیں۔ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ اس صوبہ میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہوں یا مسلمانوں میں اس قسم کے نوجوان نکل آئیں جو عام مسلمانوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ انگریزوں نے اپنے اس قلعہ کو مضبوط تر بنانے کے لئے یہاں مفاہات کا ایک طلسم خانہ تیار کیا۔ پنجاب کو بڑی بڑی زمینداروں کا مرکز بنا ڈالا۔ ہندو مسلم فساد ہمیں سے اٹھا سکھوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں عقائد کی کشمکش کا ڈول ڈالا نادیاں نبوت کا پروا سینچا اس نبوت نے تمام مسلمانوں کو کافر کہہ کر نہ صرف تیغ جہاد کا اعلان کیا بلکہ برطانیہ کی ہندوستان میں حکمرانی کا جواز پیدا کیا۔ خانقاہیں پیدا کیں گدی نشینوں کی کھپ کو پروان چڑھایا۔ مخلوق خدا کو ان کے مریدوں کی حیثیت سے

لائے نقل کر دیا، ملازمتوں کے لئے بعض اصلاح چُنے اور ان اصلاح میں سے کچھ خاندان معزز و متمول بنا لئے تاکہ وہ مسلمانوں کے دماغوں اور ان کی جبراً توں کا شکار نہ کر سکیں ان حالات میں یہاں کسی انگریز دشمن مخالف ساہراج مسلمان نوجوانوں کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہ تھا۔ جو ابھرتا اس کو ابتدا ہی میں سی آئی ڈی 'چھابہ' مار کر مخبر بنا لیتی یا سرکاری گمانتے خرید لیتے یا پھر اس قسم کا تشدد کیا جاتا کہ وہ بہت جلد ٹھکانے لگتا۔ مسلمان نوجوانوں کو مخبر بنانا، ذلیل کرنا، یا پھر بے قابو سمجھ کر رسوا کرنا پنجاب پولیس میں سی آئی ڈی اور اس کے مسلمان افسروں کا تیوہ خاص رہا ہے۔

حب کوئی مسلمان نوجوان سیاسی حیثیت سے جیل جانا اس کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بدتر سلوک کیا جاتا۔ سی آئی ڈی میں ہندو اور سکھ افسر بھی تھے۔ بعض ان میں بھی بُری مٹی کی پیداوار تھے مگر ان کی اکثریت میں قومیت و وطنیت کا احساس بھی تھا مثلاً جبر ظالم تھے وہ مسلمان افسروں کی طرح قصائی نہ تھے ان میں روادہ نروہ لوگ تھے جبراً ان میں سخت تھے لیکن بہت سے مسلمان افسروں کا۔ وہ مسلمان نوجوانوں کے حق میں دُشمنانہ تھا وہ نید میں ڈلوا کے بھی پیچھا نہیں چھوڑنے تھے مسلمان سیاسی قیدیوں کو بعداً اخلاقی قیدیوں میں رکھوانے، ہندوؤں اور سکھوں کو بظاہر کافر کہہ کر مارتے لیکن جی میں ڈرتے مسلمانوں سے ڈرنے کا سوال ہی نہ تھا انہیں غدار کہہ کر پٹینے اور پٹوانے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء کی تحریک لائون کے بعد ان لوگوں نے پنجابی مسلمانوں میں ایک بھی سیاسی نوجوان ابھرنے نہ دیا جو ابھرا جیسی گھڑی بنا لیا دو چار صورتیں نکلیں، تو ان کی جہنت کو غارت کر دیا سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں میں پان سات مسلمان تھے انہیں قید کیا تو بھراُس وقت پھوڑا جب وہ تھک ہار گئے یا ان کے حوصلے ناڈر رہی حالات کا شکار ہو کر ٹوٹ گئے یا پھر مسلمانوں سے ان کا تعلق نہ رہا۔ میں ہی ایک مسلمان نوجوان تھا جس نے ۱۹۳۹ء کی سیاسی تحریکوں کے بعد اس کو چہ میں قدم رکھا اور دونوں ہی میں نمایاں ہو گیا۔ خطابت کے خداداد جوہر کا چرچا ہونے لگا محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے قدم بڑھاتا رہا اور قدم بڑھتے ہی گتے لیکن پنجاب پنجاب ہی رہا اُس کے



سید صاحبیت سے انگریزوں کی چھاپ اُتارنا بہت مشکل تھا۔ خان بہادر عبدالعزیز جو قائمقام انسپٹر جنرل پولیس بھی رہے یا پھر مرزا معراج الدین جو سی آئی ڈی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے تک پہنچے اور ابھی اونچا اڑ رہے تھے کہ اچانک حکمتِ قلب بند ہونے سے رحلت فر گئے اپنے گماشتوں سمیت اس خبر بڑے لوگ تھے کہ انگریز بھی اپنی سلطنت کے اتنے وفادار نہ ہوں گے یہ لوگ صرف انگریزوں کے لئے جتے اور انگریزوں کے لئے رہے۔ دوسروں کے بچوں کی گرونیں کٹوا کر اپنے بچوں کو سرفراز کیا، العامت و احزانت پائے۔ میرزا صاحب کو مجھ سے صرف اس لئے لٹھی بغض رہا کہ میں نے کسی مرحلے میں بھی ان کا آلہ کار بنا قبول نہ کیا اس کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ کا قیدی ہو کے بھی عام اخلاقی قیدیوں میں رہا لاہور سنٹرل جیل میں سیاسی اور غیر سیاسی قیدیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ بلاک تھے لیکن مجھے عمداً اخلاقی مجرموں میں رکھا گیا مسلمان سیاسی قیدیوں کو ہندو سیاسی قیدیوں سے الگ رکھنے کی ہدایت ہوم ڈیپارٹمنٹ جاری کرنا تھا لیکن سی آئی ڈی کے ایما و منشا پر مسلمان سیاسی قیدیوں کو اخلاقی قیدیوں میں رکھا جاتا ہے اس سے ان کی تختیر ہوتی لیکن یہ سلوک نووارد مسلمان سیاسی کارکنوں کے ساتھ تھا برائے سیاسی زعماء یا کارکن اس سے مستثنیٰ تھے۔ غرض وہ مسلمان نوجوان جو برطانوی امپیریلزم کے خلاف تھے ان کا پنجاب میں کوئی پرسان حال نہ تھا وہ سرکار کی بدسلوکی انہوں کی بے اعتنائی اور پراپیوں کی بے رحمی کا شکار ہوتے رہے انگریز انہیں حقیر و باغی سمجھتا۔ ہندو مسلمان سمجھ کر صرف نظر کرتا اور مسلمان جانے کیا کچھ کہہ کر آواز سے کہنا ان نوجوانوں کا حوصلہ قابلِ داد تھا کہ تائش و تبریک کا کوئی سا گوشہ بھی سانس نہ تھا مگر غمیہ کی سچائی اور مفصلہ کا عشق و چیزیں ایسی تھیں جو ان کے حوصلوں کی روح اور ولولوں کی جان تھیں بہ حال مجھے اخلاقی قیدیوں میں رہنے کا یہ فائدہ ہوا کہ جیل خانے کا نظام قیدیوں کی نفسیات اور جرم و سزا کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہزاروں قیدیوں میں رہا سینکڑوں سے ملا بیسیوں سے دوستی کی طرح طرح کے جبرائیم اور رنگ رنگ کی سزائیں معلوم ہوتیں۔ بے شمار جوان و معمر میرے سامنے پھانسی پا گئے انہیں بڑھنے اور جانچنے کا موقع ملا۔

”یہیں ایک جرم دریافت کرنے کے لئے خود دوس جرم کرتی ہے“

جسٹس بیگ یا جسٹس منرون نے اپنے کسی فیصلے میں یہ ریمارکس دیتے ہوئے انگریزی محاورے کے مطابق لکھا تھا کہ پولیس کا کام شکاری کا نہیں حفاظتی کتے کا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے اس ملک کو اس سانچہ میں ڈھال دیا تھا کہ پولیس کے بغیر امن عامہ خواب، خیال تھا یہ بات غلط نہیں کہ پولیس والے خود بھی غنڈے یا مجرم پالتے اور اس طرح اپنی کارگزاری کا راستہ نکالتے تھے۔ پنجاب میں پولیس نے جرم کی باقاعدہ پرورش کی ہے سی آئی ڈی کے بعض افسروں نے محض اپنی ترقیوں کے لئے کئی مرحلوں میں سازش کو خود جنم دیا ان کی تفصیل کا یہ نل نہیں اور غالباً اس طرح بات دور نکل جائے گی مگر پنجاب میں اراضی کے مربیع اور اعزاز و انعام حاصل کرنے کے لئے سی آئی ڈی کے بعض افسروں نے اس قدر گندہ ناک کھلا کہ اب بھی اُس کے تصور سے جی لرز اٹھتا ہے۔ بے شک بھی ایسے نہیں تھے۔ خال خال نوگ بک بھی نھے اور ان کی اچھی روایتیں بھی کانوں تک پہنچی ہیں یعنی ان کے سینہ میں بھی ملک و قوم کا درد تھا وہ بال بول کو پالنے کے لئے نوکری کر رہے تھے لیکن من حیث المجموع پنجاب پولیس ایک استبدادی طاقت کا نام تھا انگریزی حکومت کا دبدبہ قائم رکھنے کے لئے وہ جس شریف انسان کو چاہے ذلیل کر سکتی تھی کرنی رہی اور اس کے تواہد و نظائر موجود ہیں۔

### موت کے قیدی

مجھے پھانسی پانے والے قیدیوں سے خاصی دلچسپی رہی میں ان سے طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہا میرے سامنے کوئی پانچ چھ سو قیدی تختہ دار پر لٹکے ہوں گے ان میں موت دو بے گناہ تھے ایک نے کہا کہ اُس نے یہ قتل تو نہیں کیا جس میں وہ پھانسی لگ رہا ہے البتہ اس سے پہلے وہ ایک قتل کر چکا ہے لیکن اُس میں بری ہو گیا تھا دوسرا پھانسی لگنے پر چلا جلا کر کتار ہا میں بے گناہ

ہوں گواہ رہنا میں بے گناہ ہوں۔ میں نے قتل نہیں کیا تھا خیدار نے قاتلوں سے رشوت لے کر مجھے پھانسی گواہی دی ہے میں بے گناہ ہوں باقی جتنے قیدی بھی میرے سامنے پھانسی پاتے رہنے میں ان کے ہاتھوں کی رکھی بھی دیکھتا رہا اور پوچھنا بھی رہا وہ تسلیم کرنے تھے کہ وہ ناحق پھانسی نہیں پارہے انہوں نے قتل کیا ہے عام طور پر قتل کے محرکات میں ذاتی عدوتیں، خاندانی بدلے، ڈاکہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب منحصر ہوتے ہیں اپنی ذات سے باہر کسی عشق یا مقصد کے لئے شاذ ہی کوئی جان دیتا ہے اسی صوبہ کے ایک قصبہ پول میں ایک ہندو سرکاری سرین تھا جس نے اپنے گدھے کا نام (خاکم بدھن) حضور کے نام پر رکھا ایک مسلمان نوجوان نے اُسے قتل کر ڈالا۔ عدالت نے اُسے سزائے موت کا حکم سنیا جو آخر تک بحال رہا اُس کے پھانسی ہانے سے ایک دن پہلے میں اُسے ملا وہ چہرے پر بدن کا ایک خوبصورت نوجوان تھا بڑا مطمئن مطلقاً یقیناً باہر اسان نہ تھا اُسے یقین تھا کہ وہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو رہا ہے چنانچہ بڑی جواہر دی کے ساتھ دار کے تختہ پر گیا بڑے اطمینان کے ساتھ جان دی، مسلمانوں کو رسول اللہ (فداہ امی و ابی) سے جو عشق ہے اور اسلام کے آثار و مظاہر سے جو محبت ہے وہ شاید ہی کسی پروردگار کو اپنے ہادی یا مذہب سے ہو مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء سے لے کر تحریک خلافت ۱۹۲۰ء تک ذوق و شوق سے دار و رسن کو لبیک کہا۔ اور جو افراد پامردی کے بڑے بڑے نشان چھوڑے۔ اس کے بعد بھی سرحد کے سرخپوشوں، پنجاب کے خاکساروں نے پامردی کا ثبوت دیا۔ یو۔ پی میں جمعیت العلماء اور پنجاب میں مجلس احرار نے قربانی و ایثار کا ولولہ کبھی سرد نہ ہونے دیا مگر خلافت کے بعد جب مسلمانوں کی قیادت بالبطع رجعتی عناصر کے ہاتھ میں چلی گئی تو ان میں سیاسی قربانی کی اجتماعی رُوح مقابلتہً کمیاب ہو گئی، انہوں نے خالص سیاسی مقصد کے لئے جان دینے کی رسم دراہ سے ہاتھ اٹھا لیا لیکن حضور اور اسلام کے نام پر جان دینا کبھی ترک نہ کیا یہ شمع ہر دور اور ہر حال میں روشن رکھی او اس پر تپنگوں کی طرح قربان ہوتے رہے۔

سپیشہ گنج کے اہدام پر (راہنماؤں کے اعراض مشورہ سے قطع نظر) نوجوانوں نے جس دلیری سے دو روز تک گولیاں کھائیں اور متواتر اڑتالیس اور ساٹھ گھنٹے تک مورچہ باندھے رکھا مبالغہ کہا جاسکتا ہے قرن اول کے عسزوات ہی کا عکس تھا ہم جہاد و قربانی کے جوہر کے کبابوں میں پڑھے ہیں ان کی بصورت سے اس کی نظیر مختلف ہو جاتی ہے کہ یہاں ایک طرف حکومت کے جبر و استبداد کا سرو سامان تھا دوسری طرف نئے نوجوانوں کا شوقِ نہادت جو انہیں کھینچ پھینچ کے گولیوں کے سامنے لانا تھا۔

### تحریک ختم نبوت

دوسرا مدکرہ ختم نبوت کی تحریک میں پاکستان بن جانے کے بعد ان آنکھوں نے دکھایا یہ ایک سنس بیسوں مورچے تھے بظاہر اس کا تعلق اس کہانی سے نہیں کیونکہ یہ کہانی بابت پہلے کی ہے اور آزادی سے پہلے کے ایام قید و بند کے گرد گھومتی ہے لیکن یہ کہانی چونکہ اب لکھ رہا ہوں اور ذکر بھی حضور سے مسلمانوں کی شیفتگی کا ہے اس لئے تذکرہ یہ واقعہ بھی آگیا ہے۔ کربلا کا سانحہ بڑھا یہ المیہ دیکھا ہے۔ وہاں خاندانِ اہل بیت تھا اس کی عظمتیں و نسبیں ہر لحاظ سے بالا و اعلا ہونے کے علاوہ مقدس و محترم ہیں یہاں جاں نثارانِ نبوت تھے کہ انہوں ہی کے ہاتھوں گولیاں کھا کھا کر اور کلمہ طیبہ پڑھ پڑھ کر جان دے رہے تھے۔ ایک جگہ نہیں لاہور کے مختلف بازاروں کو چوں کونوں اور موڑوں پر فدایانِ رسول شہید ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کافی ہاؤس کے سامنے نوجوانوں کے ایک غول کو شہید ہوتے دیکھا لا الہ الا اللہ پڑھنے جلے آ رہے تھے مال روڈ کی طرف سے پولیس کا مسلح دستہ پہنچا بازو باندھا تڑتڑ گولیاں چنے لگیں۔ نوجوانوں کی زبان سے یا رسول اللہ کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلا اور

اس کلمہ کے ساتھ ہی دس بارہ نوجوان ڈھیر ہو گئے یہ اتنا دلدوز پرجوش اور عظیم مظاہرہ ایثار تھا کہ ان نظائر و شواہد ہی سے تاریخ کی بعض حیرت انگیز سچائیوں کو انسانی اذہان میں درجہ بھین حاصل ہوتا ہے یہ سترار بولہبی اور چارخ مصطفوی کے درمیان معرکہ گریلاہی کا ایک جاگداز پڑاؤ تھا۔

---

## شخصیتیں اور سانچے

۱۹۲۸ء بھی قید ہی میں گزر گیا تجربوں پر تجربے ہوتے رہے سکھوں کے متہور معمر لیڈر بابا کھڑک سنگھ  
 ہسی جیل کے احاطہ دوم کی ایک علیحدہ بارک میں نئے ان کی تمام عمر قید و بند میں کٹی چلاؤ کا زمانہ تھا  
 گا۔ ہی صورت سے خلاف سرور تجربہ مند کرنے رہا ان کا مسلک ہو گیا تھا۔ لال باہتساہ پیراٹ کھڈ بھی ان دنوں  
 اسی جیل میں اسے کلاس کے فیڈی تھے انہیں ترغیب قتل کے الزام میں غالباً پانچ سال قید کی سزا ہوئی تھی  
 جو اپیل میں معاف ہو گئی اور وہ چھ سات ماہ بعد رہا ہو گئے نظر بن گیا ہرٹے ہی کم کو، چپ چاپ عابر و شاکر  
 اور وضع دار بزرگ تھے سو ندھی اپنی روایتی رعوت کے باعث ان سے بھی عام قیدیوں جیسا سلوک کرتا اور  
 وہ ان سے ایک عاجز فندی کی طرح ملتے اسے کلاس کے عام ہندو یا سکھ فیڈی قدرے تمکنت سے رہتے،  
 مگر صاحب میں نمکنت ہاں تا تب تک نہ تھا ایک روز پر صاحب کسی کاغذ پر سو ندھی کے دستخط حاصل کرنا چاہتے  
 تھے اور وہ کھلے باغیچہ میں دفتر لگا کے بیٹھا تھا پیر صاحب کوئی برس گزرنے کا صلہ پر دست بستہ کھڑے رہے  
 اس نے سر اٹھا کر دیکھا مک نہیں کوئی گھنٹہ بھر مدسراٹھا کے دیکھا یو جھیا کیا چاہتے ہو، نفی میں جواب  
 دے کر اٹھے پاؤں والیوں کو دبا پیر صاحب کے دل بر کیا گزری، اللہ سبیز جانتا ہے لیکن ہم دو چار مسلمانوں  
 لے جو اس نے احاطہ سے بھی کچھ دیکھ رہے تھے عزت کی اس رسوائی کو محسوس کیا سو ندھی کو ذلیل کرنے میں  
 غالباً لطف محسوس ہوتا تھا اور اس کی وجہ اس کا آئی ایم ایس ہونا تھا لیکن ان رعوتوں اور خوشنوں کے باوجود  
 وہ پکا فیلڈ تھا۔ انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانی اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو ——— !  
 ایک دن مسٹر ملیپ ایس ایس پی لاہور اور مسٹر بورن ڈیٹی کنسٹر لاہور سے ماہی انکیشن پر آئے تو  
 میں عام قیدیوں میں کھڑا تھا۔ بورن نے پوچھا کس جرم میں قید ہوئے ہو“

۱۲۳- الف؟ بورن کا رنگ قدرے متغیر ہو گیا گویا اب اُسے مجھ سے کوئی بھدردی نہ رہی تھی۔  
سوندھی سے مخاطب ہو کر بولا۔

۱۲۴- الف کا قیدی عام قیدیوں میں گھل مل کے رہ رہا ہے؟ سوندھی نے جبلر کی طرف دیکھ کر  
جملے نے کہا صوبائی گورنمنٹ کی ہدایت پر سیاسی قیدیوں سے الگ رکھا ہے۔  
لیکن عام قیدیوں میں نہیں رکھنا چاہیے۔ بورن بولا

جیلر بہت اچھا کہہ کر چپ ہو گیا لیکن بورن نے سوندھی سے کہا علیحدہ چکی (CE 22) میں بند  
کر دو۔ سوندھی کو ناگوار گزارا جیلر سے کہا کہ شورش سے کہہ دو کہ آئندہ جب کبھی یہ لوگ آئیں تو اُن کے  
سامنے نہ ہو، کچھ دنوں بعد بورن نے استفسار کیا تو اُسے ٹر خا دیا کہ آج کل چکی میں بند اور عام قیدیوں  
سے الگ ہے۔

اُدھر میرزا معراج دین نے حکم نامہ بھجوا دیا کہ عادی مجرم ہونے کی وجہ سے شورش کو منگمری جیل بھیج  
دیا جائے، لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے وارنٹوں پر عادی مجرم لکھ دیا تھا۔ عجب نہ تھا کہ منگمری چالان ہو جاتا  
لیکن مراقبہ پر ایک تو وہ سزا ہی منسوخ ہو گئی، دوسرے اسی احاطہ میں ایک عادی مجرم مسٹر کنو سین تھے جو  
غائب لاگتہ بجو ایٹ تھے اور قانون کی نوک پلک خوب جانتے تھے انہوں نے بتایا کہ اس دفعہ کے تحت  
عادی مجرم قرار دینا ہی غلط ہے، عادی مجرم قرار دینے کے لئے فلاں فلاں دفعات ہوتی ہیں نجشی پر مانند  
نے تسلیم کر لیا۔ معراج دین نے یہ نکتہ چھپڑا تو سوندھی آڑے آگیا اس نے جو اب لکھا کہ ۱۲۴- الف عادی مجرموں  
کی دفعہ نہیں ہے۔ یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ میرزا معراج دین شملہ میں حرکت قلب بند ہونے سے رحلت کر گئے  
اور اس طرح یہ فیضیہ ٹھپ ہو گیا۔ ایک انسان کی موت سے کئی عنوان بدل گئے۔

علامہ اقبال بھی اسی سال اللہ کو پیارے ہوئے، لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس سکیپ کا تاریخی جملہ ٹریبون کی شہرہ ملی تھا۔  
"ایشیا (یا شاید ہندوستان) کا آخری مسلمان چل بسا۔"

یہ خرم پڑھ کر میں بہت روپا بلکہ دیر تک رونا رہا۔ آنکھوں میں ایک گمشدہ سا نقشہ آگیا، یہی دو چار دفعہ ان کے ہاں گیا تھا دو مہینہ دفعہ مولانا ظفر علی خان کے ساتھ، آخری دفعہ اس قید سے پہلے چودھری انقل خق کے ہمراہ، لیکن کجا ذرہ کجا آفتاب۔۔۔۔۔ کئی دن تک ان کی وفات کا غلق رہا بھی زخم بھر جاتے ہیں بہ انہم بھی بھر گیا۔

ایک روز میں ایسے احاطہ میں بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا کہ جیلر کا اردلی میرے پاس آیا کہنے لگا بخشش صاحب بلاتے ہیں ان کے پاس ایک خوش وضع اور خوب رُدا انسان بیٹھا تھا۔ جیلر نے کہا آپ کے ملاقاتی ہیں؟

”میرے ملاقاتی؟“ حیرت ہوئی کہ کرن صاحب ہیں؟ بخشش صاحب نے میری حیرت کو توڑنے سے کہا کہ ان کا نام سردار احمد بخش ہے۔ سردار سکندر حیات کے عزیز اور کھیوڑہ کی مزدور سیٹ سے اسمبلی کے ممبر ہیں رحمت فرمائی کا سبب پوچھا فرمایا مولانا ظفر علی خان اور ان کے بعض نوجوان ساتھی آپ کی بانی کے لئے سردار صاحب پر زور دے رہے ہیں۔ سردار صاحب بھی آپ کو حبس میں رکھنا نہیں چاہتے اس کی یہ شرط ہے کہ آپ لاہور چھوڑ دیں۔

”کہاں جاؤں؟“

”لاہور کے سوا اب جہاں چاہیں جا سکتے ہیں“

میں نے ان کی نسر بہن آدری کا سکر یہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا ”یہ مشروط رہائی مجھے منظور نہیں؟ میں اس کو ذلت سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنی راہ متعین کر لی ہے اور کچھ اللہ مطمئن ہوں۔ سردار صاحب کو میرا سلام کہئے۔“

سردار احمد بخش واضح جواب پا کر حُبیپ ہو رہے۔ میں نے مصافحہ کیا اور انہیں

چلا آیا۔



————— قید کا تیسرا دور تھا۔ کسی نہ کسی طرح یہ دن بھی کٹ ہی گئے۔ خیالات بالکل وہی تھے جو ایک انقلابی کے ہوتے ہیں۔ افکار پر جدوجہد کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا جادو چھ رہا تھا۔ اس وقت تک میں کسی دوسری جماعت میں باقاعدہ شریک نہ تھا تاہم میرے سامنے صرف وہ دستان کی آراہی کا سوال تھا۔ مولانا ظفر علی خان سے جو تعلق خاطر تھا اب اس کا دلورہ باقی نہیں رہا تھا۔ تمہد گنج نے المیہ کا ایک ایک ورق سامنے آچکا تھا چونکہ ہم قومی ہندوستان کے اتحاد کو غارت کرنے کا الزام انگیزوں بردھرنے تھے، لہذا ہمیں پرشید گنج کے انہدام کی ذمہ داری ڈالنے زمیندار بڑے دنوں تک کانگریس کا حامی رہا۔ غالباً ۱۹۳۸ء کے آغاز میں سروا سکندر حیات نے اس کا رخ پلٹا اور وہ کانگریس کی حمایت سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو گیا ورنہ اس وقت تک سیاست وہ کانگریس ہی کا ہونا تھا جو لوگ سلا لند نسل انگریز پرست تھے اور تحریک شہید گنج میں محض جلس حرار کو منانے کے لئے پہلے آئے تھے وہ انہماکات ختم ہوتے ہی روپوش ہو گئے اور ج کل سکندر حیات کی پوکھٹ پر تھے۔ کانگریسی زعماء سلا مولانا بعد القادر قصوری اور ڈاکٹر محمد عالم کو احرار سے ملال تھا، اب وہ بھی اپنی اپنی جگہ لوٹ چکے تھے۔ جس جیل میں تھا کہ لگ بھگ نے پتینا شروع کیا۔ مولانا کے نوجوان بازو اس میں چلے گئے مولانا ظفر علی خان بڑھے ہو گئے اور اب ان میں دم خم نہیں رہا تھا۔ سنٹرل اسمبلی کی رکنیت نے انہیں گوشہ نشین سا کر دیا۔

قید کا یہ زمانہ میں نے بغیر کسی آشنائی کے بسر کیا والد کی بے سرو سامانی ہی سرو سامان رہی وہ دوسرے تیسرے مہینہ ملاقات کے لئے آجاتے، یا سید عنایت شاہ ایڈیٹر سیاست تشریف لائے، گاڈ کا ذاتی دوست بھی چلا آتا، مگر کسی جماعت یا فرد کے ساتھ سیاسی خیالات کی بنا پر میرا کوئی شہ نہ تھا اپنے ہی خیالات کی تنہائیوں میں وقت نکل گیا ۱۹۳۹ء شروع ہوا تو سو سال بعد ۱۹۴۰ء فروری رہا ہو گیا۔ احرار کے چار پانچ سو رضا کار استقبال کو موجود تھے، چند ایک اتحادی بھی آگے تھے،

میں نے احرار میں شمول کا فیصلہ جیل ہی میں کر لیا تھا مجھ پر شہید گنج کا سانحہ اپنی تمام اصلیتوں کے ساتھ مکمل چکا تھا، میں نے جو کچھ اس نحر کیب میں دیکھا وہ اتنا اندوہ ناک تھا کہ پناہ بجز اچھو دہری افضل حق نے اپنی عظیم فراست اور ذاتی دیانت کا مجھ پر ایسا نقش جمایا کہ میں خود ہی ان کی طرف کھنچ گیا۔ ادم

۱۔ یاد نے مجھ میں کئی چیزیں بید کر دیں۔ مثلاً

- ۱۔ میں خود اعما د ہو گیا۔
- ۲۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔
- ۳۔ میں نے اپنے لئے جدوجہد کا سیاسی میدان متعین کر لیا۔
- ۴۔ میرے نظریات متشکل ہو گئے۔
- ۵۔ مجھے مطالعہ کا عادی بنا دیا۔
- ۶۔ مہرئی فکر کو کبسوئی بخشی۔
- ۷۔ اچھے برے سیاسی نظریوں اور فومی و ملی راہنماؤں کی پہچان ہو گئی۔
- ۸۔ ملک و انگریزی سامراج سے نجات دلانے کا جذبہ سرفہرست آ گیا۔
- ۹۔ اس سے پہلے میں نراج کی طرف راجح تھا اب میرا ذہن ایک ایسے انقلابی نوجوان کا ذہن ہو گیا جو اتبانی نظریات کی اساس پر ملک کی آزادی جانتا ہو۔
- ۱۰۔ میں عدم تشدد کا قائل ہو گیا کیونکہ جس جماعت یا قوم کے پاس حکومتوں کے منظم تشدد کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہو انکے لئے عام تشدد اور ترک موالات ہی بہترین ہتھیار ہیں۔
- ۱۱۔ لیڈروں کے تعلق میں القصور پریش کے بجائے کپرسش ہو گیا۔
- ۱۲۔ ملک کی سیاسی ضرورتوں اور ان کے اور پھور سے کا حقہ شناسا ہو گیا۔

## احرار کانفرنس پشاور

اپریل ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مجلس احرار کا سالانہ اجلاس پشاور میں ہوا۔ چودہری افضل حق صدر تھے۔ انہوں نے ایک تاریخی خطبہ پڑھا جس میں تقریباً بھی سیاسی مسئلوں پر روستنی ڈالی چودہری صاحب نے فرمایا۔ دوسری جنگ عظیم یورپ کے سر پر منڈلا رہی ہے جانے کب لڑائی چھڑ جائے اس جنگ میں ہارنے والے تو ہا۔یں گے مگر جیتنے والے بھی ہار جائیں گے ظالموں کا یوم حساب قریب آگیا ہے اب برطانیہ کے لئے ہندوستان میں رہنا مشکل ہوگا۔ ملک آزاد ہو کر۔ سے گا وغیرہ۔ چودہری صاحب کا یہ مطالبہ نہ صرف ان کی سیاسی فراست کا شہ پارہ تھا بلکہ جو کچھ انہوں نے اس میں فرمایا وہ حرف بحرف پورا ہوئے رہا ملک میں کانگریسی وزارتیں کام کر رہی تھیں ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد میں وزیر اعظم تھے انہوں نے تحسیر و تقریر کی آزادی تمام ہی نہیں کیا بلکہ ان کی وجہ سے لوگوں میں حوصلہ و اعتماد بڑھ گیا تھا۔

میں نے بھی اس کانفرنس کو خطاب کیا میرے خیالات بلاشبہ باغیانہ تھے خان صاحب کی حکومت نہ ہونی تو یہ تقریر کبھی برداشت نہ کی جاتی انگریز گورنر رپورٹ پڑھ کر خفا ہو گیا اس نے خان صاحب کو بلا با خان صاحب ہونہ ہاں کر کے کہتے آتے ہی سید عطا اللہ شاہ بخاری اور دوسرے احرار ایڈیٹوں کو چا۔ئے پر مدعو کیا۔ گورنر کی ناراضی بیان کی اس دوران میں گورنر کا فون آگیا کہ تقریر پر کیا ابلشن (Action) لیا ہے خان صاحب ٹال گئے تاہم صوبہ سرحد سے نچھے نکلتا پڑا میں چودہری صاحب کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گیا مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی پشاور رہ گئے تاکہ کانفرنس کے اثرات معلوم کریں۔ خان صاحب اور گورنر میں جھڑپ ہو گئی گورنر چاہتا تھا کہ مجھے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا جائے خان صاحب راضی نہ ہوتے انہوں نے کہا کہ وہ مقرر کو صوبہ سے نکال چکے ہیں گورنر مصر تھا کہ تقریر

ہیں کھلم کھلا تشدد پر ابھارا گیا ہے مقدمہ جیلنا چاہیے غرض خان صاحب نہ مانے اور اس طرح یہ بلا مل گئی۔

انہی دنوں سنڈل اسمبلی نے آرمی بل پاس کر دیا۔ بہ احرار رہنماؤں کی تقریروں کا رد عمل تھا جو دوسری جنگ عظیم کے پھٹ جانے کی پیش گوئی کر رہے اور علی الاعلان فوجی بھرتی کی مخالفت پر نلے رہے تھے۔ ان کے نزدیک برطانوی سامراج پر ضرب لگانے کا بہ آغری موقع تھا احرار نے آرمی بل کے خلاف ماقاعدہ جہم شروع کر دی حافظ علی بہادر نے بمبئی میں احرار کانفرنس منعقد کی۔

### بمبئی کا سفر

لاہور سے احرار رہنماؤں سالاروں اور رضا کاروں کا ایک تافلہ بمبئی پہنچا تین دن تک اجلاس ہوتا رہا انہی دنوں میں نے یورپ کی جنگ پر ایک معرکہ آرا نظم کہی میں کبھی کسی مشاعرے میں نہیں گیا اور نہ محنتیت سے کبھی کسی جلسہ میں کوئی نظم پڑھی۔ لیکن یہ نظم ہی ایسی تھی کہ پڑھ کے خود بھی لطف اٹھاتا رہا اس میں جوش و جذبہ عروج برتھے یٹال میں لاکھ سے کیا کم جمع ہوگا۔ نظم نے آگ لگا دی اگلے روز بمبئی کے تمام اردو روزناموں نے صفحہ اول پر نظم چھاپ دی۔ انگریزی روزناموں میں بھی نظم کا چرچا رہا تقریر نے اور رنگ باندھا میری تصویریں اور انٹرویو چھپنے لگے سٹرکے۔ ایف نریمان کی صدارت میں صوبہ کانگریس کمیٹی کا جلسہ عام ہوا تھا مجھے بھی مدعو کیا گیا وہاں تقریر کی جو مقامی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کی بمبئی کرائسٹل کے وقائع نگار نے لکھا کہ

ایک نوجوان جو ابھی لڑکپن سے نکلا ہی ہے احرار کانفرنس پر چھا بارہا بمبئی کے لوگوں نے اس کو کئی جگہ تقریروں کی دعوت دی وہ اردو زبان کا ایک شعلہ نوا اور صاف گو مقرر ہے لوگوں کے دماغ و دل پر جادو کرتا ہے اُس نے احرار کانفرنس

میں اڑھائی گھنٹے تک تقریر کی لوگ اس طرح بیٹھے رہے جیسے اُس نے  
سھر کر دیا ہو ،

سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا عظیم خطیب جو انسانی عقولوں کا شکار کرتا رہا سو اپنی تقریر ختم کر  
چکا تو دن کے اُجالے میں ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا لوگوں نے شور مچا دیا کہ شورش شورش!  
چسپانچ فجر کی اذان ہونے تک میں بولنا رہا۔ اتنا بڑا مجمع اکان کی تصویر بنا رہا۔

بہتی سے رخصت ہو کر ہم اگرہ نیچے وہاں قلعہ کے میدان میں بڑے معرکہ کا جلسہ ہوا۔  
ہزار ہا انسان جمع تھے ہم لوگ گویا جان کی بازی لگا کر تقریریں کر رہے تھے نازاً بہ تقریریں قانون  
لی زد میں آتی تھیں مگر ان صوبوں میں چونکہ کانگریس کی حکومتیں تھیں لہذا ہم لوگ گونج گرج کر چلے  
آئے پنجاب فوجی بھرتی کامرکز تھا یہاں سے برطانیہ کو سپاہی ملتے بلکہ بعض اصلاح تو سپاہی جنتے  
تھے انگریزوں کے لئے یہ صوبہ ہیروں کی کان تھا پولیس اور فوج دونوں فصلیں یہاں اس کثرت سے  
ہونی تھیں کہ برطانوی مستعمرات میں اتنی کارآمد فصلوں کا پیدا ہونا ناممکن تھا سر دار سکندر حیات احرار  
سے عاجز آچکے تھے۔ اب اُن کے ہاتھ میں آرمی ایکٹ بھی آگیا۔ ۱۲۴۔ الف وہ پہلے ہی کھلے  
دل سے استعمال کرنا چاہتے تھے احرار رہنماؤں کے لئے جیل روزمرہ کا کھیل تھا انہوں نے فوجی بھرتی  
کے خلاف آواز اٹھانا اور سکندر حیات کی وزارت کو نشانہ تنقید بنانا اپنا شعار بنا لیا تھا تمام صوبہ میں  
دن رات تقریریں ہو رہی تھیں خود میں نے متی سے اگست تک بیسیوں مقامات پر تقریریں کیں۔

### یک روزہ قید

ڈیرہ اسماعیل خاں (صوبہ سرحد) کے اجاب بہ امرار اپنے ہاں لے گئے وہاں تین تقریریں  
کیں۔ ایک رات جلسہ کے بعد — بستر پہ لیٹے ہی تھے کہ پولیس نے میزبان کے مکان کو

گھر نامانجھے اور میرے ساتھی میرزا غلام نبی جانباڑ کو گرفتار کیا رات بھر حوالات میں رکھا علی الصبح جیل پہنچا دیا۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سنٹرل جیل سرحد کا کالا پانی تھا۔ دیواروں اور تالوں کا گورکھ دھندا۔ یہیں علیحدہ علیحدہ جیکٹوں (C = 125) میں رکھا جاتا ہوا۔ پولیس سے خفا ہو کر کھانا واپس کر دیا تھا اب جیل میں بھی بھوک بڑھتی رہتی تھی اس بھوک بڑھانے کے حق میں یہ تھا کیونکہ سرحد کی پولیس کا رویہ مابل اعتراض۔ خاص بات پر جانباڑ خفا ہوا انکسٹرے معذرت کر لیا تھی جانباڑ ضد یہ قائم رہا میں اس کے بغیر کبوتر کھانی سکتا تھا جانباڑ کو سمجھایا نہ مانا لطیفہ یہ رہا کہ میں تو بھوک بڑھتا ہوں کیا جانباڑ چپکے سے راضی ہو گیا ڈاکٹر خان صاحب کے فرزند خاں عبید اللہ خان اسی جیل میں قید تھے ڈاکٹر صاحب نے انہیں کسانوں کی تحریک کے سلسلہ میں قید کر رکھا تھا جانباڑ ان کے کہے پر مان گیا ادھر ڈیرہ کے لوگوں نے ہماری گرفتاری کو اپنی ہنک سمجھا بڑھتا ہوا کی مظاہرہ کرنے لگے ضلعی حکام سخت پریشان ہوئے۔ لوگوں پر دروہا کر دو کامیں کھول دیں مظاہرے بند کر دیں لوگ کہتے کہ مہمانوں کا پکڑے جانا مہترمانی کا ہنک ہے شام کو لتا دور سے ڈاکٹر خان کا حکم آ گیا کہ چھوڑ دو۔ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی کمشنر جاہتے تھے کہ ضلع کے حدود سے نکال کر ہمیں پنجاب کے حدود میں پہنچا دیں لوگ کوئی سی شرط بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور یہ بھی کچھ عوام کے اخلاص سے بورہا تھا عرض تمام ہونے ہی ہمیں چھوڑ دیا گیا باہر نکلے نو جیل کے دروازے پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا زندہ باد کے نعروں سے لوگوں نے کانڈھوں پر اٹھالیا پھولوں سے لاد دیا جلوس نکالا اک بڑا جلسہ ہوا اگر ماگرم تقریبی ہوٹن اگلے روز ہم لاہور کے لئے روانہ ہو گئے سینکڑوں لوگوں نے دیئے سندھ کے کناسے پر الوداع کہی ایک روزہ قید کا لطف ختم ہو گیا۔

### دوسری جنگ عظیم

سردار سکندر حیات تقریباً سبھی احرار رہاؤں کی گرفتاری کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مولانا عبید اللہ

پر لدھیہ میں مقدمہ چل رہا تھا اور وہ ضمانت پر تھے مولانا سید علی انصاری اور لپنڈی کی ایک تقریر میں زیر دفعہ ۱۷۳- الف مانوڑ تھے۔ شاہ جی کے خلاف ۱۲۱ اور ۱۲۲- الف نے علاوہ  $\frac{۳۰۲}{۱۱}$  کے مقدمات رجسٹر ہو چکے اور وہ ایک آدھ دن میں گرفتار ہونے والے تھے۔ میرے خلاف اڈاکاڑہ کی ایک تقریر کو قابل مواخذہ قرار دے کر ۱۷۴- الف کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا وارنٹ نکل چکے تھے تعمیل باقی تھی اتنے میں خبر آئی کہ ہٹلر نے ڈنیزنگ پر حملہ کر دیا ہے یہ دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا فوراً ہی قانون نفاذ ہند نافذ ہو گیا۔ جو دہری صاحب ہفتوں سے اسی گھڑی کے منتظر تھے اُس روز امرتسر میں تھے خبر پڑھنے ہی رقص کرنے لگے۔ کبھی اتنا خوش نہیں ہوئے جتنا اُس روز خوش تھے۔ فرمایا اب برطانوی سامراج کا مرحلہ جانگنی ہے۔ یہ جنگ اس کے لئے حریف آخر ثابت ہوگی جیت سویا ہزار امدیدوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا اور ہندوستان سے برطانیہ کے اخراج ہی میں افریقائی ملکوں بالخصوص جزیرۃ العرب کی نجات ہے مجلس احرار اسلام کی مجلس عاملہ کا فوری اجلاس بلوا با جس میں فوجی بھرتی کے خلاف تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شیخ حسام الدین صدر اور میں سبزل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ نوجوان رضا کاروں نے ناچنا شروع کیا ہال مازار میں لوگوں کا ایک ہجوم ہو گیا غرض اس جراثیمدانہ اقدام پر نعرہ ہائے تحیین گونج اٹھے رات گلوالی دروازے میں جلسہ عام منعقد ہوا چودہری افضل خاں صدر جلسہ تھے اکثر احرار رہا شیعہ پر فرودکش تھے۔ میں نے قرار داد کی وضاحت میں بڑے ہی بانگین سے تقریر کی۔ ہزار ہا افراد کا مجمع تھا۔ تقریر نے لوگوں میں اتنا جوش و خروش پیدا کیا کہ اثنائے تقریر میں مولانا صاحب الرحمن لدھیانوی اٹھ کھڑے ہوئے مجھے اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا فرمایا تقریر بند کر دو یہی وہ مقام ہے جہاں ایک خلیب لوگوں کے دل و دماغ پر قابو پا کر جس طرف چاہے اس کا رخ موڑ سکتا ہے یہ خطابت ہمیں ساحری ہے اور ساحری عقل و ہوش کو شکار کرتی ہے۔ تم ساحر نہ بنو داعی رہو جو تمہیں کہتا تھا کہ چکے ہو جلسہ برخواست کیا جاتا ہے لوگ نعرہ ہائے تکبر اور نعرہ ہائے رستخیز کے ساتھ رخصت

ہو گئے پولیس میری تلاش میں تھی ۱۲۔ الف کے وارنٹ پچھا کر رہے تھے میں لوگوں کے ہجوم سے نکل کر نائب ہو گیا۔ رات کوئی ایک بجے چودہری صاحب کے پاس دفتر احرار پہنچا تو وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے فرمایا۔ یہاں کیوں آئے ہو؟ چلے جاؤ پولیس ڈھونڈ رہی ہے رات بھر ایک دستہ کے ہاں چھ بار ہاؤن چڑھے لاہور چلا گیا وہاں رات کو جلسہ عام نکھائی شیخ حسام الدین نے مجھ سے کہا کہ چودہری صاحب نے کہا بھجواتے کہ شور مت اس جلسہ میں تقریر نہ کرے میں امرتسر کی تقریر کے نشہ میں تھا اور یہاں بھی اسی سرور میں ڈوب کے تقریر کرنا جانتا تھا سمجھ میں نہ آیا کہ چودہری صاحب نے منع کیوں فرمایا ہے؟ ایک لاکھ کا مجمع ہو گا شیخ صاحب نے کوئی تین گھنٹہ معرکہ اور تقریر کی۔ اگلے روز چودہری صاحب ملے تو ناراض ہوئے کہ تقریر کیوں نہیں کی؟ میں نے تیج صاحب کی روایت کا ذکر کیا فرمایا میں سے کوئی پیغام بہت بھجواتھا پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس فرضی روایت سے خوش نہ تھے۔

میرا ارادہ لوہی کی طرف نکل جاے گا تھا عازمی محمد حسین نے مانڈی نوالہ میں احرار کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر رکھا تھا وہ سفر تھے کہ اس صورتحال کے بعد کانفرنس ناکام رہی تو نہ صرف انکے اشتیاقات درہم برہم ہو جائیں گے بلکہ جماعت کو بھی صدمہ پہنچے گا۔ جنانیہ ان کے اصرار پر میں اور اسمعیل ذبیح ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ادھر پولیس ہماری تلاش میں تھی۔ اُس نے لاہور کا کونہ کونہ چھان مارا لائل پور پہنچ کر جس کچھ دہر کے سنے رکنا پڑا مقامی جماعت نے جلسہ عام کا اعلان کر دیا دھوبی گھاٹ پر بے پناہ ہجوم تھا جہاں طرف آدمی بنی آدمی حکیم نور الدین کی مدارت میں دھواں دھار تقریر ہوتی پھر جیسا کہ طے ہوا تھا جلسہ برخواست ہوئے ہی چاروں طرف کے گیس فوراً بجھا دیتے گئے میں وہیں شیخ تلے چھپ گیا رضا کارانہ دھیرے سے ایک نوجوان کو کانٹا لے کر اٹھا کر شورش کا شہری زندہ باد کہنے ہوئے نہر کو چلے گئے بلوس۔ کمر پہنچا تو روشنی میں کھلا کہ شورش جلوس میں



نہیں کوئی نامد نوجوان ہے سی آئی ڈی کو پریشانی ہوئی رضا کار قہقہے اڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے۔

پولیس نے ادھر ادھر دیکھا پے مارنے شروع کئے مگر بے نتیجہ میں وہاں سے نکل کر ایک ذرا آتی دوست نور شید کے ہمراہ اس کے ہاں چلا گیا یہ دوست اُس وقت راجستھالی کالج میں ملازم تھا پھر فروری میں لیفٹیننٹ ہو گیا جنگ کے اختتام پر میجر تھا پولیس لائنز کے ساتھ ہی اس کا کوارٹر تھا اس نے اپنے ایک ایسے ساتھی کے مکان پر پہنچا دبا جو معتدہ قادیانی تھا تھوڑی ہی دیر پہلے میرا اس سے تعارف ہوا تھا میں قدرے عجیب لیکن خورشید نے کہا بھگنے کی ضرورت نہیں یہ میرا معتدہ دوست ہے شہر سے باہر کھیتوں کی طرف اس کا مکان ہے۔ وہاں کوئی اندیشہ یا خدشہ نہیں وہیں کھانا کھایا صبح ناشتہ کیا دن چڑھے اعلیٰ ذبح اور محمد حسین غازی کو بلوایا تانڈیا نوالہ ہم اس رازداری سے پہنچے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی جلسہ ہو رہا تھا تقریر کی شام کے اجلاس میں دوبارہ تقریر کا وعدہ کیا دونوں کو تصویر کھنچوانے پر امر تھا اتنے میں ایک نوجوان نے اطلاع کی کہ پولیس آ رہی ہے جہاں ٹھہرا تھا اس کی کھڑکی سے دیکھا تو سب انسپکٹر پولیس کی جمعیت لئے بھاگ بھاگ آ رہا تھا۔ ذبح اور میں عجبی دروازے سے نکل گئے فلائنگ دو فلائنگ کے فاصلہ پر ایک دوسرے دوست کا مکان تھا وہاں پہنچے کچھ دیر قیام کیا وہی نوجوان بھاگتا ہوا آیا کہ پولیس یہاں بھی آ رہی ہے باہر نکلے اڑنے کے لئے پرتول ہی رہے تھے کہ میاں نور اللہ شیخ حسام الدین کو اپنی کار میں لے کر پہنچ گئے، اُن سے درخواست کی کہ ہمیں کسی ایسے راستہ پر چھوڑ دیں جہاں سے ہم لاہور چلے جائیں شیخ صاحب کو تقریر کرنی تھی وہ تانڈیا نوالہ رہ گئے میاں صاحب ہمیں فوراً ہی لے کر اڑ گئے سب انسپکٹر نے دوڑ لگائی لیکن ہم نکل چکے تھے پولیس منہ دیکھتی رہ گئی۔ موٹر کوئی چالیس پچاس گز چلا ہو گا کہ رُک گیا تھا نیدار نے زقند لگائی۔ پانچ قدم کا فاصلہ درمیان میں تھا کہ موٹر سٹارٹ ہو گیا میاں نور اللہ ہوا ہو گئے پولیس نے ناکہ بندی کے لئے چاروں طرف فون کئے لیکن وہ راستہ بدل کر گوجر پہنچ گئے۔ ہم دونوں کو ریل کی میٹھی پڑا تارا اور کہا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریں میں

ابھی آتا ہوں۔ ماندلیا نوالہ سے بھاگتے وقت ہم ایسا سامان وغیرہ وہیں چھوڑ آتے تھے۔ جب میں ایک ٹکاتک نہیں تھا۔ اس اور اتفری میں میرا جٹوہ بھی نکل گیا۔ ذبح کے روپے سوٹ کمب میں رہ گئے لاہور تک دوپاس روپے بل کا ادا تھا۔ مسال صاحب نے ہمیں نوجوہ کی مجلس احرار کے حوالے کیا اور رحمت سوئے۔ ماہ، سدر نے تین دس یا بیس روپے دیئے۔ اس آنے جانے میں کوئی برا گنڈھٹا اٹھ گیا۔ ہم ٹی بی رٹل سے نکلے کہ کچھ دیہالی نوجوانوں نے ہمیں گھورنا اور پہچانتا شروع کیا۔ ماہ صاحبہ وہاں تھے ان کے ہاتھ میں لمبی لمبی ڈانگس (لاٹھیاں) تھیں۔ ایک نوجوان فریب آگیا پوچھنے لگا

”آک کا نام شورنش کا شمیری ہے؟“

”ہاں بھائی“

اس سے عمدہ داحرام کے۔ طے بٹہ جذبات پیدا ہو گئے۔ لولا ہم نے آپ کی تقریر سنی ہے اسے وہاں کھڑے میں رجزہ ملنے لگا۔ آک کو بہت بااد کرنے ہیں۔ ان سے معاملہ بیان کیا تو وہ مڑجوس ہو گئے۔ ہمارے ساتھ جمنے دیکھیں وہاں کون آتا ہے پولیس کی ایسی تیلی لاشیں بچھا دیں گے۔ ایک نوجوان دوڑ کر گھر سے، اسی مکھن اور مکھی کی روٹی سے آیا ہم دونوں نے سیر ہو کر کھائی لاہور کی گاڑی نکل جاتی تھی تھوڑی دیر میں ایک گاڑی شور کوٹ جا رہی تھی پولیس کے تعاقب سے بچنے کے لئے ہم اس میں سوار ہو گئے رات نو بجے شور کوٹ پہنچے معلوم ہوا کہ کوئی دو بجے لاہور کے لئے گاڑی ملے گی کیا کریں؟ شور کوٹ کا اسٹیشن نوڑا ہے لیکن ہمارے ویرانہ خاہم ایک تنور بے کی دکان پر اٹھنے دو دو روٹیاں لیں ایک ایک آنے کی والیٹ بھر گیا کراہ پر دو چار بائیاں لیں اور لیٹ گئے نیند کیا آتی؟ کچھ دیر ستا لیا اچانک سفید کپڑوں میں ایک کتھیل آگیا پوچھنے لگا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“

”ملتان میرے منہ سے نکل گیا۔“

ملتان کی گاڑی میں دو گھنٹے اور لاہور کی گاڑی میں چار گھنٹے باقی تھے ذبیح نے بعض وجوہ کی بنا پر ملتان ہی کا فیصلہ کر لیا۔ کنسٹیبل بولا،

”آپ ملتان میں رہتے ہیں؟“

”جی نہیں۔ کاروبار کے لئے جا رہے ہیں۔“

”کسا کام کرتے ہیں آپ؟“

”مسلم انشورنس کمپنی میں اسکیپر ہوں۔ وہاں ہمیں میجر عاشق حسین سے ملنا ہے۔“

اسی طرح کے دو چار سوال کر کے ٹل گیا اور ہم ملتان کے لئے سواری ہو کر خانوال چلے گئے

خانوال سے گاڑی بدلی اور صبح سویرے ملتان پہنچ گئے۔

### ملتان کا معرکہ

ملتان میں حافظ یار محمد صدر مجلس احرار اسلام کے مکان پر زنیام کیا دو سٹوں نے جلسہ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا کوئی چار بجے شام احرار کا مقامی سالار لال دین عاصی بھی شریک راز ہو گیا ایک اور نوجوان جو میسراداتی دوست تھا ڈھونڈتے ڈھانڈنے حافظ جی کے مکان پر آ نکلا۔ صلاح یہ پٹھری کہ اتنا بے تقریر میں کسی نہ کسی بہانے نے مجھے نکل جانا چاہیے جلسہ حسین آگاہی میں ہو رہا تھا ایٹھ حافظ جی کے مکان کے پہلو میں بنایا گیا۔ طے یہ کیا کہ تقریر ختم کرنے سے پہلے کسی کتاب کا حوالہ دوں پھر کتاب لانے کا بہانہ کر کے حافظ جی کے مکان میں چلا جاؤں اور وہاں عفتی دروازے سے نکل جاؤں۔ میرے دوست کا اپنا موٹر تھا اُس نے کہا میں خود ڈرائیو کروں گا اور اس طرح ہم راتوں رات لاہور پہنچ جائیں گے ذبیح صدر جلسہ قرار پائے کیونکہ ملتان اہباب پولیس کے

تیور دیکھ کر مدارت کرنے سے گھرا رہے تھے۔

### بہیمانہ تشدد

لال الدین عاصی پولیس کا دوست نکلا اُس نے حرم دروازے کے تھانیدار لیکھراج کو تمام کوالٹ سے آگاہ کر دیا حافظ جی کا مکان بھول بھلبلاں سے کم نہ تھا نماز عشاء کے بعد جلسہ شروع ہوا پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ حاضری تھی مکانوں کی پھتوں پر لوگ ہی لوگ اور پھتوں کے پیچھے عورتیں ہی عورتیں پولیس ٹاک میں تھی لیکن بس ایک تسمانی دروازے سے ایٹیج پر آگیا ٹیل ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ٹون ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ایون سٹی انسپکٹر اور لیکھ راج سب انسپکٹر پولیس کی بھاری جمعیت نے کر جلسہ گاہ میں موجود نھے چاروں طرف سے جلسہ گھرا ہوا تھا مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہاں سے بھاگنا مشکل ہے گرفتاری ہو کے رہے گی۔ لال دین عاصی نے پولیس کو لپکا کر دیا تھا چنانچہ حافظ جی کے مکان کا صدر عفتی اور تسمانی دروازہ پولیس کے قبضہ میں تھا ایٹیج کے پیچھے میری نشست سے ایک گز کے ماصلہ پر پولیس کے قدا اور جوان لمبی لمبی ڈانگیں لئے کھڑے تھے۔

تقریر نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی میں میان کر رہا تھا کہ جاپان نے منچوریا کی سرحد پر انگریز عورتوں کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے اگر وہ بدسلوکی یا اس کا عشر عشر مجاز و ایران یا ترکی و ہندوستان میں ہوتا تو برطانوی سامراج اپنی تاریخی روایتوں کے مطابق بسنیوں کی بستیاں مچونک دیتا لیکن جاپان کے سامنے چوں تک نہیں کی کیوں کہ وہ ایک مقابل کی طاقت ہے اور اسی کا نام ہے جسکی لاٹھی اس کی بھینس بس پھر کیا تھا ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جمع کو منتشر ہونے کا حکم دینے بغیر اٹون اور ایون کو لاٹھی چارج کا اشارہ کیا پھر جو بتی فلم بیان کرنے سے قاصر ہے چاروں طرف سے عوام کو مار پڑنے لگی لوگ جوتے پگڑیاں اور ٹوئیاں چھوڑ کر بھاگ اٹھے ذبیح ایٹیج کے نیچے چھپ گیا ایون باولے کتے کی

طرح بھونکتا اور مارتا رہا میں اسٹیج ہی پر کھڑا رہا اس وقت بھاگنا جو انروہی کے خلاف تھا اور نہ کوئی فرار کا راستہ ہی تھا میں نے پولیس کو لکھا کر کہا: لوگوں کو نہ ماریتے میں حاضر ہوں مجھے یکڑیے اور تکابوٹی کر ڈالنے ایون لوگوں کو ڈنڈے اور ٹھڈے مارنا ہوا حافظ جی کے مکان تک چلا گیا پتلیا: اوسور کا بچہ حافظ کدھر ہے نکلو اندر سے عورتوں نے قفل چڑھا لیا جن دوستوں نے ڈٹ کر مار کھائی ان میں مظفر گڑھ کے ایک بزرگ فاضی محمد مسعود انصاری اور دوسرے ملتان کے سید عبدالوہاب شاہ تھے۔ باقی تمام لوگ بھاگ نکلے۔ ٹیل جمع کو حیرتا پھاڑتا اسٹیج تک پہنچا مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے گرایا۔ نے سخاشا سید مارے، بے اندازہ ٹھڈے لگائے دو چار دفعہ اٹھا کر بیٹھا ایک تھا نیدار کو حکم دیا کہ اسے الٹی تھکڑی لگا دو پندرہ منٹ تک بیدوں اور تھپڑوں کی مشق کرتا رہا ایک رخسار پر دھول، دوسرے پر دھپا سہم پر بید گھٹنوں پر ٹھڈے، میں دو دفعہ بے ہوش ہو کر گر آیا مکان کے اندر سے عورتوں نے سسکیاں بھرنی شروع کیں ایون کا پارہ چڑھ گیا واہی تباہی بکنے لگا۔ غرض جادوں طرف پولیس کا غلغلہ تھا۔ میرا چپن پھٹ کر نازنا رہ گیا۔ قیص کے کئی ٹکڑے ہو گئے پھر مجھے سڑک پر دوڑ تک گھسیٹا گیا سر کی ٹوپی اور پاؤں کا جوتا دونوں غائب ہو گئے، ایک چھتہ دار کنسٹیبل بار بار اپنے وحشیانہ گھونے جاتا رہا۔ ایک اسپینٹ سب انسپکٹر نے جو نظر بہ ظاہر مسلمان ہی تھا اسے ٹوکا اور روکا بھلے مانس انگریزوں کے گھر میں تو آگ لگی ہے تم بیویں مارتے ہو چھتہ دار باز نہ آیا پتیا رہا اور کستار ہا بڑے آئے مولوی صاحب داڑھی نہ موچھ قرآن سناتے ہو کہاں لکھا ہے وقت کے حاکم کی نافرمانی کرو اور دے گھونے پہ گھونسہ ایون عورتوں کو گالیاں دے کر پلٹا تو میرے گرد ہو گیا کنسٹیبل اور بھی تیز ہوا اس شریف زادے نے وہ گالیاں بکیں کہ پناہ سجدا ماں بہن بیٹی کی فحش اور ناش گالیاں لوگ اپنے اپنے مکانوں میں بتیاں گل کتے دم بخود بیٹھے تھے اکیلا میں ہی تھا جو اس بہیت کے ہتھے چڑھا ہوا تھا آخر گھسیٹ گھاٹ کے مجھے حرم دروازے کے تھانے میں لے گئے اسپینٹ سب انسپکٹر

نے مجھے سرگوشی کے انداز میں کہا جیب میں کوئی چیز ہو تو مجھے دید و ایک ذاتی خط اور کچھ روپے میرے پاس تھے۔ میں نے اس نیک سرشت انسان کے حوالے کئے۔ اُس نے حوالات کھلوائی اور اراٹون ڈوبن کے آنے سے پہلے مقفل کر دیا تھوڑی دیر بعد وہ لوگ بھی آگئے۔ مجھے دفتر میں طلب کیا میرا جسم اُس وقت زخموں سے چور ہو رہا تھا۔ ٹیل نے کہا۔ — ”مجھے پہچانتے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”پہچانو۔ سور کا بچہ۔“

پہچ و تاب کھا کر خاموش ہو رہا حافظہ پر زور دیا تو یاد آگیا کہ ٹیل ہے جس نے شہید گنج کی تحریک میں مجھے ڈھالی سال قید کما تھا اور وہاں میں نے عدالت میں نعرے لگائے تھے تو سپرنٹنڈنٹ جیل کو بدلگانے کے لئے لکھا تھا میں نے کہا۔

آپ کا نام ٹیل (TAIL) ہے۔

”ٹیل (TAIL) انگریزی میں دم کو کہتے ہیں اُس کا نام TEAL تھا“

”گورنر“ ایون نے کہا۔

”حرام زادہ ماننا نہیں مسٹر ٹیل (TEAL) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں“ ٹیل کی طرح اراٹون

بھی اینگلو انڈین صاحبہ ایون گورہ تھا اس زمانے کا طمانچہ مارا کہ میں بلبل اُٹھا اراٹون نے کہا۔

”ادھر بڑا نرمی ہے یہ حرام زادہ کسی اور ملک میں ہوتا تو گولی سے اڑا دیا جاتا۔“

ایک بھاری بھر کم تھا نیدار جس کا نام غالباً صالح محمد تھا لیکن چہرہ کسی سور سے مشابہ تھا بھنا کر

اُٹھا دوپار کے میری کنپٹی پر جھائے کنٹیل سے کہا اس کا پاجامہ اُتار دو اور جوتے لگاؤ میں نے مزاحمت

کی ایون نے میرا دایاں ہاتھ اپنی کرسی نلے دبا دیا میری چمخیں نکل گئیں سب کھکھلا اُٹھے ٹیل نے

کہا؛ معلوم ہوا سور کا بچہ تقریر کا مزہ صالح محمد نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسوا دیا چار بد نہاد سپاہیوں

نے مجھے ہٹا کر افسانہ بند کھلادیا۔ صالح محمد میرے سر کو فرش پر پختہ کر دیا۔ لیکر راج پوتھوں پر جوتے لٹا کر میں سچیں منٹ یہ شغل جاری رہا جب ان کی طبیعت سیر ہو گئی تو خالی حوالت میں بند کر دیا چٹائی نہ کھیل کرے میں التزائم شباب کا پھر کا ذکر آیا گیا جس سے دماغ بھٹا جا رہا تھا جسم ضربوں سے نہ مل تھا نیند آ ہی گئی۔ رات دو ڈھائی بجے کا عمل ہو گا کہ پہرہ کنٹیل نے جگا دیا مولانا طر علی خان کے خادم حافظ محمد یعقوب بڑے ہی دل شکستہ کھڑے تھے۔ کہنے لگے :

”ہم نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سخت دکھ ہوا ہے فرس پر

ننگے پڑے ہو میری جاوڑے نو“

چوری کی ملاقات میں یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے شکر بردا کیا۔

کنٹیل ہندو تھا اس کا حوصلہ تھا کہ اُس نے حافظ جی کو ملاقات کا موقع دیا حافظ جی نے

کہا۔ کسی کے نام کوئی پیغام دینا ہو تو میں صبح لاہور جا رہا ہوں۔

”کوئی پیغام نہیں مولانا سے سلام کہتے گا اور گھر میں ابا جی کو خیر خیریت پہنچا دیجئے“ کنٹیل

بولتا خیریت کیسی؟ گھر میں کھلا بھیجو کہ پولیس افسیروں پر مقدمہ کریں انہیں مارنے کا کوئی حق نہ تھا۔“

میں چپ ہو رہا آنکھیں بھیگ گئیں۔ کنٹیل نے کئی سوال کر ڈالے مثلاً والدین زندہ ہیں؟

کاروبار کیا ہے؟ لواحقین مضبوط ہیں؟ وغیرہ۔

### ملتان کا ضمیر

ملتان کا ضمیر ہی سرکاری رہا ہے کاسہ لیبی کے اس پشتینی مرکز سے کیا توقع ہو سکتی تھی؟

اپنی بے بسی کا مجھے پورا پورا احساس تھا مسلمانوں میں جان نہ تھی وہ من حیث الجماعت بتوعل تھے

احرار مقامی طور پر کمزور تھے۔ کانگریس کے دولت مند رہنما ضلعی افسروں کی مٹھی میں تھے چنانچہ

سورتمقامی ایڈوکیٹ منشی ہری لال جو صلح کانگریس کمیٹی کے صدر بھی تھے اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی تھامی  
شان کے انچارج بھی اس واقعہ کو گول کر گئے انہوں نے ڈپٹی کمشنر مسٹر ہنڈرسن کے اشارے پر  
جبر تک روک لی رہا مسلمان پریس تو وہ سرکار کا تابع تھا۔ ”ٹریبون“ لاہور بھی خبر کو ڈکار گیا مقامی  
نامہ نگار پولیس کی جیسی گھڑی نکلے نتیجتاً پولیس نے اگلے روز ان تمام دوستوں کو پکڑ لیا جنہوں نے اسکے  
خدا میں مجھے بلایا اور ٹھہرایا تھا حافظ یار محمد۔ قاضی محمد مسعود انصاری۔ سید عبدالوہاب شاہ۔ سید ولایت شاہ  
یتیم اقبال احمد یہ سب مجھے بلانے اور ٹھہرانے کے الزام میں پکڑے گئے۔ اقبال پر جلسہ کے منظم  
ہونے کا الزام لگا اور یہ سب لال دین عاصی کی برکات حسنہ کا نتیجہ تھا جو لکھنؤ سب انسپکٹر کو مطلع  
کرایا تھا۔ میری گرفتاری کے بعد صلح بھر میں تشدد شروع ہو گیا۔ سوشلسٹ، احرار، کانگریس کے  
جتنے بھی سیاسی کارکن ہو سکتے تھے گرفتار ہونے لگے پوریوالہ کے مولانا شیخ احمد میاں چنوں کے  
ملوئی ہدایت اللہ۔ جہانناں کے کامر ٹیڈی عطا اللہ گرفتار ہو کر آئے ملک عبدالغفور، انوری احرار اور کانگریس  
دونوں کے حرا سیکرٹری تھے انہیں بھی کسی تقریر میں مانوڈ کر لیا گیا۔ لالپور سے کامر ٹیڈی کلیرنگ کے گرفتار  
کر کے لایا گیا۔ آپ شہد وطن بھگت سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ٹیکارام سخن کو لاہور سے لایا گیا  
رنجیت سنگھ متانہ پہلے آپکے تھے حکیم مناسنگھ گوجرہ سے پکڑے گئے۔ غرض جنگل میں منگول ہو گیا۔  
مناسنگھ ٹراہی بہادر ساٹھی تھامیں اُس سے بالکل ناواقف تھا۔ اُس نے پولیس کے مظالم سنے تو  
اسٹیشن سے لے کر صلح کچہری اور صلح کچہری سے لے کر جیل خانے کے دروازے تک شورش کا شمیری  
زندہ باد پکارتا رہا۔ پنجابی کا زبردست شاعر اور خوش آواز تھا۔ انقلابی نظمیں پڑھتا اور شورش  
زندہ باد کہتا ہوا جیل پہنچا بڑا قد اور انتہائی خوش فطرت انسان تھا۔ بھگت سنگھ کی ماں کا نوحہ کے عنوان  
سے اُس نے ایک طویل پنجابی نظم لکھی تھی اپنی درد بھری آواز میں پڑھتا تو دل دہل جاتے اُس کی  
اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اُسے یاد کر کے عموماً پریشان ہو جاتا دو سال کی سزا ہوتی پھر کسی جیل میں



حکام کی تقریبوں کے خلاف بھوک ہڑتال کی وہاں کسی مرض کا شکار ہو کر چٹا کا شعلہ ہو گیا۔  
 انہیں ذبح جلسہ کی ویرانی کے وقت ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ ننان سے بھاگے تو کار میں چھو کر  
 منگھری پلے گئے۔ وہاں سے لاہور، لاہور سے دہلی۔ دلی سے پھر لاہور۔ آخر انہوں ہی کی منگھری سے  
 کپڑے گئے اور دو سال کی سزا ہو گئی۔

اس قسم کی تحریکوں میں کم ہی لوگ حوصلہ کا ثبوت دیتے ہیں، میزبان نے گلا لیا کہ ہم لوگ ننان  
 پہنچ کر اس کی مصیبت کا باعث بنے ہیں، انہوں نے ملک عزت بخش کو اپنا وکیل کیا مقامی کارکنوں  
 کی طرف سے منشی ہری لال پیش ہوئے، مقدمہ شروع ہوا تو عدالت نے تمام ملزموں کی طرف سے  
 منشی ہری لال کا نام ایڈووکیٹ کے طور پر لکھا، منشی جی نے فوراً ہی تصحیح کرادی کہ میں شورش کی  
 طرف سے وکیل نہیں۔ یہی بات دوسرے وکلاء نے کہی جو مفت یا فیس پر آئے تھے میں نے دونوں  
 کے ملقے سے نکل کر عدالت سے کہا مجھے اس مقدمہ میں اپنے بیان کے سوا اور کچھ نہیں کہنا۔ میرا  
 کوئی وکیل نہیں نہ میں نے کسی وکیل کو بلا یا ہے۔ نہ میں ان کی اعانت چاہتا ہوں۔ یہ لوگ فیس لیکر  
 آئے اور اپنی مرضی کے مختار ہیں میں نے بلاشبہ لوگوں کو حصول آزادی کی دعوت دی ہے۔ غلامی کی  
 زنجیریں توڑنا اور آزادی چاہنا ہمارا قومی فرض ہے مقدمہ کی کارروائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ  
 اس میں کوئی حصہ لوں گا میں پولیس کے تشدد سے منجمل ہوں، کھڑا نہیں ہو سکتا بیٹھنا چاہتا ہوں یہ کہہ کر  
 خود ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور بے نیازی سے کتاب پڑھنے لگا۔

منشی ہری لال اپنا سامنہ لے کر رہ گئے دوسرے وکیلوں کو بھی شرم سی آگئی عدالت نے میرا  
 مقدمہ ہی الگ کر دیا۔ مجھے منگھری کے وارنٹوں کی بنا پر گرفتار کیا گیا تھا لیکن جب مجھے بُری طرح  
 زخمی پایا اور پولیس کو خوف محسوس ہوا مبادا باہر جانے سے کوئی احتجاج پیدا ہو تو آپس میں صلاح مشورہ  
 کر کے ننان میں بھی ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت مقدمہ چلانے کا فیصلہ کر لیا۔

ناخدا جن کا نہ ہوان کا خدا ہوتا ہے ————— الشکی قدرت دیکھئے کہ دوسرے یا تیسرے  
 ررزٹل (اے ڈی ایم) اراٹون (ڈی۔ ایس پی) اور ایون (انسپیکٹر پولیس) فوج میں واپس بلائے گئے  
 بہینوں جنگ عظیم میں فوج کے ملازم رہے تھے۔ ٹیل کا جانشین سنت رام مینی تھا کچھ دنوں بعد  
 اُس نے بتایا کہ جس جہاز سے وہ جا رہے تھے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور وہ تینوں ملاک ہو گئے ہیں۔  
 یہی کے اپنے الفاظ میں یہ خدا کی بے آواز لاطھی کا انتقام تھا۔ سنت رام تھا تو اے ڈی ایم۔  
 اور کچھ ترش رو بھی لیکن اس کے اندر ایک انسان ضرور تھا۔ وہ میری مدد کرنا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا  
 ڈپٹی کمشنر ہڈرسن بڑا باؤلا تھا مینی اس سے ڈرنا تھا مقدمہ چلاتا تھا ستغاثہ کے سبھی گواہ سجدہ اللہ مسلمان  
 تھے ہر ایک نے ڈٹ کر بھوٹ بولا بچ بھی بولا لیکن تکلفاً ان میں اٹھارہ انیس سال کا ایک خوش شکل  
 نوجوان بھی تھا میں نے اُس کے شاعرانہ چہرے ہرے پر طنز کیا تو بھٹنا اٹھا، اُس نے بیان دیتے  
 ہوئے کہا کہ پولیس نے کوئی نشہ نہیں کیا، یہ ایک ایسا بھوٹ تھا جو اُس دن کا سب سے بڑا بھوٹ  
 تھا خود اے ڈی ایم کے جہرے یہ خندہ استہزاء آگیا میں نے کرسی سے اٹھ کر دو چار لطیف سے  
 سوال کئے ————— وہ شرمایا گیا۔ عدالت نے بھی اس کا لطف لیا۔

ہر پستی پر عدالت کو لکھنا پڑتا کہ منزم کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا اور مقدمہ میں کوئی حصہ  
 نہیں لے رہا ہے میں جان بوجھ کر اس فم کارویہ اختیار کرتا جس سے عدالت کو یہ احساس ہو کہ مجھے مقدمہ سے  
 کوئی دلچسپی نہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اسکی ذرہ بھر پرہ نہیں ہے۔ ایک مرحلہ میں گواہوں کے بھوٹ سے  
 چڑ کر خود عدالت نے منشی ہری لال سے کہا کہ اس پر جرح کرو۔ منشی ہری لال کئی کترا گئے۔

لال پور میں

یہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ لال پور سے بھی ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے وارنٹ آگئے

پنہا گئے۔ مذبح کے پتھر بھی دیا گیا وہاں پہنچا تو بہت سے احوار رضا کار گرفتار ہو چکے تھے شاہ جی کے معتمد حکیم غوث محمد ہام پوری بھی تانڈلیا نوالہ کی کسی تقریر میں پکڑے ہوئے موجود تھے ایک خوش رو سکے نوجوان رنام یاد نہیں آ رہا، مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا میں نے بغیر کاروائی اعتراف جرم کر لیا۔ مجسٹریٹ نے کہا۔ اس وقت مقدمہ کی فائل میرے سامنے نہیں، نہ استغاثہ کے گواہ آتے ہیں، کل سماعت ہوگی مجھے مقامی جیل بھیج دیا گیا مسعود انقلابی نوجوان محرک ہیں نظر بند تھے وہ خیالات کے اعتبار سے سوشلسٹ تھے اگلے روز مقدمات شروع ہو گئے سب سے پہلے حکیم غوث محمد کو بلا یا گیا انہوں نے عدالت سے کہا کہ میں نے برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کو واقعی حیران اور غلاف اسلام قرار دیا ہے میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ جب تک میرا ملک آزاد نہیں ہوگا میں انگریزوں کی جنگ کو اپنی جنگ نہیں کہہ سکتا اور نہ یہ میری جنگ ہی ہے عدالت نے حکیم صاحب کو دو سال قید با مشقت کا حکم دیا رضا کاروں میں سے دو نے معافی مانگ لی کہنے لگے ہم نے حکومت کے خلاف کچھ نہیں کہا، ہم نے صرف یہ کہا تھا یعنی اے نہ لین دینی اے (نہ لین دینی ہے نہ لینے دینی ہے) عدالت میں زبردست قہقہہ بڑا۔ کورٹ انکپٹ لے کہا ان کی مراد اس سے فوجی بھرتی تھی۔ مجسٹریٹ نے مجھے کہا انہیں سمجھاؤ۔ معافی نہ مانگیں تحریک شروع ہوتی ہے۔ ابتدا خراب ہو گئی تو جماعت کی عزت اور تحریک کی ہمت کو نقصان پہنچے گا میں ایسا فیصلہ لکھے دیتا ہوں جو اپیل پر ان کی رہائی کا باعث ہوگا میں نے بہتیرا سمجھایا۔ تانڈلیا نوالہ کے جانگلو تھے نہ مانے سیاسی شعور تھا نہیں شاہ جی کے عشق میں نعرے لگا کر گرفتار ہو گئے تھے مجسٹریٹ نے فیصلہ میں لکھا کہ معافی مانگنے سے جرم ہلکا نہیں ہوتا اس قسم کے لوگ پہلے قانون شکنی کر کے نفاذ کو مکر کرتے پھر معافی مانگنے لگتے ہیں اس معافی نامہ کو قبول نہیں کرتا عین سالی قید با مشقت دو سو روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ مزید چھ ماہ قید! — میرا مقدمہ سنا میں نے مجسٹریٹ کو تسلیم کیا۔ مجسٹریٹ نے مختصر سا فیصلہ لکھا کہ طرہ نے اقرار جرم کیا ہے۔ اس کے نزدیک تقریر کا پیش کردہ

مقتن رپورٹر کی معمولی غلطیوں سے قطع نظر معافی و مطالب کے لحاظ سے درست ہے۔ اس نے اپنا اس فعل کو جب موقع سے تعبیر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں غلامی کی زنجیریں توڑنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور وطن کا مجھ پر حق ہے کہ میں اس کی فریاد سنوں اور انگریزی حکومت کی موجودہ مشکلات سے فائدہ اٹھاؤں ملزم کو دو سال قید با مشقت کا حکم دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔!

”اپنی مزدور کرنا آپ بری ہو سکتے ہیں۔“

یہ اس کے رخصتی الفاظ تھے۔ لائل پور میں ان دنوں کوئی ہندو یا سکھ سیشن جج تھا اس کا نام رحمان یہ تھا کہ جو اپیل کرتا اسے چھوڑ دینا دوستوں نے اصرار کیا مختار نامہ لے کر آگئے لیکن میں نے اپیل کو جماعتی قبیلہ کے خلاف سمجھا اپنے متوقف پر ڈٹا یا ان حالات میں جب کہ ہم خود سول نا فرمانی کر رہے تھے اپیل کرنا اصولاً ٹھیک نہ تھا۔ چنانچہ باقاعدہ فیڈری ہو کر میں ملتان واپس ہو گیا۔

### لاہور میں

ملتان پہنچا تو لاہور کا بلاوا موجود تھا لاہور میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو جلسہ عام میں پٹینے کا مقدمہ چل رہا تھا یہ مقدمہ درست تھا لیکن مجھے خواہ مخواہ پھنسا لیا تھا یہ بھی پولیس کا ایک کارنامہ تھا واقعہ یہ تھا کہ امرتسر کے ضمنی انتخاب میں یونیونٹ امیدوار تیج صادق حسن کے مقابلہ میں چودہری افضل حق کھڑے تھے۔ سردار سکندر حیات کی شہ پر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو نے جو ہندو ماہی سبھائی ذہنیت کے کانگریسی تھے ڈاکٹر کچلو کو کھڑا کر دیا۔ اس طرح حریت پسندوں کے ووٹ تقسیم ہوتے تھے نتیجتاً یونیونٹ امیدوار کی کامیابی کے امکانات روشن ہو گئے احمد رضا کاروں کو اپنے طور پر غصہ آیا انہوں نے موری ہوا ذراہ کے باہر کانگریس کا جلسہ عام الٹ ڈال ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو پٹیا سکندر حیات نے پولیس کو حکم دیکر مقدمہ درج کروا دیا پولیس نے میرا نام بلاوجہ طوٹ کر لیا مقصود یہ تھا کہ مجھے کسی مرحلہ میں صوبائی ایوزیشن کی حمایت حاصل

دہلی کے ہر شہری ملتان میں ہوتی ہے اس کا ٹوٹا ڈلیا جاتے یہ چیز بھی میری قید و بند کو سنگین بنانے کا باعث ہوئی اصل واقعہ یہ تھا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو رضا کاروں کے چنگل سے چھڑایا تھا میں نہ ہوتا تو وہ مارے جاتے یا شاید زخمی ہوتے انہوں نے اس کا اعتراف خود مولانا حبیب الرحمن سے کیا عدالت میں کبھی ذمے لگے بھیجا کہ اس مقدمہ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے پولیس نے یہ مقدمہ خود درج کیا ہے شورش کشمیری کامیری پٹانی سے کوئی واسطہ نہیں تاہم وزارت نے جو شوشہ چھڑایا تھا کامیاب رہا تمام اجراء کانگریس کے چھوٹے بڑے راہنماؤں کی اخلاقی اعانت سے محروم ہو گئے صوبہ کے کانگریسی لیڈر اجراء کو حکم کھلا فرقہ پرست کتنے ان کا نظریہ تھا کہ مجلس اجراء ہی مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے جو برطانوی حکومت اور ہندو نیشنلزم دونوں سے دست و گریبان رہتی ہے۔ یونی نسل وزارت کو اجراء پر ظلم کرنے کا کھلا موقع ہاتھ آ گیا دو پارلیڈروں کو چھوڑ کر تمام اجراء سی کلاس اور قید تنہائی میں رکھے گئے اور اخلاقی قیدیوں سے بھی بدزسلوک کیا گیا۔

لاہور کے سفر سے مجھے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ عزیزوں سے ملاقات ہو گئی۔ عبداللہ ملک منہ اندھیرے پلیٹ فارم پر موجود تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے فدائی اور جگری دوست تھے سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کے والد سید عنایت شاہ اخلاص کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ میں نے پولیس کو راضی کیا اور انکے مکان محلہ دارالاشکوہ میں جا پہنچا ابھی سو رہے تھے انہیں جگوا یا حیران رہ گئے تو واضح کی وہاں سے ہمیشہ کے ہاں گیا عزیزوں سے ملا پیسہ اخبار کے تھانے میں کچھری کے وقت تک قیام کیا کچھری میں دوستوں کا جگمگا رہا۔ عبداللہ ملک نے دوستوں کو خبر کر دی دن بھر چل پھل رہی شام کی گاڑی سے واپس ملتان چلا گیا۔

### ملتان واپسی

ملتان ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ شیخ محمد سعید تھے، لالہ دوار کا واس جیلر۔ اور

لالہ پنڈی داس (دھون) سینئر اسٹنٹ سیرنڈنٹ۔ ایک چھوٹی سی بارک تھی جہاں زیادہ سے زیادہ چٹائی  
 رہ سکتے تھے اور ہم دس ساتھی رہ رہے تھے۔ بارک کا حال بھی اچھا نہ تھا یا نہ ہو ایک بوترا شام ہی سے  
 غمر غم کر تے سونے وقت ان کی بیٹھیں ہمارے چروں پر پڑتیں جبکہ سے بارک بدلنے کے لئے کہا  
 وہ شہ ابی کبابی آدمی تھا راب گئے راؤنڈ پر آیا تو ہمارے بعض ساتھیوں سے بھڑ گیا۔ صبح ہوتے ہی  
 ہم نے بڑی بارک کا مطالبہ کیا۔ عطا۔ اللہ ہانپاں کو تر جہاں بنا کر بھیجا جبکہ نے ذرا تیزی دکھائی جہانیاں  
 نے لڑنا مناسب نہ سمجھا چلا آیا ساتھیوں نے سنا تو بھڑک اٹھے ایک ایک جیل والوں سے ٹھن گئی آخر ہم  
 جیت گئے ڈیوڑھی سے قریب ہمیں ایک کھلی بارک مل گئی سوئسٹوں اور کینوسٹوں کی دو پارٹیاں تھیں  
 کلبرنگ سوئسٹ تھے ٹیکارام سخن کبونسٹ دونوں سے تعلق خاطر تھا لیکن کلبرنگ سے واسطہ گرا ہوتا  
 گیا ہم نے ایک شہی سرکل قائم کیا جس میں ٹیکارام سخن نے لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا کئی روز اس سوال  
 بحث سوتی رہی کہ آزادی سے متعین مراد کیا ہے؟

رفتہ رفتہ کچھ دوست رہا ہونے لگے حافظ جی سید عبدالوہاب شاہ سید ولایت شاہ اور شیخ اقبال احمد  
 مقدمہ کا ناکافی مواد ہونے کے باعث رہا ہو گئے۔ عبدالغفور انوری سال بھر کی سزا پا گئے۔ ٹیکارام سخن  
 رنجت سنگھ متا، ناضی مسعود احمد انصاری مولوی شیخ احمد اور مولوی ہدایت اللہ اپیل کر کے نکل گئے۔  
 ٹیکارام سخن اور رنجت سنگھ متا کل وقتی سیاسی کارکن تھے عمر کا ایک بڑا حصہ جیل ہی میں گذرا تھا۔  
 قید ہونا اور رہا ہونا ان کا روزمرہ تھا۔

خوردانفوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

## اندازِ بیاں اپنا

اب تک خورشید کا ذکر موقوف رہا گجرات کی سزایابی کے بعد خورشید کے خطوط متواتر آتے رہے۔ شروع شروع میں رہا ہوا تو ملاقات کا راستہ کھل گیا۔ یہی ملاقاتیں رفتہ رفتہ شاعری کا عنوان بن گئیں، جس سے حکایتیں نکلیں، کہانیاں اٹھیں داستانیں بنیں، حتیٰ کہ سیاسی شورتس کا مزاج غنزل کا مزاج ہو گیا۔۔۔

درج کے آخری دنوں کا گلابی جاڑا تھا جب ہم شملہ پہاڑی پر ایک دوسرے سے ملے سرخ و سپید رنگ، سرمئی آنکھیں، چہرہ پھول، ہونٹ گلابی، پلکیں گھنی، نکمت و نغمہ کے سانچے میں ڈھلا ہوا نورانی پکیر، جو عمر خیم کے تخیلی افق سے وارث شاہ کے دیس میں اُتر آیا تھا دونوں طرف دس منٹ سکوت رہا چاہا کچھ کہوں کچھ نہ کہہ سکا خلیب اپنے الفاظ کھو بیٹھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میری زندگی میں کسی دو تیزو نے قدم رکھا ناصیہ فرسائی کا حوصلہ دل بناوت آشنا کا ولولہ اور عرض و نیاز کا سلسلہ سب منقطع ہو چکے تھے خورشید نے خود ہی حجاب توڑا اور ہم دیکھتی آنکھوں اس طرح بے تکلف ہو گئے جیسے برسوں سے اکٹھے ہوں صرف تیس منٹ میں ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کا سفر پورا کیا کیسی کیسی تصویریں ابھرتی اور نکلتی گئیں عمد و پیمان کا ایک دفتر تیار ہوتا رہا عرض اس پہلی ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ شملہ پہاڑی نور جہان کا مزار، جہانگیر کا مقبرہ، شالیار باغ، لارنس گارڈن یہ سب ہماری ملاقاتوں کے راز دار اور پردہ دار ہوتے گئے۔ خورشید کے اجداد کشمیری نسل کے وائیں تھے۔ دادا گجرات میں آباد ہوتے۔ والد لاہور میں تک گئے یہیں دو مکان بنائے جو کراہ پر دے رکھے تھے پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا اولاد صرف دو لڑکیاں تھیں عورشید اور ثریا خورشید نے ادیب عالم کے علاوہ سیکرٹری ڈویژن میں میٹرک کیا اور اب فٹنی فاضل کی تیاری کر رہی تھی کچھ دنوں بعد اُس نے والدہ کو راضی کر لیا اور میری

ن کے ہاں بے لگنی سے آنے جانے لگا۔ اُس کی والدہ مجھے بیٹا کہتی بہن بھتی اور وہ آغا جی ہم اتنی بدی مٹل مل گئے کہ زندگی بسر کرنے میں صرف شرعی فاصلہ رہ گیا اسکی والدہ کا خیال تھا کہ وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائے خورشید بھی یہی چاہتی تھی لیکن زبان سے کیونکر کہتی؟ دل کہہ رہا تھا۔ اس میں ایک دو شبہ کی جیا کا شدید احساس تھا اُس نے گا ہے ماہے بعض بے نظیر خطوط لکھے جو میرے پاس آج بھی محفوظ ہیں وہ نہ ادیب تھی اور نہ اُسکو انشا پر وازی کا ملکہ تھا تاہم ایک انشا پر واز اور ادیب کے آثار کا عکس اس میں ضرور تھا ذوقِ شعر بھی تھا اختر شیرانی اور غالبِ قدیم فریب اسے حفظ تھے ان دو کے علاوہ قدیم و جدید اساتذہ میں شاید ہی کوئی شاعر ہو جس کے تیر و نشتر اس کے حافظہ میں نہ ہوں کسی عورت میں شعر و شاعری کے اعتبار سے اتنا بلند ذوق اور اتنا مضبوط حافظہ میں نے نہیں پایا۔ فی الجملہ اس کا وجود اہلِ بی و لاویزیوں کا مجموعہ تھا اپنے خطوط میں شعر کو اس حسن و خوبی سے کھپاتی جیسے کسی انگوٹھی میں لگینے جڑ دیتے ہوں عام عورتوں کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ میں سیاسی جھنجھٹ سے نکل جاؤں یا کم از کم اس وقت تک حصہ نہ لوں جب تک ہماری زندگی باقاعدہ نہیں ہو جاتی، اُس نے مجھے بہت روکا بلکہ روز کی ملاقاتوں کے باوجود خطوط کا ایک انبار لگا دیا عورت کی فطری حیاء و وقت اس کے ساتھ رہتی ہے وہ کھل کے کبھی کچھ نہ کہتی مگر لکھتی اور لکھتی ہی چلی جاتی۔ اس کے دل میں یہ چاہ بھی تھی کہ سیاسی تحریکیوں میں شریک ہو اور اُس نے کہا بھی کہ شادی کے بعد حصہ لے گی لیکن بہر حال وہ ان مسلمان لڑکیوں ہی کی طرح تھی جنہیں سیاسی تحریکیوں میں حصہ لینے کا مذاق نہ تھا نہ مسلمان عورتیں اس کوچہ سے آشنا تھیں۔ نہ مسلمان عوام اپنی معاشری پابندیوں کے باعث عورتوں کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھے۔ حالت یہ تھی کہ مسلمان مرد تک انقلابی تحریکوں سے بچتے تھے وہ بھلا اپنی عورتوں کو کیونکر اجازت دے سکتے تھے جو عورت یہ قیود توڑتی اُس کا افسانہ ساز زبانوں سے بچنا مشکل تھا خورشید کے لئے ازدواجی زندگی کے بعد شریک جہد ہونا مشکل نہ تھا۔ لیکن حالات کو منظور ہی نہ تھا کہ ہم اکٹھے



خزکیں چنانچہ ابھی یہ سڑے ہی ہو رہے تھے کہ دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا اگر ایک ملائک جنگ  
 نہ چھڑتی تو ممکن تھا کہ میں سیاست ہی سے سبکدوش ہو جاتا اور میری راہ کچھ اور ہوتی کیونکہ خوردشید  
 سے انگ رہنا میرے لئے نامکن ہو رہا تھا۔

جنگ چھڑ گئی۔ میں مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری ہو گیا اگر فتاری لازم تھی خوردشید کا چہرہ پہلے  
 روز ہی اتر گیا۔ اُس نے بہت کچھ کہا سنا۔ منہیں کیں۔ واسطے ڈالے سینکڑوں متن کتے مگر بے سود  
 نیرکمان سے نکل چکا تھا اور میں منتخب شدہ راستہ پر تھا پھر میرے ساتھ جو سلوک ملتان میں ہوا  
 اُس نے خوردشید کو ہلکان کر دیا وہ کھلا اور مرجھا گئی اُس کے خطوں کا ایک تاننا بندہ گیا جب مجھے  
 پانچ سال قید کا حکم ہوا اور فلگرمی سنٹرل جیل بھیجا گیا تو اُس کا دل بیٹھ گیا اس سے پہلے میں اسے دوسرے  
 تیسرے روز چوری ٹھپے ایک آدھ خط لکھ دیتا اور اُس کے دو تین خط مجھے ہر روز مل جاتے تھے مگر اب  
 یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا میرے ذرائع بند ہو گئے اس کے خطوط جیل کے حکام ڈکار جاتے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ  
 حکام کی ایذا رسانیوں سے ٹوٹ گیا ان صدقات کی تاب نہ لا کر وہ ایک آہ نارسا ہو گئی اور یہی غم اُسے  
 کھا گیا وہ اندر ہی اندر گھٹنے لگی موم بتی کی طرح گھپلتی رہی چراغ کی طرح جلتی رہی جیتے جی ایک چتا ہو گئی،  
 میری قید کی طرح اس کی بیماری نے طول کھینچا میں اس صورتحال سے کالملاً بے خبر تھا یہ معلوم تھا کہ وہ  
 بیمار ہے اور اس کا تعلق تھا کہ اس کے خطوط ہر روز ہضم کتے جاتے ہیں مگر قید نام ہی اس بے بسی کا  
 ہے اور میں اس معاملہ میں قطعاً بے بس تھا۔

### میں نے کوئی جرم نہیں کیا

• اواخر دسمبر میں ملتان کا مقدمہ بھی ختم ہو گیا۔ سرکاری گواہیوں نے طوطے کی طرح رڈ مارا۔  
 • بیان کیں۔ کچھ سچ بولا زیادہ جھوٹ۔ عدالت۔

کیا ہے ہمیں نے کہا میں نے کوئی جرم نہیں کیا کیونکہ جرم کا لفظ بجائے خود قبیح ہے۔ میں نے اپنے ملک کی عزت و آبرو کے تحفظ کا مطالبہ کیا اور لوگوں سے یہ کہا ہے کہ وہ ملک کی آزادی کے لئے کمر بستہ ہو جائیں کیونکہ یہ جنگ فیصلہ کن جنگ ہے اسپرینیم اس کے بعد عالم نزع میں ہوگا کمزور قومیں اس وقت بھی خواب غفلت میں پڑی رہیں تو مدۃ العمر ان کی آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا جب تک ہندوستان کی آزادی نسیم نہیں کی جاتی فوج میں بھرتی ہونا قطعی حرام ہے یہ کہنا اگر جرم ہے تو میں واقعی مجرم ہوں ورنہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”آپ کوئی صفائی دینا چاہتے ہیں؟ عدالت نے پوچھا

”صفائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ جو کچھ پیش آیا اور جو کچھ ہونا رہا پھر جو کچھ گواہوں نے کہا

اور جو کچھ سرکار کر رہی ہے اس بارے میں ایک بیان دینا چاہتا ہوں۔۔۔“

اگلے روز بیان شروع ہوا۔ کمرۂ عدالت کھلچ کھلچ بھرا ہوا تھا۔ ملتان کے دوست اور لاہور

کے بعض احباب بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔ میں نے عدالت سے کہا:

”میرا ارادہ تھا کہ ایک تحریری بیان داخل کروں۔ میں نے کچھ حصہ قلمبند بھی کیا ہے۔ آپ اسے

مثل میں شامل کر لیں۔ مطالعہ فرمائیں اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر غور کریں کہ ایک غیر ملکی غلامی

نے ہمیں کہاں تک شرف انسانی سے محروم کر رکھا ہے؟ اس عہد استبداد کا یہ پہلو کس قدر خوفناک ہے

کہ ہماری غلامی کی زنجیریں ڈھالنے کے لئے ہمارے ہی بھائی بندوں کو مقرر کیا گیا ہے یہ شرمناک تماشا

صرف ہندوستان ہی کی سرزمین میں کھیلا جا رہا ہے کہ جو لوگ اپنے ملک کی آزادی چاہتے ہیں ان

کا گلا کاٹنے کے لئے اسی ملک کے باشندوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ پولیس کے سپاہی، استغاثہ کے گولہ

۔ اسکوٹنگ اسکوائر، غور کیجئے یہ کون ہیں؟ ہمارے ہی بھائی بند! آپ انصاف کی کرسی پر میں ملزموں کے

کے ساتھ نہیں؟ عدالت نے ٹوکا کہ اپنے بیان کو مقدمہ کی

شہادتوں تک محدود رکھتے تقریر دیکھتے ہیں نے کہا آپ کے سامنے ہے کہ میں نے مقدمہ کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا وجہ بھی آپ کو معلوم ہیں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عدالت کا ضمیر تسلیم کرتا ہے گا کہ استغاثہ کے گواہوں نے جھوٹ بولا ہے پولیس نے دعاندرلی کی ہے اور یہ ڈرامہ جو یہاں چلایا گیا اس کی بنیاد میں ظلم کے سوا کچھ نہیں میں نے کسی گواہ پر جرح نہیں کی میں جانتا ہوں کہ ان کے ایمان سلب ہو چکے ہیں ان کی محبت و دین ہو گئی ہے ان کی غیرتوں کو قضا چاٹ گئی ہے ان کے ضمائر ساقط ہیں یہ لوگ جھوٹ بولتے رہے میں مسکراتا رہا میرے نزدیک یہ سب پولیس کے طوطے ہیں میں انہیں معاف کرتا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بھی انہیں معاف کر دیں مجھے اُن مسلمان گواہوں کے چہرہ کی شرمندگی پر حیا آتی رہی ہے جو اپنے رب کی قسم کھا کر گواہوں کے کٹھنوں میں جھوٹ بولنے کے لئے کھڑے کئے گئے اور وہ کھڑے ہو گئے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک مسلمان بھائی کے خلاف انگریزی استبداد کی حمایت میں جھوٹ بولا تو میرا سر زحمت سے جھک جاتا ہے میں سوچتا ہوں کہ عشر کے دن وہ اللہ کے روبرو کیا جواب دیں گے؟ کس منہ سے یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ان سرور کائنات کی شفاعت کے طلب گار ہیں جو تمام غلامیوں سے نجات دلانے کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔

”میں ذاتی طور پر اس عدالت کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے اثنائے مقدمہ میں اپنے شریفانہ اخلاق کو قائم رکھا اور ایسی کوئی بات نہ ہونے دی جس سے جانہن کو گلے شکوے کا موقع ملتا۔ البتہ مجھے یہ کہنے کی اجازت ہونی چاہیے کہ آپ سے کہوں کہ اس کرسی کو ملک کی غلامی کے خلاف بطور احتجاج چھوڑ دیں، برطانوی استعمار سے تعاون و اشتراک گناہ ہے اور اس کے خلاف بغاوت و انقلاب ایک قومی فریضہ!“

عدالت نے پھر ٹوکا۔

مجھے احساس ہے کہ عدالت ٹوکنے پر مجبور ہے۔ وہ اسی غرض سے اس کرسی پر بیٹھی ہے۔

میں اس سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے یہ سب کچھ کہہ لینے دے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ریکارڈ ہو جائے۔ ممکن ہے مقدمہ کا یہ فائل آئندہ کسی تاریخ کا حصہ ہو استغاثہ نے جو کچھ کہا ہے اگر ریکارڈ پر وہی رہا تو اس سے تاریخ اُدھوری رہے گی۔ میں اپنے جرم سے مخوف نہیں ہو رہا۔ میں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا ہے۔ میرے اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ پولیس نے جو جھوٹ بولا ہے اس کی تردید کروں اُس نے میرا جرم پیش کر دیا لیکن اپنا جرم پیش نہیں کیا اس سے مُلک گئی اگر وہ ثبوتہ مردانگی رکھتی ہے تو اسے عدالت میں تسلیم کرنا چاہیے تھا کہ اُس نے جلسہ عام میں ظالمانہ تشدد روا رکھا اور حالات میں بہیمانہ سلوک کیا تعجب ہے کہ اُس نے ایک تریف زادی کاروبار دھار لیا ہے۔ اس فقرہ پر پراسیکیوٹنگ انسپکٹر بھڑک اُٹھا جناب یہ تو ہیں آمیز الفاظ ہیں ملزم کو یہ کہنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ عدالت نے پھر ٹوکا۔ میں نے پھر عرض کیا۔

”جناب پولیس کو اپنے معصوم عن العطا ہونے کا کیوں کر یقین ہو گا ہے۔ میرے دوست پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو اتنا سرلیح الحس نہیں ہونا چاہیے۔ کیا وہ ختم ہو جانے والے اقتدار کے زعم میں ایک ایسے انسان کو فریاد کرنے کا حق بھی دینا نہیں چاہتے تو پولیس کے قہر و غضب کا شکار ہوا ہے جس کو عصمت مریم کی دعویدار پولیس نے اس سنگدلی کا نشانہ بنایا کہ موت و حیات کے درمیان برائے نام فاصلہ رہ گیا تھا جناب! جو کچھ پولیس نے بھرے جلسہ میں کیا اور اس کے بعد جو سلوک تھا نہ میں روارکھا اس کی روحانی اور جسمانی ضربیں اتنی حملک میں کہ میں اپنے دل میں پولیس کے لئے کوئی عزت و احترام نہیں رکھتا میں یہی کہوں گا خواہ مجھے اس کے لئے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے جان کوئی چیز نہیں عزت بڑی چیز ہے مجھے افسوس ہے کہ پولیس نے انسان کی عزت کے مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا ہے؟

عدالت کے ریکارڈ پر نہ ہی لیکن آپ نے سنا ہو گا کہ پولیس نے میرے ساتھ کیا کیا جلسہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا لٹھے بند پولیس نے ہر طرف سے ناکہ بندی کر لی اراٹون، ایون اور ٹیل نے

انتہاء کے بغیر نختہ حوام پر اس طرح حملہ کر دیا جس طرح دشمن غیر ملکیوں پر چڑھ دیتا ہے حوام کو بڑی طرح بے عزت کیا گیا ہزاروں مادی اپنے جوتے اور گڑیاں پھوڑ کر بھاگ نکلے مجھے ایسیج سے کینج کر زمین پر گرالیا اتنا پٹیا کہ پناہ بخدا ڈنڈے، ٹٹے، ٹھڈے، گھونے، طمانچے، گالین، بعض کنسیبل مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے چیل بھینا مار رہی ہو ایون ہلکایا ہو گیا۔ لوگوں کو پیٹ کر پٹا تو مجھے پیٹنے لگتا چھڑی اور ہاتھ کے کرنب دکھاتا رہا ایک رخسار پر چھڑی مارتا دوسرے پر طمانچہ۔ حرم دروازے کے تھانہ میں اس کا یہ ظلم انتہا کو پہنچ گیا۔ اراٹون، ٹیل اور ایون، ان تینوں نے حوالات سے نکلوایا اور حکم دیا کہ اٹاٹا دو مشنڈے کنسیبلوں نے مجھے فرسش پر پٹخا ایک نے ازار بند کھول ڈالا ڈونے بازو دبائے، لیکھ راج سب انسپٹر اور صالح محمد (نام صحیح یاد نہیں آ رہا) سب انسپٹر نے چوڑوں پر جوتے مارنا شروع کئے یہ تماشا کوئی آدھ گھنٹہ تک رہا آخر جب میں حواس کھو بیٹھا تو مجھے اٹھا کر حوالات کے ایک علیحدہ حصہ میں بند کر دیا گیا جہاں فرسش پر پیشاب کا پھرا کا ذکر دیا گیا اور چٹائی نکال لی گئی تھی۔ ادھر میں یہ بیان دے رہا تھا ادھر دوستوں کے چہرے اٹسکبار تھے میں نے جلسہ میں کہا تھا کہ میری بہن کی شادی میں ہفتہ عشرہ باقی ہے میں گھر سے نکلا تو اسکو صدمہ ہوا۔ اُس نے کہا ”کہاں جا رہے ہو بھیا؟ میں نے کہا ”جیل خانے“۔

مغموم ہو گئی پھر ایک لفظ توقف کے بعد کہا تو اب اُس وقت انا جب انگریز جا چکا ہوں ملک آنا ہو گیا ہو یہ اُسے دن کا آنا جانا ٹھیک نہیں“

میرے یہ لفظ ایون کے کان میں پڑ چکے تھے اُس نے اپنے قہر و غضب کو مار پٹائی میں ڈھالتے ہوتے کہا

”حرام زادہ! ہم ادھر تھا نے میں تمہاری بہن کو بلانے گا۔ ننگا کر کے اس کی فرج پر بید لگائے گا۔“ میں بیان کر رہا تھا کہ لالہ سنت رام مینی (اے ڈی ایم) کی آنکھوں میں بھی نمی آگئی لیکن

نوٹا ہی منجھل گیا کورٹ انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا اُس نے روکا کہ یہ تو واقعہ ہے ملزم کے ساتھ یقیناً تشدد ہوا ہے اور جب میں بیان دے چکا تو عدالت میں دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ بہت سے دوست ابدیدہ تھے۔ آخری الفاظ یہ تھے۔

"جناب مجھے ان زبرہ گہ از واقعات کے باوجود کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ ہر شخص اپنا فرض پورا کر رہا ہے کوئی ضمیمہ کے تقاضے پر کوئی پیٹ کے تقاضے پر غور

سبو ایٹا اپنا ہے جام اپنا اپنا

تاہم اس عدالت سے یہ کہنے کی دوبارہ اجازت چاہتا ہوں کہ آئیے ہم سب مل کر ملک کی آزادی کے مطالبہ میں شریک ہو جائیں۔ آپ کا قلم جو میری سزایابی کا فیصلہ لکھے گا انگریزی استعمار کی تقویت کا باعث ہوگا اس کو توڑ دیجئے یہ پتھکڑی جو میں نے پہن رکھی ہے آپ سے قومی جدوجہد میں شریک ہونے کا مطالبہ کرتی ہے اور اگر کورٹ انسپکٹر قانونوں سے پردے ہٹادیں تو اسکی آواز اُن کے دل میں بھی اتر سکتی ہے برطانوی امپیریلزم کی ناو میں سوراخ کرنا آج انسانیت عظمیٰ کی سب سے بڑی خدمت ہے تاریخ نے جو کمر وٹالی ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ ظالموں کا یوم حساب قریب آ گیا ہے میرا خیال تھا کہ پی ڈی ایس پی یا کورٹ انسپکٹر پولیس کے مجرمانہ فعل پر اظہار افسوس کریں گے عدالت میں نہ سہی پرائیویٹ طور پر، لیکن افسوس ہے کہ وہ پولیس کی چنگیزیت کے مدافع بن گئے ہیں حالانکہ پولیس کا یہ فعل ایک ظالم کے انجام کی آخری شکل ہے اور قانون انصاف کے چہرے کی کالک۔ میں معاف کرتا ہوں۔ ان تمام کانسٹیبلوں کو جنہوں نے کلمہ پڑھ کر مجھے زد و کوب کیا۔ میں معاف کرتا ہوں صالح محمد تھانیدار کو جس نے اپنے نام کو رسوا کیا۔ میں معاف کرتا ہوں لیکچرار جی کو جس نے سرک کا اینڈ من بنا منظور کیا۔ رہ گئے ایون، اراٹون اور ٹیل، تو اُن کی حادثاتی موت ان لوگوں کے لئے تازیانہ عبرت ہے جو ظلم کے انجام سے بے خبر ہیں جن کی ماؤں نے انہیں برطانوی استعمار کے لئے پیدا کیا ہے جو

انگریزوں کی شہزادی کے کل پرنسے ہیں۔

میں تیلیٹ کے ان فرزندوں یعنی ایون، اراٹون اور ٹیل کا معاملہ خدا کے سپرد کتابوں کہ وہ حکم الحاکمین ہے میں اس کٹرے میں کھڑا ہوں وہ خدا کے کٹرے میں چلے گئے ہیں۔ آپ میرا فیصلہ کیجئے۔ خدا اپنا فیصلہ لکھوار رہا ہے بلکہ لکھوار چکا ہے وہ تمام فریب جن کے نشانات میرے جسم پر موجود ہیں اس حکومت کے ثبوت کی یخ ثابت ہوں گے اور جن لوگوں کو اپنی غلامی پر فخر ہے وہ اب دن عوام کے انقلاب کی زد میں ہوں گے تب انہیں معلوم ہو گا کہ وہ آنے والی صبح کے باغی تھے اور ایک سٹ جانوالی رات کے پرستار۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ مبری آنکھیں دیکھ رہی ہیں انقلاب اپنی پوری تابانوں کے ساتھ آ رہا ہے جنگ کوئی جیتے ملک آزاد ہو کر رہے گا۔

انقلاب زندہ باد

### پانچ سال قید

بیان ختم ہو چکا تو مسٹر مینی نے تین سال قید بامشقت کا حکم سنایا۔ دو سال کی سزا لاپور سے ہو چکی تھی کل پانچ سال۔۔۔۔۔ مجسٹریٹ نے فیصلہ میں لکھا کہ ملزم نے عدالت کے روبرو اپنے باغی خیالات کا اظہار کیا ہے لہذا پانچ سال قید اس کے جرم کی سنگینی کے پیش نظر کچھ زیادہ نہیں۔ میں اس کے لئے کسی بہتر کلاس کی سفارش نہیں کرتا کیونکہ وہ کسی خاص معاشی اور سماجی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ سن کر عدالت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس سے زیادہ سزا کا متوقع تھا یعنی میرے ایک دوست کو جو اس کا بھی دوست تھا اپنی کٹھی پر بلوایا اور کہا کہ شورش کے ساتھ جو کچھ پولیس نے کیا ہے بلاشبہ وہ پولیس کا کمینہ فعل تھا مجھے خود اس کا لالہ ہے لیکن میں بے بس ہوں سزا پندرہ سن رڈ پی کسٹرز کے ایما پر دی ہے البتہ فیصلہ میں اپیل کی گنجائش رکھ دی ہے شورش کی

اپیل کر دوسروں کو تیس سال کی سزا دینے سے باز رکھیں۔ اس واقعہ کا علم اور مدد ہے۔  
 ہمیں نے اپیل کرنے سے انکار کر دیا۔ احباب مختار نامہ لے کر آئے اور لوٹ گئے۔ اس سے  
 اگلے روز سزا دینے کے لیے ڈسٹرکٹ جیل میں آئے۔ اشارۃً کہا بھی اور کہلوایا بھی میں تیار نہ ہوا۔ کوئی سال  
 ڈیڑھ سال بعد تقریباً بھی دوست اپیلیں کر کے رہا ہو گئے حتیٰ کہ شیخ صاحب بھی چلے گئے مگر میں کسی مرحلے  
 میں اپیل کے لئے راضی نہ ہوا یہ جماعتی قرارداد کے منافی تھا بلکہ اس فیصلہ کے سراسر خلاف جو ہم نے  
 شروع میں کیا تھا وہ فیصلہ کیونکر بدلا کیسے بدلا کب بدلا مجھے معلوم نہ تھا۔

کم لوگ واقف ہیں کہ

۱۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں جو دو چار آدمی پہلا شکار ہوئے ان میں سرفہرست میں  
 ہی تھا وارنٹ سب سے پہلے میرے نکلے گرفتاری کا نمبر تیسرا تھا۔

۲۔ سب سے زیادہ سزا ملک بھر میں مجھی کو ہوئی کسی شخص کو تقریباً پانچ سال قید نہ  
 ہوئی اور نہ کسی نے مام سزا بھگتی۔

۳۔ مجھ پر بیک وقت چار مقدمے چلائے گئے لاہور، ملتان، لاہور اور منگھری کوئی  
 شخص اس طرح ماخوذ نہ ہوا

— ملتان جیل سے نکلا تو وہاں کی بھائی اجڑ گئی ابھی دو مقدمے منگھری اور لاہور میں باقی تھے

میرا چالان لاہور ہو گیا یہ مقدموں کی کھینچ تانی کا زمانہ تھا

دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

احرار لیڈر تو خیر بہتر کلاس میں تھے لیکن احرار نوجوانوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں کا سلوک

ہو رہا تھا ان کے لئے سخت مصیبتیں تھیں ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہدایات تھیں کہ ان کے ساتھ

ترجیحی سلوک نہ کیا جائے سیاسی قیدیوں سے علیحدہ رکھا جائے یہ دوہرا عذاب تھا — میرے بارے



میں لکھنا کہ تم اور میں زیادہ تھا۔

### دوبارہ لاہور میں

لاہور پہنچا تو مجھے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ سیاست خانہ میں رکھا گیا بان بٹنے کی مشقت دی گئی بان تو میں بیٹ ہی لیتا تھا لیکن کامریڈ حسین بخش نے گوارا نہ کیا کہ اس کی موجودگی میں بان بٹوں میرا بان وہی بٹتا رہا۔

سی کلاس، کالی کوٹھڑی، ایک طرف مٹی کی کھڈی (چوترو)، دوسری طرف چمکی، ادھر بول و براز کا بزین، ادھر مٹی کی جھجر طبیعت کیسوں تھی اور نہ یہ معلوم تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا یا مجھے کہاں جانا ہو گا منگہری کا مقدمہ ابھی لٹک رہا تھا کتابیں ساتھ نہ تھیں جو دو چار کتابیں ساتھ تھیں انہیں ٹرہ چکا تھا اور اب انہی کو بار بار پڑھنے میں کچھ مزہ نہ آ رہا تھا انہی دنوں ارمان حجاز کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو میں قمر الدین (رتیں اچھرہ) نے بھجوا دیا۔ کلام اقبال کے دوسرے مجموعے بھی خرید کئے۔ ترجمان القرآن منگوا یا مکتوبات امام ربانی ہاتھ آگئے الہلال کا فائل مل گیا بعض تاریخی اور سیاسی کتابیں آگئیں غرض یا پچ سالہ قید کا بہلاوا جمع کرتا رہا مسعود اختر پینگیوین سیریز

کی بہت سی کتابیں دے گیا اس طرح پچاس ساٹھ کتابوں کا ایک ذخیرہ اکٹھا ہو گیا لیکن مطالعہ میں ابھی جی نہیں لگا تھا۔ شیخ حسام الدین اسی جیل میں تھے میں پہنچا تو وہ میو ہسپتال جا چکے تھے انہیں عمر بھر گھٹنوں کا درد رہا اور اس درد نے ایام قید میں انہیں خاصا فائدہ پہنچایا جب بھی قید ہوتے درد عود کر آیا اور وہ جیل سے منتقل ہو کر ہسپتال چلے گئے۔ میں جتنے دنوں لاہور سنٹرل جیل میں رہا وہ ہسپتال سے لوٹے نہیں کرنل سونڈھی (سپرٹنڈنٹ) محاذ جنگ پر چلا گیا اسکی جگہ کوئی اور صاحب آگئے۔

جیلر ایک سکھ تھا اُس سے تو لکار ہو گئی مجھے دیکھتے ہی پولیس سے کہا اس بلا کو کہاں رکھوں؟ چونکہ اُس کے لہجہ میں بھارت تھی لہذا مجھے سخت غصہ آیا میں نے کہا اپنے لفظوں سے لیجئے اور ان احمقوں سے پوچھئے جنہوں نے یہاں بھجوا یا سے میرا منہ تکنے لگا ایک قیدی سے دو ٹوک جواب کی توقع کہاں؟ عجب نہ تھا کہ تلخی بڑھ جاتی لیکن سردار جی فوراً برناب ہو گئے۔ سردار ہرچرن سنگھ سبیر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہرانے واقف تھے انہوں نے جیلر کو سمجھا دیا۔ صد دنوں کا بنام بھاگٹ گیا۔

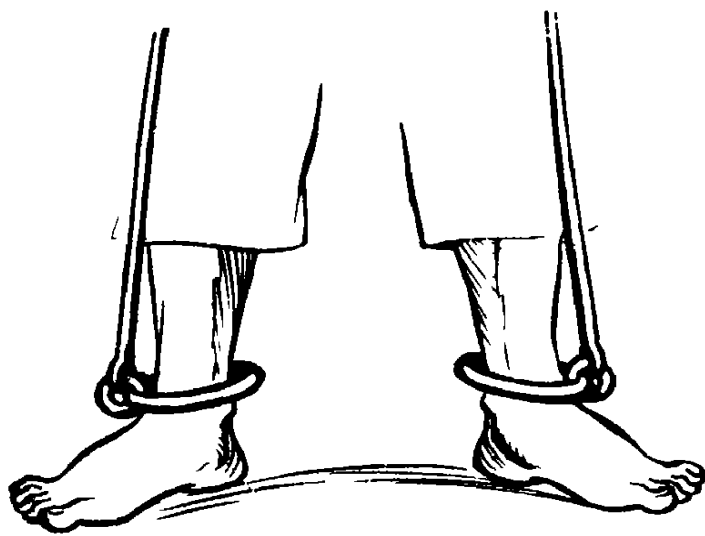
---



سنٹرل جیل منٹگمری

عشق اپنے مجسروں کو پایہ بھولا لے چلا

122



منگھری جہن روانہ ہوا تو سیریاں پہنادی گئیں پہلے یہ کبھی نہ ہوا تھا میں سے بہر حال کوئی غدر نہ کیا۔ اس کا عادی تھا پہلے کئی دفعہ سیریاں پہن چکا تھا۔ لامور اسٹیشن پر خاصی رونق ہو گئی بے شمار دوستوں نے الوداع کہی جنگ کا زمانہ تھا ہر طرف گماگمی نظر آرہی تھی گاڑیوں کا بہ حال تھا کہ تن دھرنے کو جگہ نہ تھی بے شمار گاڑیاں ادھر ادھر چلتی تھیں۔ فوج کی نقل و حرکت نے اور بھی ہنگامہ پیدا کر رکھا تھا۔ دوستوں نے محبت کے بلے بلے جذبات کے ساتھ رخصت کیا۔ ابمن نے وسل دی

گاڑی حرکت میں آگئی

”ہم کب واپس آئیں گے؟“

”یہ جنگ کب ختم ہوگی؟“

”پانچ سال کی مدت بڑی مدت ہے“

”انگریزوں کو شکست ہوگئی تو زندہ نہیں پھوڑے گا“

”قیدیوں کو مروادینا کوئی مشکل نہیں؟“

منور شمسیت ہے انگریز کہ اُسے یہاں بے شمار صالح محمد لیکھراج اور نقبانگھٹے ملے ہوئے  
 میں جنہیں وفاداری بشرط استواری نے سدا کیا جو انگریزوں کے لئے جننے گئے اور انگریزوں ہی  
 کے لئے مرے گئے۔“

میں خوابوں کے چمسان میں چلا گیا۔ مجھے کچھ ماورہ ربا کہ گاڑی کس رفتار سے جا رہی ہے  
 اور میں کہاں ہوں؟ دل بہ حال مطمئن تھا خبالاں خود بخود ابھرتے چلے آ رہے تھے یا بج سال  
 دور تک باد وطن آئی تھی سمجھانے کو

بال بھارت بھاگا زمانہ باد آگیا کچھ دیر تصور میں اوم پرکاستس سے بانہیں کرنا رہا کم سن راجہاں  
 سے ملا جسے پولیس نے اسلام کے بعد ہلاک کر کے رتن چند کے تالاب میں پھینک دیا تھا شہید گن  
 کا زمانہ سامنے آگیا۔ نوجوانوں کے حوصلے، شہیدوں کے ولولے، قید و بند کے مرحلے اور سیاسی  
 پیچ و خم کے سلسلے، آنکھوں میں گھونٹے چلے گئے پھر اپنی عادات اسبری پر سوچنا شروع کیا  
 ۱۹۳۵ء سے اب تک تمام عیدیں جیل میں آتی تھیں ہم گویا عیدین کے لئے پیدا ہی نہیں ہوتے تھے  
 ہماری کتاب زندگی سے عیدیں خارج ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی میں نے  
 خواب میں دیکھا: —

”خورشید بیمار پڑی ہے۔ اُس کا شہابی رنگ گھل گھل کر زرد ہو رہا ہے  
 اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے آغا جی! آپ  
 نے مجھ سے وفا نہیں کی دعا کی ہے عشق کو آپ سے گلا ہے۔“

اور میں یکایک بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا گاڑی رکی تو ہم منٹگری کے اسٹیشن پر تھے۔

۱۹۴۰ء کا زمانہ شروع جنوری کے دن منٹگری سنٹرل جیل کا چھوٹا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا

رات کے سارے گیارہ بج رہے تھے دربان نے کہا، ابھی تھوڑی دیر میں آپ کا مجدد ار غلام حسین شاہ آتا ہے۔ وہ آپ کو وصول کرے گا۔ آپ کی اطلاع آپکی ہے آدھ گھنٹہ میں غلام حسین شاہ آگیا۔ گورانگ داہمی سوٹھی صاف چھہ دار بال مسانوالی کے کسی گاڈن کارہنے و ل لب و ل جہ ٹھٹھے بول جیال میں مٹھاس یکن چھری کی طرح بے آہ از کتنے لگا آپ کے ناس جو کچھ ہے دے ویجئے۔ میں نے کہا۔ کتابیں ہیں کاغذ ہے منسل ہے اور یہ کلام پاک ہے اُس نے کہا کلام پاک تو آہ لے جا سکے ہیں باقی بہاں رکھ ویجئے بمع انشاء اللہ یہ سب کچھ آپ کو پہنچا دیا جائے گا میں نے کہا، جو چیزیں پہنچانا ہے ابھی دیدیکئے کتنے لگا نہیں بہ بات نہیں ڈٹی صاحب ملاحظہ فرمائیں کے نو آپ کو یہ چیزیں مل جائیں گی میں نے کہا ان میں کوئی چیز خطرناک نہیں جیال ہی سے آ رہا ہوں افسروں کے دستخط موجود ہیں نہ مانا کتنے لگا بہاں کے افسر بھی دیکھ لیں تو سہج کیا ہے؟۔ بھروسہ رکھئے تمام چیزیں آپ کو جمع مل جائیں گی ناچار جب ہو رہا اُس نے پہنے ہوئے کپڑوں کی تلاشی لی بوٹ اُتروا کر دیکھے، قرآن مجید کو غلاف میں سے نکلوا کر ورق ورق دیکھا اس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا لیکن پی گیا۔

”کیا آپ کو میرے کسے کا یقین نہیں؟۔ ایک مسلمان کو کم از کم کلام اللہ کی تلاشی نہ یعنی چاہئے“

”جی نہیں! ڈیوٹی ہے یہ کلام پاک کی تلاشی نہیں۔ بعض فدی اللہ کی اس کتاب میں بھی بد معاشی چھیا کر لے آتے ہیں۔“

”لا حول ولا قوتہ“ قرآن پاک میں بد معاشی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

”جی ہاں! مثلاً ناجائز خطوط، نوٹ، بلبڈ، انہون وغیرہ اور یہ سب چیزیں جیل میں بد معاشی ہیں“

ہولناک دیولریں اندھے دروانے

نشگری سنٹرل جیل کے دو حصے ہیں ایک سنٹرل جیل دوسرا ڈسٹرکٹ جیل مجھے ڈسٹرکٹ جیل

میں رکھا گبارت کا وقت تھا کوٹ موہن (جیل کی چار دیواری) کے ساتھ ساتھ جھلموں کے کچھے روشن تھے یا قیدی نمبر دار پترہ چلا رہے تھے اونچی اونچی دیواروں کا ایک سیدھا سلسلہ تھا۔ کئی جھوٹے بڑے پھانک کھلے۔ تھوڑے تھوڑے حاصد پرتالے کھلتے اور بند ہوئے گئے۔ آخر دیواروں سلاخوں اور تالوں کا ایک طویل جکڑ ختم ہو گیا مجھے پہلے احاطہ کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا غلام حسین شاہ نے کہا اے بند نکال دو میں نے سختی سے انکار کیا وہ چپ چاپ بیٹھا گیا قیدی نمبر دار سے پانی مانگا وہ مٹی کا آنچورہ لایا اور کہا کہ اوک سے پی لو کیونکہ آنچورہ سلاخوں میں سے گزر نہیں سکتا اس کی اسلامی نسلک دیکھ کر میں نے پوچھا تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟ کہا مجھے معلوم نہیں یہاں کون بند ہے؟ یہاں آپ کے ساتھ کی چکیوں میں کم سن بچے بند ہیں میں خاموش ہو رہا وہ چٹائی بچا کر نماز پڑھنے لگا خدا معلوم کس وقت کی نماز؟ عشاء؟ فجر؟ اشراق؟ میں یہ سوچ کر کہ قید اب شروع ہوئی ہے اپنی کھڑی پر سورہا منہ اندھیرے ایک خنائی ریش چیف ہیڈ وارڈن نے آجگایا کہا میرے ساتھ چلو۔ نام عبدالکریم تھا یعنی میرا ہمنام لیکن تھا حاجی۔ دوسری تمام چکیوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ وہاں سے نکالا اور چھ چکی میں لے گیا جو ڈسٹرکٹ جیل کا کالا پانی تھا۔ یہاں کوئی اور قیدی نہ تھا۔ ایک چلی میں مجھے بن کر دیا گیا۔

### اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ٹیمپلنگھ

پھر جب صبح اچھی طرح روشن ہو گئی تو سفید سوٹ میں ایک کالا بھنگ سکھ نمبر داروں کا لاڈ شکر لئے غلام حسین شاہ ہیڈ وارڈن، عبدالکریم چیف ہیڈ وارڈن اور دو چار ملازم دارڈروں کی معیت میں آگیا۔ میں اپنی چھوٹی سی جگہ میں ٹہل رہا تھا پہلے تو بے نیازی سے آگے نکل گیا۔ پھر پلٹا اور رک گیا پوچھا۔



آپ کا نام؟

میرا نام؟ - آپ کو معلوم ہونا چاہیے؟

تاڑ گیا کہ آدمی ٹیڑھا ہے فوراً بولا شورشش کاشمیری؟

جی ہاں۔ اور آپ کا نام؟ - میں نے دریافت کیا۔

”میں یہاں اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہوں۔“

”جی۔ میں نے آپ کا نام پوچھا ہے؟“

جواب دیتے بغیر چلا گیا لیکن وارڈروں کو اشارہ کر گیا کھلا کیوں چھوٹا ہے بند کر دو بعد میں  
ججدار نے بتایا کہ شیر سنگھ نام ہے اس کا والد یہاں وارڈر تھا مذہبی سکھ ہے کسی ہندو یا سکھ پر  
اعتزاز نہیں کرتا اس کے تمام اردلی ججدار اور ہیڈ ججدار مسلمان ہیں پر لے درجے کا ظالم اور شقی ہے  
قیدیوں کو پٹوانا اس کا طبعی شغف ہے جیل کے قصوری قیدی اور سیاسی قیدی اسی کے سپرد ہیں۔  
کسی سے مروت نہیں کرتا سی آئی ڈی کے ساتھ تعلقات ہیں۔ جی میں سپرنٹنڈنٹ جیل بھی اس سے  
ڈرتا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ ایک کشمیری پنڈت من موہن ناتھ تھا جو بذات خود انتہائی رحم دل لیکن خود  
راستے نہ تھا عملاً اس کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ (جیلر) پنڈت کا بچو تھا جو اپنی  
راستے بھی رکھتا تھا لیکن تبدیل ہو رہا تھا اس کی جگہ چودہری مرید احمد آ گیا جو ایک خوش مزاج افسر  
تھا نیک سرشت، نیک خو، صوم و صلواۃ کا پابند کچھ دنوں وہ بھی شیر سنگھ کے ہاتھوں عاجز رہا۔  
اسی صبح میری پیشی تھی۔ یہاں میرے خلاف شہزادہ عالم گیر انڈینل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ  
کی عدالت میں ۱۲۴-الف کا مقدمہ شروع ہو رہا تھا۔ میں نے جیلر کو کہلا بھیجا کہ مجھے ساتھیوں سے  
انگ رکھا تو میں تاریخ پر نہیں جاؤں گا خواہ آپ کچھ ہی کر لیں۔ جیلر نے فوراً ہی بلا بھیجا۔

شیر سنگھ نے کہا:

”یہاں کوئی پولیٹیکل قیدی نہیں ہے؟“  
 ”جی نہیں یہاں پولیٹیکل قیدی ہیں“ میں نے اصرار کیا حالانکہ مجھے کچھ علم نہ تھا  
 ”صرف دو پاگل قیدی ہیں شیر سنگھ بولا  
 ”تو آپ نے یہاں کیوں رکھا ہے؟ پاگل خانے بھجوائیے ممکن ہو تو آپ بھی ساتھ  
 نثر لے لے جاتے۔“

”شیر سنگھ اس جواب سے قدرے بلبلایا لیکن کاجٹونے کہا اچھا آپ عدالت سے سوائس  
 آپ کو واپسی پر ساتھیوں میں بھیج دیا جاتے گا۔“

پہلا دن تھا براے نام سماعت ہوتی لیکن جو دوست لاہور سے آئے تھے ان سے ملاقات ہو  
 گئی دس روز کی تاریخ پڑی واپس جیل آیا تو کاجٹونے مجھے ساتھیوں میں بھجوا دیا یہ وہی جگہ تھی جہاں  
 مجھے پہلی بات بند کیا گیا اور قیدی نمبر دار نے جھوٹ بولا تھا کہ یہاں بچے رہتے ہیں میں نے  
 غلام حسین شاہ اور حاجی عبدالکریم سے گلہ کیا کہ آپ لوگ بے لذت جھوٹ بولتے ہیں دو نوکھیانے  
 ہو کر بولے۔ کیا کریں ملازمت ہی ایسی ہے۔

### بہادر ساتھی

اس بلاک میں مولانا محمد گلشیر (دو سال) مولانا احسن عثمانی (دو سال) صوفی عنایت محمد  
 پیروری (تین سال) حکیم غوث محمد (اڑھائی سال) سیتارام عرف بندے مانزم (دو سال) کامریڈ  
 نظام الدین (دو سال) کامریڈ راجندر سنگھ آتش (دو سال) کامریڈ لیا سنگھ (دو سال) اور میر دادخان  
 (دو سال) یعنی کل نو قیدی رہ رہے تھے۔ پہلے چار اصراری تھے۔ باقی سوشلسٹ اور کمیونسٹ۔

یہ معلوم کر کے شدید محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ انسانوں سے مختلف بتاؤ گیا جا رہا ہے انہیں میدان فرض کر لیا گیا اور جب سے یہاں آتے ہیں سخت قسم کی تکالیف کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان کے سر پر ہر وقت منبر دار سوار رہتا اور بچہ بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا ہے۔ آج تک کوئی احتجاج کارگر نہیں ہوا اور بھرپور لوگ بند رہتے ہیں صرف ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کھولا جاتا ہے۔ ہر روز ان کی مہربانہ طریق سے تلاش لی جاتی ہے شیر سنگھ بلافاصلہ شام منبر داروں کی کھوپ لے کر آتا اور ان کے بستر وغیرہ اٹھا بیٹھ کر چلا جاتا ہے یہ تمام عملی پتے ہیں شیخ کا طرزِ مخاطبت انتہائی گستاخانہ ہے۔

### پہلی جھڑپ

میں نے سب سے پہلے نمبر دار کو ٹوکا سر پر کیوں کھڑے ہو، پر سے ہٹ جاؤ۔ پھر مچھ کرنے لگا۔ میں نے ڈانٹ کر ہٹا دیا بلکہ دھنکارتے ہوئے کہا جاؤ شیر سنگھ سے بولو۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا وہ چلا گیا اور واپس نہ آیا ہم نے اس اثنا میں احتجاج کا طرزی کارٹے کر لیا میں تو بھوک ہڑتال کے حق میں تھا لیکن مولانا محمد گل شیر شری عذر کی بنا پر راضی نہ ہوئے یہ پایا کہ آج شام جب شیر سنگھ بستر وغیرہ کی تلاش لے کر اس کے فوراً بستر اٹھا کر باہر پھینک دیئے جائیں اور اعلان کر دیا جائے کہ ہم ان گھٹھڑی ہوئی سردیوں میں بستر چھوڑ کر ہڑتال کر رہے ہیں جاڑے میں مرجانا منظور ہے لیکن مدزمرہ کی یہ ہٹک ایک لفظ کے لئے بھی گوارا نہیں جب معمول شیر سنگھ آیا تلاش لی منبر داروں نے میرا بستر ٹٹونا شروع کیا کپڑوں کی گھٹھڑی کھولی۔ میں نے کہا: صر

سوائے حسرت تعمیر کوئی چیز نہیں

شیر سنگھ کی سمجھ میں کیا آتا۔ کھسانی ہنسی ہنستا ہوا بولا ہمارا جہم تو ضابطہ پورا کرتے ہیں میں نے کہا: جی ہاں۔ ضابطہ نسوانی آبرو کی طرح نازک ہوتا ہے کچھ نہ سمجھا شراب میں دھت تھا

سامنے کچی پر ترجمان القرآن (مولانا آزاد کا ترجمہ) پڑا تھا اٹھانے لگائیں نے ٹھٹھک دیا معاف کیجئے آپ اس کو ہاتھ نہیں لگا سکے یہ ہماری مقدس کتاب ہے اور آپ اس وقت نشہ میں ہیں۔

”غلام حسین شاہ تم دیکھ لو“

غلام حسین نے جزدان آتارا۔ ترجمان القرآن از ابوالکلام آزاد کے الفاظ سے چونکا۔

تبرنگہ۔۔۔ یہ مولانا صاحب کا قرآن ہے؟

میں:۔۔۔ جی نہیں۔ اللہ کا قرآن ہے۔ مولانا آزاد نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

شیرنگہ۔۔۔ وہ تو کانگریس کے صدر ہیں

میں:۔۔۔ جی ہاں۔

شیرنگہ۔۔۔ اس میں حکومت کے خلاف تو کوئی بات نہیں؟

مجھے ہمسی آگئی ابھی سردار صاحب یہ کتاب سی حکومت کے خلاف ہے اس چھڑی چھاپڑ کے بعد وہ نکل گیا اسم نے ستر اٹھا کر سلاخوں کے باہر پھینک دے اور متحد ہو کر اپنی اپنی کوٹھڑی سے انقلاب زندہ باد کا نعرو بلند کیا۔۔۔۔۔۔ یہ جیل والوں کے لیے ایک انتباہ تھا کہ ہم لوگ جاگ اٹھے ہیں جیلر آیا سپرنٹنڈنٹ پہنچا۔

”یہ کیا؟ سپرنٹنڈنٹ نے لڑچھیا“

”شیرنگہ کے مظالم کے خلاف احتجاج۔“ میں نے جواب دیا

ہنیری کو شش کی گئی کہ ہم میں پھوٹ پڑ جاتے یا ایک دو ساتھی ہی مان جاتیں لیکن ہر ایک نے جواب دیا کہ حتمی بات تو شش ہی کر سکتا ہے وہی ہمارا ترجمان ہے اور اگر ہم میں سے کسی کو لگ گیا یا سب ایک دوسرے سے جدا کئے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم سب بھوک ہڑتال کر دیں گے۔۔۔ گنتی بند ہو چکی تھی سب اچھا بھی ہو گیا تھا جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو جیل کے افسر ہر اکڑا کر کے گھروں کو چلے

گئے چوکوٹھی کے سامنے لائین رکھ دی گئی ڈاکٹروں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ رات بھر جیل کے اندر ہسپتال میں رہیں اور پھر انگلے رہیں افسروں نے گشت شروع کی خود سپرنٹنڈنٹ کئی دفعہ آیا ساتھیوں میں برکوتی اپنی کھڈی پر ڈاکٹروں بیٹھتا تھا میں رات بھر ہلتا رہا مولانا محمد گل شیر نے رات کا اکثر حصہ نماز میں گزارا سید امجد سے ماترہ نے خاصی رونق پیدا کی اُس نے اپنے انقلابی گیتوں سے جیل کو ہلکا کر دیا صوفی عنایت محمد سپردی بھی مناجات پڑھتے رہے حکیم غوث محمد نے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا تو صبح ہونے تک کئی پارے پڑھ ڈالے راجندر سنگھ آتش جب جی کا پاٹھ کرتا رہا میں نے سینکڑوں غنائوں پر سوچ ڈالا آنکھوں میں رات کٹ گئی کئی جمعہ اور کئی افسر آتے جاتے رہے ان سے کیا بات کرتا میں نے ڈاکٹر کو بھی رسید نہ دی نور کے ترکے ہمیں کھول دیا گیا میرے پاس سپرنٹنڈنٹ کا اردلی آیا اور کہا کہ صاحب بہادر یاد کرتے ہیں ساتھیوں نے منع کیا کہ جاؤ نہیں شاید تمہیں الگ کر دیں سوچو چار کے بعد ملے پایا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہاں بلا لیں اردلی سے کہا کہ صاحب سے کہو کہ یہاں تشریف لے آئیں تھوڑی دیر بعد سپرنٹنڈنٹ وارو فر اور شیر سنگھ، ایک لاڈلے شکر سمیت وارو ہو گئے۔ پہلے تو انہوں نے ایک چھپتی ہوئی نگاہ سے سب کو دیکھا پھر رُک گئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے!

لڑکے! آپ نے فتور چا دیا ہے۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کہا:

یہ آپ نے کیا کیا؟۔ ہم نے آپ کو ساتھیوں میں اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ آپ انہیں اکسا میں اور

اس راستہ پر لگا دیں۔

میں نے کہا: پنڈت جی آپ مجھ سے واقف ہیں میں لاہور میں آپ کے پاس قید کاٹ چکا ہوں

آپ ہی نے وہاں مجھے چودہ نمبر سے نکالا تھا یہاں جو کچھ ہوا ناگزیر ہے میں نے تو احتجاج کو زور کیا ہے ورنہ

یہ سب جان کی ہڈی لگانے کا نتیجہ کر چکے تھے ہم لوگ اخلاقی نہیں سیاسی قیدی ہیں کسی کو نقصان پہنچا کر

نہیں آئے ملک کی آزادی کے لئے آتے ہیں آپ کا یہ اسسٹنٹ شیرنگہ اس سارے فتور کا اصل بانی ہے اُس نے اب تک کسی کو انسان نہیں سمجھا مولانا گل شیر ہمارے دینی پیشوا ہیں مسلمانوں میں ان کا بڑا مرتبہ ہے یہ شخص انہیں بھی اویئے گل شیر کی حال اسے ترا کہہ کر دیکھتا ہے۔ احسن عثمانی دسیوں اخباروں کے ایڈیٹر ہے ہیں یہ اُن سے اس طرح بولتا ہے جسے کوئی تھا نیدار نسل چور سے مخاطب ہو غرض ہر شخص کے ساتھ اس کا یہی سلوک ہے مولانا گل شیر اور دوسرے سانھی چلی پیٹنے میں احسن لاغر ہو کر بان بٹتا ہے صوفی بیمار ہیں چرخہ کاتتے ہیں۔

گنتی بند ہونے کے بعد شیرنگہ فراتا ہوا آتا ہر ایک کے بستر کو اٹھل پھل کرتا بلا وجہ تلاتی لیتا اور دندنا مولانا گل جاتا ہے اس کو نایارسانی میں مزہ آتا ہے اس باڑے میں بھی پریڈ کے دن جو نئے آتروا کر باہر رکھوائے جاتے ہیں گھنٹوں سیر منڈنٹ کا انتظار کرنا پڑتا اور پیر ٹھٹھرنے رہتے ہیں یہ بے ڈھنگے پا جاسے جو ہم نے پن رکھے ہیں اس کے ناڑے نہیں شیرنگہ نے نکلوائے ہیں ہماری ہیبت کڈائی ہی بدل دی ہے۔

”یہ قاعدہ ہے۔۔۔۔۔ شیرنگہ نے لقمہ دیا۔

”کوئی قاعدہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں نے غصتہ میں

جواب دیا۔۔۔۔۔

”مقبذی ناڑے سے گلا گھونٹ لیتے ہیں۔“ شیرنگہ نے کہا۔

”آپ خاموش رہتے ہم آپ سے مخاطب نہیں ہیں۔ یہ آگ آپ کی لگاتی ہوتی ہے ہم لوگ پھانسی لینے والے نہیں آپ یہ کہہ کر ہماری توہین کر رہے ہیں اور اگر جیل کے بد معاش قیدیوں کے لئے س قسم کا کوئی قاعدہ ہے تو ہمارے بارے میں یہ کیوں سوچا گیا۔“

سپرٹنڈنٹ کو معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ اب بگڑ گئے ہیں فری سے کہا۔۔۔۔۔ ”میں تمام

شکایتوں کو دیکھ کر دماغ جیل تو برہاں میں ہے۔

”جی ہاں لیکن یہ مسئلہ بن تو جیل کے قواعد میں نہیں ہے۔“

”ممبر کیجئے غصہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ سب باتیں درست ہو جائیں گی۔“

”یہ تمہارا قابل برداشت ہے کہ ہمیں دن بھر بند رکھا جائے۔ ہم دن بھر کھانا پنا پاتے ہیں اس

خونناک تنہائی میں بھی ہمیں تمام دن الگ الگ بند رکھنا اور کھانا تو ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کی

طرح بھی برداشت کے قابل نہیں ہے۔“

”سب شکایات ایک منٹ میں رفع ہو سکتی ہیں بشرطیکہ آپ شیرنگہ کی جگہ کسی اور شریف

آدمی کو لگا دیں۔“

شیرنگہ دل میں سچ و تاب کھاتا رہا لیکن نظام مسکراتا رہا۔ سپرنٹنڈنٹ یہ کہہ کر چلا کہ آپ میں سے

دو کو دفتر میں بلاتا ہوں مگر دوستوں نے زور دیا ہمیں فیصلہ کر دیجئے سپرنٹنڈنٹ بولا مطمئن رہتے

کوئی دھوکہ نہیں ہوگا کسی ساتھی کو الگ نہیں کیا جائے گا۔

### نتیجہ کیا نکلا

سپرنٹنڈنٹ نے دفتر میں ہمیں چاہتے پلائی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اس وقت تنہا تھا کہنے

لگا شیرنگہ سی آئی ڈی کے منڈ لگا ہوا ہے ہوم ڈیپارٹمنٹ سے ہدایات ہیں کہ اسی کو آپ پر لگایا جائے۔

آپ اس کی تبدیلی کا مطالبہ نہ کریں۔ باقی آپ کے سبھی مطالبات تقریباً تسلیم کر لیے جاتے ہیں وہ آپ

سے اچھی طرح بولے گا دن بھر آپ کھلے رہیں گے مشقت کیجئے نہ کیجئے آپ کی مرضی پر بے چرخہ کات لیا

کیجئے کوئی نمبر وار آپ کے سر پر سوار نہیں ہوگا کھانا بہتر طے گا آزار بند آپ کو ابھی مل جاتے ہیں آپ

کہیں تو میں مگر سے چھا چھ بھجوا دیا کروں ہم مان گئے پہلا ٹکراؤ تھا سپرنٹنڈنٹ کا شکر یہ ادا کیا لعد

شیرنگہ پر جو ڈیوڑھی میں کھڑا تھا ایک طنزیہ مسکراہٹ ڈالتے ہوتے واپس آگئے ساتھیوں کو مطلع کیا جب  
نے رات کے اس یدھ کی کامیابی پر اٹھارہ اطمینان کیا اور دوستانہ لہجہ میں میرے اس نوابیاد  
اجتہاجی نسخہ کی داد دی۔

### زمین جلد نہ جلد

دوپہر کے وقت غلام حسین شاہ چابیوں کا گچھالتے وارد ہو گیا گھنٹہ بھر کے لئے بند ہو جائیے  
عام قاعدہ ہے ہم نے اس سے بھی انکار کیا منت کرتا رہا ہم کہاں مانتے چلا گیا دس منٹ گزرے  
ہوں گے کہ شیرنگہ کو ساتھ لے کر آگیا ہم نے شیرنگہ کو رسید تک نہ دی پہلے کھڑے ہو جایا کرتے  
تھے اب کھڑے بھی نہ ہوتے، خود ہی بولا دوپہر کو ایک گھنٹہ کے لئے سارے جیل کی گنتی بند ہو  
جاتی ہے آپ بھی بند ہو جائیے باقی دن بھر کھلے رہیے۔“

”ہم پہلے ہی بند ہیں اس معاملہ ہی کے تین دروازے اور تین تالے ہیں کسی  
کو ٹھٹھی میں کوئی روشندان نہیں یہ مختصر سا معاملہ ہے آپ اس میں بھی ہمیں بند رکھنا  
چاہتے ہیں؟ میرا دانے کہا۔“

تھوڑی دیر تکرار رہی۔ آخر سپر انداز ہو کر چلا گیا۔

### مشقِ ستم اور

اب اُس نے پریشان کرنے کا ایک نیا طریقہ نکالا۔ ہمارے ساتھ کے بلاک CELLS میں  
اس قسم کے قیدی رکھنے شروع کئے جو صبح و شام پڑتے تھے جنہیں جیل کی اصطلاح میں قصوری (برعاشقہ)  
کہتے ہیں درمیان میں ایک بہت اونچی اور پختہ دیوار تھی ان قیدیوں کی چھین اڑا کر پہنچتیں اور یہ واویلا



جن بھرتا نہیں اتنا مارا جاتا کہ دیواریں کانپ کانپ جائیں کوسے یا کٹنے کی آواز سننے کو تو کان ترس گئے تھے  
گھتیدیں کو جوتے پڑنے کی آوازیں لگتا آتی تھیں۔ وقت کا بڑا حصہ بدمزہ ہو جاتا۔ ایک دن کسی قیدی  
کو اتکار گیا جیسے وہ مر ہی گیا ہو۔ ہم تھوڑی دیر تک تو اس کے نالہ ہائے درو سنتے رہے لیکن جب اُس  
نے آخری چیخ ماری کہ مر گیا اور پھر اس کے بعد کوئی نالہ نہ اٹھا تو ہم بے چین ہو گئے میر داد خان نے  
اندہی سے چلا کر کہا :

ادھر امزدو! کیوں مارتے ہو؟

میر داد نے لگاکر انو جھدار غلام حسین دوڑا ہوا آیا ہم نے شور مچا دیا کہ تم لوگوں نے قیدی قتل کر دیا ہے  
عرے لگانے شروع کئے شیر نگہ بھی اہنچا جیلر آ گیا سپرنٹنڈنٹ کو بھی آنا پڑا۔

میر داد خان نے کہا جب تک دیکھ نہ لوں مجھے چین نہیں آسکتا قیدی ضرور مارا گیا ہے "دیر تک  
جھگڑا۔ ہا میر داد نے اعط دیکھا تو وہاں کوئی قیدی نہ تھا ظاہر ہے کہ مجروح یا مقتول کو غائب کر دیا ہو گا نتیجہ  
یہ نکلا کہ چکی نمبر ۲ میں سے اس فم کے سبھی قیدی زکال دیتے گئے اس کے بعد نہ کبھی مار کٹائی کی آواز  
آئی نہ شور ہوا اور نہ ہم نے احتجاج کیا۔

### خطوط کی ضبطی

شیرنگہ دل ہی دل میں بس گھولتا رہا اب اُس نے یہ وار کیا کہ ہماری ڈاک بند کر دی جو خط ہم  
اعزہ واقربا کو لکھتے وہ بھیجتا نہیں جو خط باہر سے آتا وہ دیتا نہیں ہم پوچھ رہے ہیں وہ انکار کر رہا ہے  
تقاضا کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ کہاں سے لاؤں؟ خود لکھ کر ڈال دوں ملاقات نہ پیام، دعا نہ سلام، ایسی  
کوئی وجہ نہ تھی کہ ہمارے اعزہ ہمیں خط نہ لکھیں۔ اس سے پہلے میرے خطوط کی رفتار یہ تھی کہ خورشید دن  
میں دو تین خط لکھتی۔ عبدالملک بھی دو ایک خط لکھتا مسعود اختر روز ایک خط لکھتا سید عنایت شاہ بھی

ہفتہ میں دو خط لکھتے واند بھی ایک آدھ خط بھیج دیتے مگر شیر سنگھ پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیتا تھا۔ بلاشبہ کئی تاریخ پر ملتا تو کتنا کئی خط لکھ چکا ہوں جواب نہیں آ رہا شیر سنگھ کا ایک ہی جواب تھا میرے پاس کوئی خط نہیں کوئی لکھتا ہے تو مجھے نہیں ملتا آپ لوگوں کی ڈاک سنسر ہوتی ہے لیکن ہے سی آئی ڈی قبضہ کر لیتی ہو۔ ایک دن میں کچھری سے آکر ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو پرسٹ مین دربان کو قیدیوں کی ڈاک دے رہا تھا میں نے بنڈل چھین لیا میرے دو خط لکھے ایک خورشید کا دوسرا عبداللہ تک کا۔ دفتر سے شیر سنگھ بھی برآمد ہو گیا اُس نے دیکھا تو سٹپا دربان کو ڈاٹھنے لگا میں بھی تلخ ہو گیا بہر حال اس تلخی میں دو خط ہاتھ آگئے اور ساتھ ہی اُس کے غاصب ہونے کا حتمی یقین ہو گیا اُس نے آخری حربہ یہ استعمال کیا کہ راجندر سنگھ آتش کو سکھ دھرم کا واسطہ دیکر اپنے ساتھ ملا لیا وہ کھل کر تو نہیں لیکن بالواسطہ طرفداری کرنے لگا حکیم غوث محمد ہم میں غریب لطیف انسان تھے انہیں اثر اپنے گھر کے خط کا انتظار رہتا وہ اپنے اکلوتے بچے کی طرف سے فکر مند تھے جو ابھی عمر کی تھی یا ساتویں منزل میں تھا۔ باپ کو اولاد سے پیار ہوتا ہے مگر شیر سنگھ ان کے خطوط بھی غائب کرتا رہا اس دماغی تشدد کا اُن کے اعضاء پر خاصا اثر پڑا۔

سرٹنڈنٹ سے کما جیلر سے فریاد کی 'شنوائی' نہ ہوتی 'جواب' تھا کوئی خط نہیں آ رہا خط آئیگا تو ضرور پہنچا دیا جائے گا آخر ہم نے شیر سنگھ کو بے عزت کرنے کا تہیہ کر لیا تنگ آمد بھنگ آمد وہ مجرموں میں رہ کر مجرم ہو چکا بلکہ بدترین قسم کا مجرم تھا۔ اُس میں شرافت، اخلاق، حیا، رحم اور ایسے ہی دوسرے اوصاف کا شائبہ تک نہ تھا وہ پرلے درجے کا ظالم تھا اس کے ظلم کی داستانیں اخلاقی تبدیلیوں میں خوف کے ساتھ مشہور تھیں اسکی کالی کلوٹی صورت بے ڈول ہم بھڑے نفس و نگار اتنے مکروہ تھے کہ میں نے اُس کا نام بہتی سنگھ رکھ دیا تھا۔ بنی پنجابی زبان میں اُس کا لے ڈول کو کہتے ہیں جس میں بھگی بول و براز آٹھا کر لے جانے اور پھینکتے ہیں وہ آتا تو ہم آواز سے کہتے ہم نے قطعی طور پر اس کا بائیکاٹ کر دیا ڈھیٹ تھا، بے عزتی ہوتا، لیکن روز آتا اور خالی کوٹھڑیوں کا منہ تک کے نکل جاتا آخر ایک دن وہ بدلہ لینے میں کامیاب

ہو گیا سہڑنڈنٹ کو کسی آئی ڈی کے حکم سے اس مطلب کا ایک خط بھجوا دیا کہ جب تک شورش کا حالات میں  
تھوڑا سا ساہوکار ہے اسکو سیاسی قیدیوں سے الگ رکھا جائے اس طرح ان قیدیوں کی خبریں باہر آتی جاتی ہیں  
پہڑنڈنٹ نے مجھے بلایا خط لاکر کیا میں نے کہا آپ پابند نہیں ہیں جیل کے نظم و نسق کی ذمہ داری آپ  
پر ہے سی آئی ڈی والے کو قہر ہوتے ہیں اُس نے مجھ پر ظاہر کی یہ مرحلہ ایسا تھا کہ میں لڑنا نہیں چاہتا تھا  
اور نہ اس جیل میں ساتھیوں کو اُلجھانا ہی مناسب تھا کیوں کہ معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا مجھے تاریخ سے واپسی  
پر چھ مہینے میں بھجویا۔

### چھ مہینے میں

یہ جگہ اس جیل میں کالا پانی کھلاتی ہے کُل چھ کوٹھڑیاں ہیں لیکن جہنم دن بھر یہ کوٹھڑیاں  
خالی رہتی اور میں تنہا ہوتا گنتی بند ہونے کے بعد اُن میں رات کی رات حوالاتی یا قیدی رکھے جاتے  
انہیں حکم ہوتا کہ حلق سے آواز بھی نہ نکلے بیچارے دم گھٹ رہتے آواز نکلی نہیں اور پٹے نہیں اس  
بُری طرح مارا جاتا کہ پناہ بچدائیں نے یہاں بھی شیرنگہ کا بائیکاٹ جاری رکھا نہ کبھی اس کے لئے کھڑا  
ہوا نہ اس سے بات چیت کی جب آتا میں دیوار کی طرف منہ کر کے سوچنے لگتا جیسے اُس کا کوئی وجود  
ہی نہیں ہے۔ ساتھیوں کو میرے اس طرح غائب ہو جانے سے حیرت ہوتی شیرنگہ سے استفسار کیا،  
جواب دیا کہ لاہور سہڑنٹ پر گیا تھا ابھی ٹوٹا نہیں وہ متذبذب ہوئے تو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین  
دلانا رکھنا کچھ دنوں بعد انہیں آنکھیں دکھانے لگا لیکن اب وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے۔  
مولانا گل شیر اور میر داد خان نے اُسے تیر کی طرح سیدھا رکھا البتہ ایک چیز میں وہ کامیاب ہو گیا ہمارے  
دو ساتھیوں کو اُس نے اپنے ساتھ ملا لیا ایک راجندر سنگھ آتش جو سکھ ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو  
گیا دو سر امرتی دھر جو بہا بھائی ذہنیت رکھتا تھا۔ ان دونوں کی معرفت اُسے ساتھیوں کی جھوٹی سچی

خبریں مل جاتی تھیں۔ ایک روز سب نے اکٹھا ہو کر ان دو نوکوپٹ ڈالا اور ایک منجر کا اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا۔

### ۱۲۴-الف

۱۲۴- الف کا مقدمہ دو تین ماہ چلتا رہا سرکاری رپورٹر ایک ہندو نوجوان تھا میں نے محض شو شہ پھوڑا کہ اس مقدمہ میں بھی لرزہ خیز انکشاف کا امکان ہے پہلا دن تھا کورٹ انسپیکٹر گھر گیا۔ ان دنوں گجرات میں شاہ جی کارپورٹر لدھا رام منحرف ہو چکا تھا پولیس کو شبہ ہوا کہ شاید اس مقدمہ میں اسی طرح کا کوئی عمل کھلے۔ چنانچہ شہادت کے روز پی ڈی ایس پی عدالت میں موجود رہا شہادت ہو گئی میں نے مذاقاً جرح کی رپورٹر کے بارے میں عدالت سے کہا کہ اس نے کوئی فقرہ بددیانتی سے شامل نہیں کیا صرف چند الفاظ کا تلفظ اس سے ادا نہیں ہو سکا بعض جگہ فقروں میں سے کچھ الفاظ رہ گئے ہیں یا ایک آدھ جگہ جو لفظ میں نے بولا تھا وہ نہیں وہ صرف آگیا ہے جس سے فقرے کی ساخت کمزور ہو گئی ہے۔ سیرے اس اعتراف سے کہ رپورٹر نے کوئی بددیانتی نہیں کی اس نوجوان نے ہلکی سی مسرت محسوس کی لیکن اس کے چہرے سے واضح طور پر پشیمان کا اظہار ہورہا تھا باقی تمام سرکاری گواہ مسلمان تھے ہر ایک نے تھوڑا بہت جھوٹ بولا لیکن جہاں تک تقریر کی اجتماعی سپرٹ کا تعلق تھا وہ ٹھیک ہی بیان کی گئی۔

شہزادہ عالم گیر بہت ہنس مکھ تھے اُن کا رویہ عدالت میں بڑا ہی خوشگوار رہا میری طرف سے کوئی دیکل نہ تھا سرکاری گواہوں پر وہ خود ہی جرح کرتے کورٹ انسپیکٹر سے بار بار کہا اب مقدمہ سے فائدہ کیا ہے؟ ملزم کو پہلے ہی پانچ سال کی سزا ہو چکی ہے کورٹ انسپیکٹر بھی بڑا آدمی نہ تھا وہ کہتا، جناب ہمارا کیا ہے صوبائی گورنمنٹ نے منظوری دی ہے اسی کے ایما پر مقدمہ چل رہا ہے۔

ہر ماہ کے شروع میں ضلعی حکام (ڈی۔ سی اور ایس پی) جیل کا معائنہ کرتے ایک مرتبہ

نوجوان مسٹر این۔ ایم۔ ایچ ڈی کشر تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس میاں انور علی تھے۔ جب آتے مزل مہری کرتے میں اللہ کا شکر ہے کہہ کر مسکرا دیتا۔ ایک روز ڈی سی اور ایس پی بے وقت آگئے۔ پنڈت من موہن ناتھ سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا

”صرف تمہیں دیکھنے آتے ہیں — میں نے مسکرا کر کہا،

”ان کی عنایت ہے“

مسٹر ایچ نے پوچھا کتنی قید ہے؟

میں نے کہا — ”پانچ سال“

”کلاس کونسی ہے؟ — سی“

”بہتر کلاس کے لئے درخواست نہیں دی۔“

”جی نہیں۔ میری معاشی اور علمی زندگی حکومت کے مقررہ معیار سے کمتر ہے۔“

”آپ کا اس سناٹا میں دل نہیں گھبراتا۔ ہم لوگ تو یہاں کھڑے کھڑے دس منٹ میں

گھبرا جاتے ہیں“

میں نے تہقیر لگایا — ”دل کے گھبرانے کا سوال نہیں مقصد کا شوق اور نصب العین کا

سفر آدمی کو مطمئن رکھتا ہے؟“

”آپ اس وحشت کدے میں بھی خوش ہی رہتے ہیں ہم نے آپ کو ہمیشہ جلتے پایا ہے۔ کبھی

غمگین نہیں دیکھا آپ کی عمر کیا ہے؟“

”۲۳-۲۴ برس ہوگی قید رو کر نہیں ہنس کر گزرتی ہے اور اس طرح جلد گزر جاتی ہے۔“

”قید ہی گزارنا ہے تو رو کر کیوں؟ ہنس کر کیوں نہیں؟ انسان کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے“

”آپ کے چہرے پر اطمینان اور خوشی پا کر طبیعت واقعی خوش ہوتی ہے“

”آپ کی مہ بانی ہے“  
 ”یہاں کے مقدمہ کا کیا بنا؟“  
 ”ابھی چل رہا ہے“

میں انور علی کی طرف دیکھا آہستہ سے کچھ کہا میں صاحب بولے ڈی سی صاحب نے آپ کا مقدمہ واپس لینے کی ہدایت فرمائی ہے وہ آج ہی صوبائی گورنمنٹ کو ڈی او لکھ دیں گے ہفتہ عشرہ تک آپ کا یہ مقدمہ واپس ہو جائے گا۔

”مشکوٰیہ اور ظاہر ہے کہ اس ہمدردی کے جواب میں شکر ہے ہی کا ایک لفظ میرے پاس تھا دہ بیٹوں چلے گئے لیکن میں سچ کے اس اخلاقی رویہ پر دیر تک سوچا رہا رہ کر ایک ہی بات میری سمجھ میں آتی تھی کہ ہندو افسروں میں ٹیننٹزم کا جذبہ سرایت کر چکا ہے وہ ملازمت کے باوجود ان نوجوانوں کی قدر کرنے میں جو ملک کی خاطر قید و بند کو لبیک کہتے ہیں — ان کے مقابلہ میں مسلمان افسر (اللہ زیادہ سرسبز کار و دولتدار ہی کے وفادار تھے)۔

کوئی ہفتہ بعد مجھے شہزادہ عالم گیر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے عدالت میں طلب کیا اور مسکرا کر مقدمہ واپس لینے کا حکم سنایا میں نے ان کے خوشگوار رویہ کا شکریہ ادا کیا دوستوں سے ملا کھلی نقیلا پر حسرت بھری نگاہ کی اور جیل لوٹ آیا۔ چھ ماہ مقدمہ میں نکل گئے اور اب ساڑھے چار برس تک باہر جانے کا سوال ہی ختم ہو چکا تھا۔

### تکرار ہو گئی

آتے ہی شیرنگھ سے جھڑپ ہو گئی میں نے ڈیڑھی پہنچ کر مطالبہ کیا کہ اب مجھے ساتھیوں میں بھیج دیا جائے شیرنگھ نے کہا سوچیں گے؟ میں نے کہا سوچنے کا سوال ہی نہیں اُس نے کہا سوال

موجود ہے میں نے کہا سوال طے ہو چکا ہے جیلر نے کہا آج ہی نیک پڑھنے کو باہر لکھ دیں گے جواب  
آنے پر اگر منگھری میں رکھنے کا حکم ملا تو ساتھیوں میں ملا دیا جائے گا ورنہ جہاں کا حکم ہو گا وہاں بھی  
دیں گے۔

کب تک جواب آئے گا؟

— ہفتہ عشرہ میں فی الحال چھپکی میں رہو۔

ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا جواب نہ آیا میں نے تقاضا شروع کیا خیال تھا کہ جواب آچکا ہے شیر سنگھ شہرت  
کر رہا ہے اُس نے بہت سی کتابیں روک رکھی تھیں جب مانگو یہی کہتا سی آتی ڈی کے پاس سنس  
ہونے لگی ہیں ارمانِ حجاز؟ وہ بھی انہی کے پاس ہے ریمانڈر بھیجا ہے جواب آ رہا ہے مل  
جائیں گی چودہری مرید احمد (جلبر) نے تاریخ اسلام مصنفہ سداکبر شاہ نجیب آبادی بھجوانی اُس نے  
وہ بھی روک لی چودہری صاحب پریڈ پر آئے تو حیران ہوئے کہ اُن کی بھجوانی ہوئی کتاب بھی رُوکی  
پڑی ہے۔ شیر سنگھ سے پوچھا اُس نے آئیں بائیں شائیں کر کے مال دیا۔ میں نے کہا  
چودہری صاحب! آپ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس شخص کا رویہ کیا ہے؟ جب یہ  
آپ کے ماتحت ہو کر آپ کا حکم نہیں مانتا تو ہم قیدیوں کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہو گا چودہری صاحب  
سر جھکا کر چلے گئے۔

شیر سنگھ نے ہمیں دیرانے کے سپرد کر رکھا تھا۔ ہر لحظہ ایک خوفناک سناٹا محیط رہتا کئی طرح  
کے خیالات پیدا ہوتے ہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے جنگ کہ عرصہ مار ہی ہے کون جیت  
رہا اور کون ہار رہا ہے بس اُڑتی ہوئی خبریں ملی آتی تھیں کہ ہٹلر تخت و تاراج کرتا ہوا بڑھ رہا  
ہے انگریز ہار رہے ہیں یورپ کے بہت سے ملک سپر انداز ہو گئے ہیں روس پر نول رہا ہے۔

سوئیٹز لینڈ بچا ہوا ہے ترکی جنگ کے دہانے پر ہے۔

اخبارات ہمارے لئے شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتے تھے ظاہر ہے کہ اس قسم کی تنہائی سے انسان میں دو طرح کے جذبات پیدا ہونے ہیں یا تو بزدل ہو کر سست ہار دیتا ہے بعد اللہ اپنی چٹری میں خوت ہی نہیں تھایا پھر انتہائی دلیر ہو جاتا ہے غصہ بھی آتا ہے اور وحشت بھی ہوتی ہے اللہ وائے لوگ اس سے تزکیہ نفس کی برکات حاصل کرتے ہیں خال خال لوگ سلوک و طریقت کی منزل میں ملے کر جاتے ہیں۔

شیر سنگھ نے ایک دن میرے سامنے اٹھارہ سیر گندم رکھوا دی میں بھلا کہاں پیتا اور کیوں پیتا؟ کلٹی کا ڈولم جس طرح آیا تھا اسی طرح پڑا ہا شیر سنگھ نے دن ڈھلے استفسار کیا میں نے رید تک نہ دی وہ ذرا جھجلا کے بولا مجھے تاؤ آگیا جھڑپ ہو گئی تو تو میں میں تک نوبت جا پہنچی میں نے غصہ میں آکر بڑا بھلا کہا اس نے نتھنے ٹھیلانے شروع کئے میں نے انقلاب زندہ باد اور ہندوستان آزاد کے نعرے بلند کئے وہ کتنا بکارتا چلا گیا اگلی صبح پھر اٹھارہ سیر گندم کا ڈرام رکھوا دیا مجھے اب سخت غصہ آیا میں نے حاجی عبدالکریم چیف بیڈ وارڈ سے کہا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ہاتھ جو قلم و قرطاس کے لئے ہیں اٹھارہ سیر گندم بھی پس سکتے ہیں؟

وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا شیر سنگھ آگیا ہمارا چ پیسے نا کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

”ہمارا چ یہ نہیں پے گی“

”یہ تو پسینی پڑے گی“

”تو آپ خود تکلیف کر لیجئے“

”SHUT UP!“ شیر سنگھ نے بھنکا کر کہا۔

”YOU SHUT UP!“ میں نے منہ توڑ جواب دیا

اٹلے پاؤں واپس چلا گیا۔



## مارکٹائی

دو چار منٹ ہی میں مبارزالی اور ڈیرہ غازی خان کے قیدی منبرداروں کا ایک جتہ وارد ہو گیا۔ ہالاکھوہ مجھ پر کبل ڈالا اور گڈرگٹ شروع کر دی گڈرگٹ پنجاب کے جیلوں کی اصطلاح میں اُس ظلم مار کو کہتے ہیں جو کسی عاجز یا خود سر قیدی کو پٹتی ہے کوئی دس بارہ نمبر واز قیدی پر کبل ڈال دیتے پھر اُسے ڈنڈوں، جوتوں، ٹھنڈوں اور گولوں سے پیٹتے ہیں جب قیدی مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو جاتا تو اسے تنہائی میں پھینک کر چلے جاتے ہیں ان چھ سات قد اور قیدی منبرداروں نے پندرہ بیس منٹ مجھے خوب پیٹا حتیٰ کہ میں ہلکان ہو گیا ایک نے میرا منہ بند کیا دوائے بازو پکڑ لیتے تمیرے نے پاؤں باندھے باقی پیٹتے رہے نکسیر نہ پھوٹی تو شاید اور مارتے لیکن ادھو اچھوڑ کر چلے گئے کوئی دس منٹ بعد ہوش آیا تو سب اسٹنٹ سرجن موجود تھا دیکھ داکھ کر چلا گیا — کچھ ٹکیاں بھیجیں کچھ ٹنگچر میں نے ٹکیاں اور ٹنگچر لینے سے انکار کر دیا شیرنگے پھر آیا میں نے پانی کی جھڑاٹھا کر سلاخی دروازے سے دے دی۔ اُس کے سوٹ پر کچھ پھینٹے پڑے بھاگ نکلا میں غصہ سے آگ بگولا ہو گیا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا ایسے کلمات کہے کہ جیل کے درو دیوار گونج اٹھے جیلرو ڈرا ڈرا آیا سپرنٹنڈنٹ بھی آ گیا میں نے اُن کو بھی نشانے پر رکھا منہ تکنے لگے میں نے چلا کر کہا تم لوگ اس ظلم میں برابر شریک ہو شیرنگے پھر داخل ہوا میں دیکھتے ہی آگ بھجھو کا ہو گیا۔

”نکل جاؤ سور کے بچے“

میں نے چکی کا پاٹ اٹھا لیا تھوڑی ہی دیر میں گارو آگنی سپرنٹنڈنٹ نے منت سماجت کی جب رتے ٹھنڈا کیا میرا مطالبہ تھا شیرنگے کو یہاں سے نکال دو سپرنٹنڈنٹ نے اشارہ کیا اور وہ نکل گیا میں نے ظہیر حسین شاہ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا کہ اس شیطان کو بھی رخصت کر دو وہ بھی جلتا ہوا حاجی عبدالکریم کو



ایک تقریر میں منوڈ ہو کر آیا دو سال سزا ہوتی تھی انتہائی دلیر اور بہادر تھا اسی اثنا میں شیر سنگھ نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت چھ ماہ کا ایک اور قیدی ہم میں لا ڈالنا قلعہ محمد نام تھا کس جماعت سے تھا وہ میں معلوم ہو سکا نہ وہی بتاتا تھا ایسا پڑھا لکھا بھی نہ تھا شکل و صورت سے شبہ معلوم ہوتا خیال یہ۔ خاکہ سی آئی ڈی نے بھجوا یا ہے دوستوں سے با تھا پائی اس کا شمار ہو گیا۔ بہ حال ہم اُسے منہ نہ لگاتے جب تک میر طاوہ ہا وہ بھی رہا جو ہنی میر داد کا چالان ہو گیا وہ بھی چلا گیا کچھ معلوم نہ ہو سکا کون تھا؟ کیوں آیا کیسے آیا؟ کہاں چلا گیا؟ — کام و ام ہم کچھ نہیں کرتے تھے تمام دن خوش گپیوں میں کٹتا کتابوں کے حصول کی کوششیں جلدی تھیں لیکن کامیابی کے آثار مفقود تھے۔ اخبارات کا مطالعہ بھی جاری تھا بلکہ ہم نے تو کھائی کے سامان کا مطالعہ بھی کر رکھا تھا جواب یہ ملتا کہ لاہور سے کوئی جواب نہیں آ رہا ہے۔ بہتری کوشش کی کسی کھیل کی اجازت ہو جائے مثلاً والی بال کے لئے درخواست کی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہر درخواست معلق ہو جاتی۔ دستی کھیلوں (INDOOR GAMES) کے لئے ہزار جتن کئے نہ شطرنج ملی نہ تاش نہ لڈو۔ ہر روز آج کل یہ مالا جا رہا تھا آخر ہم نے کبڈی کھیلنا شروع کی میر داد اور میں اچھے کھلاڑی تھے مگر مولانا گل شیر سب کو مات دے گئے دوسرے درجے پر رہمان تھا مولانا سے کچھ کچھ لگا کھانا ایک دو بار ان کی پکڑ سے بھی نکل آیا تھا اور کسی کے فابو میں نہیں آتا تھا تو جھوٹا عمر کم مگر سب میں دلیر کیمپ پور کا نوجوان نظام الدین بھی کبڈی میں آتا تھا مولانا گل نیرا کت تھی پر سید غیرت مند، صانع، عبادت گزار، نبرد خوان، کم آمیز باحیا اور جسور وغیرہ انسان تھے لیکن کبڈی کھیلنے وقت شیر معلوم ہوتے تھے۔

عطا اللہ شاہ، ڈگلس بنگ سکند حیات

شاہ جی کے خلاف گجرات میں ۱۲۱- الف کا جو مقدمہ بنایا گیا اس کا سرکاری رپورٹر لدھارام مخرف

ہوگا اس نے عدالت میں بیان دیا کہ میں نے یہ تقریر صوبائی حکومت کی ہدایات پر مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اشارے سے تیار کی ہے اب میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں ایک بے گناہ انسان کے خلاف جھوٹے دعوے اس بیان سے تھمک کر چلا گیا میں عبدالعزیز اور دیوان چمن لال نے مقدمہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے ڈاکٹر عبدالقوی کی معیت میں پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ سے ملاقات کی تمام قصہ سنایا اس نے کہا اگر یہ سچ ہے کہ آپ کے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے جا رہے ہیں اور سکندر حیات اپنی ذاتی عداوت کے باعث آپ لوگوں کو پھنسا رہے ہیں تو مطمئن رہیے انصاف مجروح نہیں ہوگا لیکن آپ لوگ بھی تو فوجی بھرتی کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔

”اس قسم کے خوفناک مقدموں میں پھنسنے کی بجائے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں ایک دو برس قید ہو جانا زیادہ بہتر ہے“ مولانا نے سوان کو لپیٹ کر جواب دیا ینگ کو یہ بات قدر سے دل لگی اس نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کر لیا۔

سکندر حیات اور ڈگلس ینگ میں کسی وجہ سے کھچاؤ تھا گورنر نے دیکھا کہ نقشہ بگڑ رہا ہے اور اس سے ایک ایسی جماعت کو فائدہ پہنچے گا جو مزاجاً انگریزوں کی دشمن ہے تو اس نے ینگ کو بلا کر کہا کہ جنگ کے ان ایام میں سکندر حیات کی رسوائی کا مطلب ہے ایک جگری دوست کی رسوائی، صوبہ بھر میں جنگی مساعی اس کے دم قدم سے ہیں اس کا نقصان اس وقت ہمارا نقصان ہے احرار فطرتاً ہمارے دشمن ہیں اور ان کی تاریخ ہی یہی ہے۔

ینگ سپرینڈنٹ ہو گیا لیکن اس نے دونوں وعدے پورے کئے۔ شاہ جی کو بھی چھوڑ دیا اور سکندر حیات کا دامن بھی داغدار ہونے سے بچا لیا۔ البتہ لدھیانوی قید ہو گیا۔

سر ڈگلس ینگ ایک دن منگرمی سنٹرل جیل میں آنکلا چھ ماہ سے ہماری داڑھیاں بڑھی

ہوتی تھیں بال بھی ٹک گئے تھے کہنے لگا کچھ کتنا چاہتے ہو، ہم نے کہا جی نہیں کوئی خاص بات نہیں البتہ بال بنوانے کی سخت تکلیف ہے دیکھتے واڑھی کے بال بھی بڑھ گئے ہیں شیو کا انتظام ہونا چاہیے یگ نے سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھا سپرنٹنڈنٹ نے کہا سی کلاس قیدیوں کے لئے کوئی انتظام نہیں بال تو نائی کاٹ جانا ہے شیو مشکل ہے انکسٹریٹل سے اجازت لینی پڑتی ہے ہم نے انہیں لکھا ہے ابھی تک جواب نہیں آیا یگ نے رُخ پلٹ کر سوال کیا۔

”آپ لوگ جگہ کو ششوں کے خلاف ہیں اور اسی لئے قید ہوتے ہیں؟“

”ہم اپنی آزادی کے لئے قید ہوتے ہیں۔“

”آپ کو معلوم ہے یہ جنگ جمہوریت اور فسطائیت کے درمیان ہے ہٹلر جیتا تو تہذیب فنا ہو

جاتے گی فسطائیت میں پولیٹیکل قیدیوں کو گولی مار دی جاتی ہے“

”مارا ازیں چہ قصہ گاؤ آمد و خروجت“

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ یگ کے استفسار پر سپرنٹنڈنٹ نے ترجمہ کر ڈالا لال بھجوا کا

ہو گیا جانے لگا تو ہم نے جواب چاہا بھڑک کر بولا۔ ”ہٹلر استرا لے کر آ رہا ہے بہترین شیو کر دے گا“ ہم کھکھلا کر ہنس پڑے جاتی دفعہ آفیشل وزیر تکب میں لکھ گیا کہ پولیٹیکل قیدی شیو اور گستاخ ہیں۔

### بد فطرت شیر سنگھ

اُس کے یہ بیمار کس شیر سنگھ کی فطرت کے لئے مہینہ ہو گئے وہ اور بھی شیر ہو گیا اپنی فطرت

بد فطرت کے لئے نہ وہ تیار ہوا نہ ہم زچ ہوتے نتیجہ یہ نکلا کہ جانین میں پہلے کی طرح جو بچپن شروع

ہو گئیں وہ رحمت دکھاتا ہم امانت کرتے ہر شخص کی عزت نفس کو مدد پہنچانا اُس نے

اپنے اوپر فرض کر لیا تھا دو چار روز کی چھٹی پر لاہور گیا واپس آیا تو مولانا محمد گل شیر نے

## رہا پوچھا

”لاہور کیا ہے؟“

”بڑی گھاگھی ہے دفتر احرار کا بورڈ اور جھنڈا دونوں اتر چکے ہیں مالکوں نے وہاں شراب

کی دوکان کھلوا دی ہے۔“

ظاہر ہے کہ شیر سنگھ تحقیر کر رہا تھا۔ مولانا نے احرار کا نہیں لاہور کا پوچھا تھا حکیم غوث محمد کو غصہ آیا ڈانٹ دیا لیکن شیر سنگھ کے لئے اسی میں مزہ تھا کہ دوسروں کی اہانت کرتا رہے اور خود بے عزت ہو گیا دفعہ ہر کر بھی اس کے ٹکٹے میں تھے عجب عذاب کے دن تھے کتابیں نہ رسالے خط نہ پتر۔ ملاقاتی نہ ملاقاتیں ہم پو پھتے کوئی خط آیا ہے؟ جواب ملنا بالکل نہیں کوئی لکھے تو آئے۔ ملاقاتی؟ ہنستا اور کہتا کس سے ملاؤں کوئی آتا ہی نہیں۔ قرون مظلمہ کے سے قیدیوں کا حال تھا گویا بلیک ہول میں پڑے تھے فیصیں ناف تک بازو کہنیوں تک گلے تنگ پا جامے گھٹنوں سے ذرا نیچے اور ٹخنوں سے ڈھیر اونچے موری چھوٹی جو تاٹوٹ جائے تو موچی نڈار دوسو کھنچیں بڑھی ہوئیں ڈاڑھی لٹکی ہوئی بال پھیلے ہوئے اپنی ہی لگاہوں میں کارٹون نظر آ رہے تھے سپرنٹنڈنٹ کے وعدے دو شہزہ کی کہہ مکرناں ہو گئے تھے۔ تنگ آمد جنگ آمد ہم نے ایک دفعہ پھر لڑائی کرنے کی ٹھانی فہمد کیا کہ سیاسی قیدیوں کے لئے جو روایتیں اور رعایتیں چلی آئی ہیں انہیں حاصل کریں منگمری سنٹرل جیل مادی جرموں کے لئے ہے ہمیں صوبہ بھر کے سیاسی قیدیوں سے انگ رکھا گیا اور جو سلوک یہاں ہو رہا تھا ہیما نہ تھا۔ کوئی سوال کرتے جواب مانا جیل مینول اس کی اجازت نہیں دیتا ہم کو تے جیل مینول ایک بوسیدہ کتا ہے جس اندھے شخص نے پون صدی پہلے ترتیب دی تھی وہ لازماً صاحب اولاد نہیں بناتا اب اس زمانے میں اسے کہاں لئے پھرتے ہو۔ حکام کے کانوں پر جوں تک نہ ریگتی شیر سنگھ بن بیٹھے پننگ کی طرح اڑا پھرتا جب پانی سر سے گذر

گیارہ ہفتے طور پر پاس تجربہ پر پینچے کہ

(۱) ہمارے ساتھ غایت درجہ ہیماز اور وٹھیانہ سلوک ہو رہا ہے

(۲) افسران مجاز ہماری جائز باتوں کو بھی قبول نہیں کرتے ہیں

(۳) موجودہ قید تنہائی بلا ميعاد ہے

(۴) شیر سنگھ بیرونی ہدایات کے تحت ہمیں پریشان کر رہا ہے سپرنٹنڈنٹ اور ڈائری

اس کے سامنے بے بس ہیں۔

(۵) ہم بہر حال پڑھے لکھے لوگ ہیں ہمیں نوشت و خواند کے سامان سے محروم کر کے ہم

پر وحشت مسلط کر دی گئی ہے۔

تو ہم نے جرات زندان کا فیصلہ کیا ہم یہاں تقریباً اسی فیصد مسلمان تھے باقی اب تین ہندو

اور دو سکھ تھے دو میں ایک اکالی تھا۔ کئی روز سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ بھوک ہڑتال

کریں۔ مولانا گل شیر مذہباً بھوک ہڑتال کے خلاف تھے صوفی عنایت محمد سپوری نے خرابی صحت

کی بنا پر عذر کیا طے یہ پایا کہ سب سے پہلے تین تین دن تک علامتی بھوک ہڑتال کروں اگر جیل کے

حکام مطالبات تسلیم کر لیں ورنہ تسلیم کریں تو باقی دوست جو بھوک ہڑتال میں شریک ہونا چاہیں ایک

ساتھ شامل ہو جائیں۔

### بھوک ہڑتال

جیل کے حکام نے پہلے تین دن بظاہر کوئی نوٹس نہ لیا چوتھے روز میر وادخان، احسن عثمانی،

برہانند، عبدالعزیز، غوث محمد، سنیا رام عرف بندے ماترم بھی بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے

شرا حضوری میں راجندر سنگھ آتش بھی شریک ہو گیا اب افسروں نے بھی تھکے محسوس کیا اور

اٹھا کر ہمیں چھپکی میں بند کر دیا۔ بدھ ہی ایسا تھا کہ جیل کے حکام لرز اٹھے اُن کے سان گمان میں نہ تھا کہ بھوک ہڑتال اس طرح چلے گی اور ہم آخر کار جان کی بازی لگا دیں گے سپرنٹنڈنٹ صبح و شام آکر چلا جاتا جیلر منتیں کرتا شیر سنگھ کو ہم گھسنے نہ دیتے ہم نے اُسے ایک گالی بنا دیا تھا۔

وہ اپنے واؤں پر لگا رہا راخندر سنگھ کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ شریا حضور نبی میں ساتھ ہو گا ہے لیکن معلوم ہوا کہ شیر سنگھ کے ایما سے بھوک ہڑتال تڑوانے کے لئے شامل ہوا ہے اُس نے ایک آدھ سا بھی کوورنٹ لانا چاہا مگر کوئی ساہتمکن ڈانہ چلا شیر سنگھ نے پہلے دن یہ کیا کہ پانی بند کر ڈالا اور کوٹھڑیوں میں سے بھجھریاں نکلا لیں مٹی جون کے دن تمھے حکیم غوث مُد بیمار چلے آ رہے تھے انہوں نے مار بار پانی مانگا لیکن فرات پر یزید کا پرہ تھا غلام حسین (جمعدار) مسکرا کے نکل جانا منبر وار بہرے ہو گئے چوہیں گھسنے پانی بند رکھا دوسرے روز صبح سویرے سول سرجن اپنے ساتھ دو ڈاکٹر اور منبر واروں کی ایک کھیپ لے کر اپنا شیر سنگھ کا خیال تھا کہ ہم پانی سے گھبرا کر بھوک ہڑتال چھوڑ دیں گے دیکھا کہ وار خطا گیا اور ہمارے حوصلے پہلے سے بھی زیادہ جوان ہیں تو خود ہی بھجھریاں رکھو ادیں ڈاکٹروں نے رٹر کی باریک نالی کے ذریعے ناک سے دودھ دینا شروع کیا صبح و شام دوسیر دودھ دیا جاتا دودھ میں انڈے ملے ہوتے۔

اس میں خطرہ بھی ہوتا ہے بھوک ہڑتالی مزاحمت کریں تو بعض دفعہ ناک سے خون آنے لگتا اور اندر زخم ہو کر آدمی موت کے دروازے تک پہنچ جاتا ہے مزاحمت کو روکنے کے لئے قیدی منبر وار بھوک ہڑتالی کو چیت لٹا دیتے اور ہاتھ پاؤں پکڑ کے دودھ دیتے ہیں ہفتہ عشرہ بعد بھوک ہڑتالی کی خبر شہر میں چلی گئی اخباروں میں چھپا تو حکام پریشان ہوئے سپرنٹنڈنٹ نے دن میں کئی دفعہ پھیرے ڈالنا شروع کئے مطالبہ صرف یہ تھا کہ ہمارے ساتھ انسانی سلوک ہو اور ہمیں وہ تمام مراعات دی جائیں جو سیاسی قیدی کو حاصل ہیں ہم شیر سنگھ کے تبادلے پر زور دیتے



دور کھلی ہوئی رہنا چاہتے تھے۔ بظاہر یہ مطالبات ایسے نہ تھے کہ حکام بند کرتے لیکن حکام بھی مندر پر تھے اور ہم بھی ہسٹ کے پکتے تھے دونوں تک کٹا چینی رہی میں ذاتی طور پر بھوک ہڑتال کو سخت کر کے نہ صرف تتمہ کو جلد قریب لانے کا متمنی تھا بلکہ جان دینے پر تیار بیٹھا تھا ڈاکٹر بمشکل تمام میرے حلق میں دودھ ڈالتے میں مزاحمت کرتا دیر تک کشمکش رہتی آخر ایک منبر دار مجھے پاؤں سے پکڑتا ایک بازوؤں سے تیسرا دھڑ سے چڑھا چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیتا نالی ناک میں باقی ادھر وہ دودھ دے دے چکتے ادھر میں دانتیں ہاتھ کی انگلیوں کو حلق میں پہنچا کر عاصو عاصو کرنا دودھ باہر آجاتا ڈاکٹر پریشان اور حکام عاجز آچکے تھے بالآخر حکام کو سپر انڈاز ہونا پڑا کوئی پندرہ دن بھوک ہڑتال رہی تمام جیل گونج اٹھا۔ باہر نسلک مچ گیا سپرٹنڈنٹ نے تقریباً سبھی مطالبات تسلیم کر لئے۔ شیر سنگھ کو تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو رہا تھا کہ راجندر سنگھ آڑے آگیا اس نے کہا آپ محض اس لئے اسے بدلوا رہے ہیں کہ سکھ ہے ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا اب چونکہ ایک سکھ ساتھی سے الجھنا مناسب نہ تھا لہذا ہم نے اس مطالبہ ہی کو ترک کر دیا لیکن اس کا نتیجہ ہمیں جلد ہی جھگڑنا پڑا میری صحت کا حال یہ ہو گیا کہ جیسے مشت استخوان ہو۔ ہوا کا بھونکا سہنا مشکل ہو رہا تھا۔ باقی ساتھی بھی صحت ہار چکے تھے۔ حکیم غوث محمد کی صحت کو بے حد نقصان پہنچا۔ وہ عمر بھر کے لئے دمہ کا شکار ہو گئے۔ افسوس کہ پچھلے دنوں ان کا انتقال ہو گیا۔ ————— انا اللہ وانا الیہ راجعون

اب ہم اس حد تک آزاد تھے کہ دن رات کھلا رہتے۔ اخبار بھی آنے لگا لیکن شیر سنگھ عقب ہی رہا بلاناظر اخبار کو قینچی سے ذبح کرتا ایک آدھ خبر ضرور کٹی ہوتی۔ بہر کیف کفنے پڑھنے کا سامان لینے لگا روٹی اچھی ہو گئی صبح و شام مجلس لگتی آپس میں تبادلہ افکار ہوتا میرا وہ تمام دنیا میں گھوم آیا تھا روس میں بہت دنوں تک رہا بڑے بڑے انقلابیوں کے ساتھ کام کر چکا تھا اکثر اپنے تجربات سناتا کتابوں کا کٹیرا تھا چھ گھنٹے سوتا سولہ گھنٹے پڑھتا اور دو گھنٹے باقی ضروریات

پر صرف کرتا۔

### ایک اور ساتھی

ہماری بد قسمتی سے انہی دنوں دھیانے سے ایک لہر ساتھی کالی چرن شرما آگیا۔ کچھنے کو ڈاکٹر لیکن - سٹانی، ذات کا برہمن لباس کانگریسی، بن ہما سبھانی چال چلن داغدار راجندر سنگھ آتش کا ہمنوا! ہم لوگ تو شیر سنگھ سے بولتے نہیں تھے صرف راجندر سنگھ کھسر پھسر کرتا یا اب کالی چرن شریک ہو گیا اپنے برہمن ہونے کی وجہ سے پنڈت من موہن ناتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کا معتمد ہو کر معتمد ہونا چاہا پھر بانے کم سخت کو کیا سو بھی ایک دن خود ہی مشقت طلب کی اور چرخہ کاتنے لگا سپرنٹنڈنٹ کے ہفتہ وار معائنہ پر ہم پر بیڈ نہیں لگانے تھے اُس نے باقاعدہ پریڈ لگانے شروع کی تو کا اور روکا تو کہا میں آپ کا ساتھی نہیں گاندھی وادی ہوں ہم نے کہا گاندھی وادی یہ نہیں کیا کرتے جو تم کر رہے ہو ہم نے جو کچھ لگاتار جدوجہد سے حاصل کیا اس کو برباد کرنا چاہتے ہو؟ تم نے خوشامد کی ایک نئی راہ کھولی ہے ہاں، میں برہمن ہوں سپرنٹنڈنٹ جیل بھی برہمن ہیں میں اُن کی خوشامد نہیں تعظیم کرتا ہوں غرض اس قسم کے اثنیٰ چھوڑنے میں شتاق تھا ایک دن ہم نے اسکی مرمت کر ڈالی راجندر سنگھ آتش نے ہم سے تیسری دفعہ آنکھیں چاڑھیں اتفاق سے دو اور سکھ قیدی بھی آپکے تھے انہوں نے ہمارا ساتھ دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کالی چرن اور راجندر سنگھ کچھ دنوں عیش کرنے کے لئے ہسپتال بھجوا دیئے گئے کہاں انہیں دودھ مکھن ملنے لگا۔ ہم از سر نو شیر سنگھی حرکات کا شکار ہو گئے۔

### بہادر دوست

برہمنانند کا سرسری ذکر آچکا ہے گورا چٹانگ، نین نقش تیکھے موٹی موٹی آنکھیں، میانہ قد،

پھر سیابن گوروکل کانگری کا فارغ التحصیل، غرض بڑا ہی خوش سلیقہ نوجوان تھا۔ ہم بھی مل سکے۔  
 رول کھاتے وہ سب کے برتن مانتا اور کبھی کبھار میرے یا مولانا گل شیر کے کپڑے بھی دھو دیتا۔  
 میں بھی کسرتی بن کا نوجوان تھا کالی چرن اور راجندر سنگھ عمر میں اس سے کہیں بڑے تھے بلکہ قد و قامت  
 میں بھی لیکن دونوں اس سے بڑی طرح ڈرتے میرے ساتھ اس کا پیار ہو گیا ہم دونوں ایک دوسرے  
 کے قریب ہوتے گئے میں نے اس سے ہندی پڑھنی پابھی نہ پڑھ سکا اس نے مجھ سے اردو کی بھی  
 اور کامیاب رہا علامہ اقبال کا کلام میں نے اس کے دل و دماغ پر نقش کرویا تاریخ اسلام پڑھائی مولانا  
 سید عیسیٰ ندوی کی سیرتی تقریریں (خطبات مدراس) پڑھنے کے لئے دیں۔ مذہباً وہ آریہ سماجی تھا اور  
 گوروگل کی تعلیم کے باعث ایک سماجی کی عصبیتیں بھی اس میں کسی قدر موجود تھیں لیکن ہماری صحبتوں نے  
 اسے تہذیبی طور پر مسلمان کر لیا تھا وہ ہم میں گل مل گیا اس کی زبان کو ہمارے ہی آداب کی چھاپ  
 لگ گئی تھی۔

### شیر سنگھ یا عقرب جہازہ

شیر سنگھ نے سب معمول مصرع اٹھانا شروع کیا تو ہم بھی گرہ لگانے لگے ایک دن شراب پی کر  
 آنکلا مولانا گل شیر نٹل رہے تھے اب کچھ دنوں سے انہیں مولانا صاحب کہہ کر پکارتا تھا  
 لیکن آج لہجہ ہی دوسرا تھا۔

گل شیر ایدھر آج بھی (گل شیر ادر آؤ)

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ میں نے بڑھ کے کہا

”سروراجی! مخاطبت کا یہ طریقہ نہیں! مولانا ہم سب کے بزرگ اور ہمارے دینی پیشوا

ہیں آسکے سے کہ انہیں خطاب کرتے وقت تو اخلاق سے مبرا آتو۔“

مذہبی سکھ تھا اور پی کے آیا تھا تجارت سے سُکرا یا میں دُرشت ہو گیا اُس نے گالی بکی میں نے تھپڑ دے مارا معاملہ بگڑ گیا جمعداروں کا غول آپہنچا نمبرداروں نے پرا بانڈھا اور ڈروں نے ڈنڈے اٹھائے دار و فرہ ابرا جاسپر فنڈنٹ چلا آیا لیکن یہ لوگ آئے اور پلے گئے کوئی تو بجے شب ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ صبح گنتی کے وقت ہماری چکیاں نہ کھلیں تو ماتھا ٹھنکا کہ اُفتاد آرہی ہے تھوڑی سی دیر میں ہر ایک کو ہتھکڑی لگا کر الگ الگ نکالا اور مختلف جگہوں میں بانٹ دیا۔ کوئی پہلے بلاک میں کوئی دوسرے میں کوئی تیسرے میں کوئی چوتھے میں فرض سب کو بکیر دیا گیا مجھے پہلے نمبر کی چکی میں رکھا گیا جو درجہ اول کے بد معاشوں کے لئے مخصوص تھی اس اقدام کی نہ کوئی وجہ بیان کی گئی نہ یہ پتہ چلا کہ کون کہاں ہے؛

میں نے اپنے آپ کو تنہا پا کر بھوک ہڑنال کی دھمکی دی لیکن شیر سنگھ پر کیا اثر ہوتا؛ پھر کچھ سوچ کر میں نے ارادہ ملتوی رکھا اسنے میں نمبردار اٹھارہ سیر گندم کا بس اٹھا لایا پیسو میں نے قہقہہ لگایا اور اپنی کھڑی پر لیٹ رہا دن بھر اس اچانک اُفتاد پر سوچتا رہا۔ کئی دفعہ جمعدار آیا اور ڈرنے ٹوکا نمبردار کہتے رہے کہ لیٹے کیوں ہو؛ چکی پیسو میں نے جیسے سنا ہی نہیں شام کو شیر سنگھ پہلے دنوں کی طرح غرتا ہوا آیا وہی سوال و جواب

”ممداراج چکی نہیں پیسی“

”آج تک نہیں پیسی یہ اخلاقی قیدیوں کا کام ہے۔“

”اچھا تو پھر پا جا مے میں سے ناڑہ نکال دیجئے“

”یہ نہیں ہوگا۔ آپ خواہ مخواہ الجھ رہے ہیں۔“

شیر سنگھ نے نمبرداروں کو حکم دیا کہ ناڑہ نکال لو میں نے روکا نمبردار آگے آنے کی ہمت نہ کرنا“ شیر سنگھ نے دائیں رخسار پر طمانچہ دے مارا یہ حوصلہ اُس نے پہلی دفعہ کیا تھا حیران رہ گیا معاملہ

کیا ہے، میں نے ہانڈو کپڑا کر دکھایا، نبرداروں نے فوراً رخ میں لے کر مجھے الٹی تھکڑی پہنا دی  
شیرنگہ نے طمانچہ بازی کا شغل شروع کیا میں اس کی اس تجارت پر انگارہ ہو گیا اس کے پیچھے پر  
کھڑکھڑا پایا لیکن وہ پھرتی سے دروازہ کے رخ پر ہو گیا نتیجتاً میرا سر آہنی سلاخوں سے ٹکرا کر پھٹ  
گیا خون کا فوارہ بہہ نکلا شیرنگہ اور جمدار غلام حسین شاہ دونوں باہر نکل گئے نبردار بھی ہوا ہو گئے  
نہ کوئی ڈاکٹر آیا نہ کوئی کمپونڈر میں نے خود ہی گیلے پانی کی پٹی باندھ دی تھوڑی دیر خون رستار ہا  
پہ رہ کر خود ہی بند ہو گیا اگلی صبح منہ اندھیرے نبرداروں کی ایک کھیپ نے مجھے وہاں سے نکالا  
اور چھ پتلی کے کالے پانی میں لے گئے شیرنگہ بھی آگیا جمدار غلام حسین شاہ نے مجھے الٹی تھکڑی  
لگا دی نبرداروں نے کسبل ڈالا اور کچھ کسے سے بغیر گڈ ٹکٹ شروع کر دی تمام نبردار ڈیرہ غازی نجا  
کے بلوچ یا میانوالی کے پٹھان تھے میں مار کھا کر ادھ تو ہوا گیا ڈاکٹر نے دن بھر اس طرف کا رخ  
ہی نہ کیا تمام بدن چور چور ہو چکا تھا سارا وقت زخموں سے کراہتا رہا کچھ معلوم نہ تھا کہ باقی سانحہ  
کہاں ہیں؟ قیاس تھا کہ مختلف احاطوں کی چکیوں میں بند پڑے ہیں غرض یہ دورا تیس اور دو  
دن تمام قید پر بھاری رہے۔ ملال یہ تھا کہ شیرنگہ کو اتنی جرات کیسے ہوتی کچھ سمجھ میں نہیں  
آ رہا تھا آخر بڑے سوچ بچار کے بعد میں نے بھوک ہڑتال کر دی شیرنگہ نے حسب عادت پانی  
کی جھجھکھڑالی کھڑی تھکڑی لگوادی اگلے روز ٹاٹ دوری اور اس سے اگلے روز ڈنڈا سٹری بیس  
صرف جو اس کا مجموعہ رہ گیا جیل والے بھی سخت ہوتے گئے سپرنٹنڈنٹ کا پتہ نہ چلا کہاں ہے؟ نہ  
جیلر آیا ساتویں روز دیکھا کہ میری حالت غیر ہو گئی ہے تو سپرنٹنڈنٹ آنکلا جیلر بھی آگیا بیڑیاں وغیرہ  
اُترادیں۔ نالیوں سے دودھ دیا جانے لگا میں نے مزاحمت کی مقابلہ تیز ہو گیا سپرنٹنڈنٹ وہ سپرنٹنڈنٹ  
ہی نہ رہا تھا اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا کہنے لگا

اب تم اکیلے ہو، تمہارے سانحہ دوسری جلیوں میں بھجوا دیئے ہیں معافی مانگو گھر جاؤ

غریب آدمی ہو کیا لوگے مدت ہو گئی ہے نہ تمہاری ملاقات کے لئے کوئی آیا نہ کسی نے  
خط بھیجا جس جماعت سے تمہارا تعلق تھا وہ فنا ہو گئی انگریزوں کو ہندستان چھوڑنا پڑا تو جن  
قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے کا حکم میرے پاس ہے اُن میں تمہارا نام بھی ہے کیوں حرام موت  
مرتے ہو؟ مسلمانوں میں تمہیں کوئی پوچھتا نہیں کانگریس کے رہنما تمہارے ویسے ہی  
خلاف میں جان ہو سکھوں میں ہے — — — چھٹی نو

پنڈت من موہن ناتھ کے اس رُوکھے پن پر مجھے رحم آیا کہ آج اس لہجہ میں بول رہا ہے  
میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا صرف اتنا کہا نصیحت کا شکریہ مجھے مر جانے دیجئے۔  
”تمہاری مرضی“

سپرینٹنڈنٹ یہ کہہ کر چلا گیا۔

گیارہویں یا بارہویں دن جیل والوں نے اپنے فن کی انتہا کر دی میرے دونوں ہاتھ باندھ  
کر مجھے جھٹکے سے لٹکا دیا پاؤں تلے گڑ کا پانی ڈال کر کڑے کھڑے چھوڑ دیئے کیوں؟ فرمان خسروی  
تھا کہ معافی مانگو اور گھر جاؤ۔ میں نے شیر سنگھ کو دو ٹوک کہا تمہیں جس نے یہ کہا ہے اس سے کہو  
شورش کی لاش یہاں سے نکلے گی معافی نہیں مانگے گا لٹکا سا جواب پا کر واپس ہو گیا تشدد کا  
زور بندھا تو میں نے قرب و جوار کی اطلاع کے لئے نعرے لگانا شروع کئے بھوک مہڑتال نے  
آواز کا کرار اپن ختم کر رکھا تھا لیکن دیواریں بولتی تھیں شیر سنگھ نے ایک اور ظلم کیا ایک قیدی کو چھ  
بجلی میں لا کر غلام حسین شاہ سے اتنا پٹوایا کہ دیواریں لرز گئیں میں نے احتجاج کیا مگر بے سود گرمی کا  
شہاب اور روزوں کے دن قیدی چلتا رہا۔ شاہ جی بارونے سے ہوں کوئی خطا نہیں کی مجھے کیوں  
مارتے ہو مگر شاہ جی شیر سنگھ کی خوشنودی میں سمجھتے ہوتے تھے اُس نے داویلا کیا تو اُس کے  
منہ میں پشاب ڈالا اُس نے خدا اور رسول کا واسطہ دیا۔ شاہ جی آل نبی اور اولاد علی ہو روزے

سے ہوں جانے دو رجم کرو مگر ظلم حسین شاہ اس وقت شیرنگور کی اولاد بنا ہوا تھا گو میں بھوک بڑتال سے نہ حمل نکالیں اس واقعہ نے مجھ میں جان پیدا کر دی میں نے فوراً ہی ہنگامہ برپا کر دیا شاہ ہی نے شیرنگور کو اطلاع کی وہ دوڑتا ہوا آیا اور حکم دیا کہ اس کے منہ پر بھی تو بڑا باندھ دو و ظلم میں شاہ نے کھدر کے ایک توڑے میں گو برادر براز لپیٹ کر میرے منہ پر بند صوا دیا ہاتھوں میں کھڑی تھکڑی ٹخنوں سے گھٹنوں تک کوڑے منہ پر تو بڑا جی بھوک بڑتال سے ہلکان، عجیب سماں تھا مینہ بھرا سی جھیلے میں نکل گیا خبر باہر چلی گئی غماشوہر مچا احرار نے احتجاجی قرار وادیں شروع کیں سٹولٹوں نے نقل کیا اس بربریت میں بھی قدرت مددگار ہوتی ہے والد سخت پریشان تھے انہیں کسی طرح یہ اطلاع مل گئی کہ میری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں پہلے یرقان ہوا پھر آشوب چشم۔ میں نے اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ والد کو خط لکھا اس خط میں انہیں حوصلہ دلایا کہ گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں پانچ سال ہیں بہر حال گذر ہی جاتیں گے فرد کی زندگی ملک و قوم کی آزادی کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی آپ کے دو بیٹے اور ہیں میں نہ رہا تو کوئی بات نہیں سمجھ لیجئے کہ آپ نے فرض کی راہیں ایک بیٹے کی قربانی دے دی ہے۔

والد سے یہ خط خان غازی کابلی نے لے لیا غازی ان دنوں مہاشہ کرشن کاٹھی تھا۔ وہ صبح دم ان کے مکان پر حاضر ہوتا مہاشہ جی ٹہلنے اور لیڈر لکھواتے تھے کابلی نے میرا خط انہیں دکھایا مہاشہ بے حد متاثر ہوئے۔ سکندر حیات خدا سے ڈرو کے زیر عنوان ایک پر نور شندہ میں اس خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ جب میں نے اس نوجوان کے یہ الفاظ پڑھے تو میرا دل بلیوں اچھلا مجھے مسرت ہوئی کہ اس ملک میں اتنے جبری نوجوان بھی ہیں میں سکندر حیات سے کہوں گا کہ خدا سے ڈرو تمہارا بیٹا شوکت حیات اٹلی کی قید میں تھا تو تمہارا خواب و نور حرام ہو رہا تھا تم حال سے بے حال تھے شورش کشمیری بھی کسی کا بیٹا ہے اس پر یہ ظلم کس لئے اودکب تک؟

سکندر حیات خدا سے ڈرو

### احرار اور کانگریس

احرار کے معاملہ میں سکندر نے کمال یہ کیا کہ کانگریسی زعماء کی ہمدردیوں سے مجلس کو محروم کر ڈالا۔ کانگریسی زعماء سے کہا احرار راہنما بجائے خود کانگریس کے راستے میں روک ہیں اور جماعت احرار ایک فرقہ وارانہ تنظیم ہے کانگریس ہائی کمان بھی احرار کو اسی نگاہ سے دیکھتا رہا احرار کے ساتھ اسلام کا لفظ اور تحریک کشمیر یا قادیانیوں کا تعاقب ان کے فرقہ وارانہ ذہن کی دلیل قرار دیا گیا انہی دنوں راتے بہادر مہر چند کھنہ نے جو صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت میں فنانس منسٹر تھا ایک بیان بنا کہ احرار ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے اس نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا کہ احرار رضا کاروں کا عسکری نشان کلمہاری ہے اور کلمہاری تشدد کا نشان ہے اب ایسی جماعت کو کانگریس کی اعانت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے جبکہ کانگریس کا موقف ہی عدم تشدد ہے۔ مہاتما جی نے مہر چند کھنہ کے نقطہ نگاہ کی حمایت کی اس کے نام جو خط لکھا اس نے اخبار میں شائع کر دیا گوہر انوار کے ایک مجسٹریٹ نے انہی دنوں ایک احراری کارکن کے فیصلہ میں لکھا کہ مجلس احرار کے قیدیوں سے پولیٹیکل قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جاسکتا وہ ایک مذہبی تحریک ہے اور تشدد پر یقین رکھتی ہے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو پنجا ب اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے اپوزیشن لیڈر تھے لیکن احرار کے مقابلہ میں سکندر حیات کے دوست وہ پارٹی کے ذہن پر یہ نقش کرتے رہے کہ احرار کی تحریک مقابلتاً زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ اسلام کے ذہن سے سیاست میں حصہ لیتی اور کانگریس سے بھی آنکھیں چار کرتی ہے۔ احرار اسلام کو بیچ میں لا کر گفتگو کرتے اور قولاً و فعلاً مذہبی ہیں یہی وجہ تھی کہ جب احرار نے فوجی بھرتی کے مقاطعہ کی تحریک شروع کی تو کانگریس نے اسکی رسوائی اور پٹائی پر چپ سادھ لی سوسائٹیوں نے مہنوائی





## بھوک بڑتال کے پھین دن

تین روزانہ دو نے بھوک بڑتال شروع کی میں ایک مہینہ اور پانچ دن گزار چکا تھا اگلے روز حکیم غوث محمد بھی تبرک ہو گئے احسن عثمانی ندینہ، بجنور کے ادارہ تحریر میں رہ چکے اتھاری دہلی کے ایڈیٹر اور بڑے فاضل انسان تھے اردو فارسی اور عربی کے عالم تھے انگریزی میں خصوصیت حاصل کر لی تھی شاعر بھی تھے اور خوب شعر کہتے تھے یہ پہلا تھا طبیعت میں غصہ تھا لیکن زبان پر تلخ لفظ کبھی نہ لائے دبلے پتلے بے رنگے گوبچاس برگوشت کھچا ہوا تھا ہم سب اُن کا احترام کرتے عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی یہی تیس تیس کے بیٹے میں ہوں گے۔ گھر اُن کا پہلی بھیت کے موضع کھیم پور کھیری میں تھا کہاں یوپی کہاں پنجاب؟ اور پنجاب میں بھی ننگری سنٹرل جیل اُس پر یہ سوہان روح سلوک ذبیح انہیں دلی سے لاہور کھینچ لائے تھے خیال تھا کہ میاں اخبار نکالیں گے جنگ چھڑ گئی احرار نے ڈکٹیٹر بنا کر جیل بھجوا دیا۔

ڈاکٹر نے ناک کے راستہ دو دھدہ بنا جا ہا معلوم ہوا کہ ناک میں کوئی ہڈی ہے جس سے نالی اندر نہیں جاسکتی اب کیا ہو ڈاکٹر سول سرجن سے متورہ کرنے چلا گیا شہر ننگہ نے منبر داروں کو حکم دیا کہ ننگا کر کے نالی مقعد میں دے دو غلام حسین شاہ اور اس کا جھتہ تیار ہو گیا۔ نالی مقعد میں کہاں جاتی زخم ہو گیا لہو نکل آیا احسن نے یہ ظلم کب دیکھا تھا بلکہ جس سانچہ میں وہ ڈھلا تھا اس میں اس کا تصور بھی نہ تھا اس بدسلوکی کے بعد وہ زندہ درگور ہو گیا میری بھوک بڑتال کو ایک ماہ چھبیس دن ہو گئے احسن عثمانی حکیم غوث محمد اور برہماتند کو بھی اکس روز ہو چکے تھے۔ آخر صوبائی گورنمنٹ کی ہدایت پر جیل کے حکام سپرانڈار ہو گئے ہمارے تمام مطالبات تسلیم کر لیتے گئے ہم نے بھوک بڑتال چھوڑ دی لیکن احسن جب تک جیل میں رہا ہر جھجایا رہا ہو گیا تو یہ زخم اُس کے دل پر تھا۔ آخر کچھ

دنوں بعد اسی صدمہ اور زخم سے اُس کا انتقال ہو گیا۔ حکیم غوث محمد عوالمی کا محمد بن گئے ان کا ایک ہاتھ نفل ہو کر ناکارہ ہو گیا پاتوں میں ورم آ گیا اب سال ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے برعکاس کی متعدد سے کچھ دنوں خون آتا رہا مگر مستقلاً انتڑیوں میں شکایت پیدا ہو گئی پھر پاتھوں کے دانوں پر چھاپہ مارا مجھے باسیر ہو گئی مسوں نے سخت تنگ کیا ہر روز پاجامہ خون سے تر ہو جاتا تاہم یہ ہنچا کہ ہم بہت سی مراعات کے حقدار ہو گئے شیرنگہ بد لا گیا کتا ہیں آگئیں قلم دعوات مل گئی کھا چھی کی سہولتیں حاصل ہو گئیں خط آنے جانے لگے ملاقات ہونے لگی رات دن کھلا رہنے لگے کچھ دنوں بعد کئی ساتھی اپنے اپنے اضلاع میں چلے گئے چند ساتھی رہ گئے۔ مولانا گل شیر کیمیل پور منتقل کر دیتے گئے کالی چرن لدھیانہ راجندر سنگھ فیروز پور صوفی عنایت محمد سپروی راولپنڈی میر داد خان لاہور جبار بھٹا کہ چلتی گاڑی سے پھلانگ لگا کر ہتھکڑی سمیت غائب ہو گیا پولیس نے ہزار جتن کئے ہاتھ نہ آیا۔ جگ کے دنوں میں انڈر گراؤنڈ رہا جگ کے بعد بمبئی میں بحری بیڑے نے بغاوت کی تو اُس میں حصہ لیتا ہوا مارا گیا عقیدتاً کمیونسٹ تھا اشبح، ساونت، انقلابی اکاؤنٹنڈے ماترم اور رلیا سنگھ رہا ہو گئے منگھری میں ہم پانچ ساتھی رہ گئے۔ احسن عثمانی، حکیم غوث محمد، بہمانند و دیاساگر اور شورش کا شمیری۔

باہر کی دنیا سے ہم اتنا ہی واقف تھے جتنا سول اینڈ ملٹری گنرٹ باورڈ نامہ انقلاب سے معلوم ہوتا دونوں اتحادیوں کے پشت پناہ تھے انہی کے نقطہ نگاہ کی خبریں ملتی تھیں اخباروں پر بدلتی سنسرتھ صحیح حالات ملنا مشکل تھے۔

منشی احمد دین

اچانک پنجاب سوشلسٹ پارٹی کے مشور لیڈر اور صوبہ کیٹی کے جنرل سیکرٹری منشی احمد دین



ہنگامہ آلودہ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

ہینے ڈیڑھ بیٹا ہو گا کہ منشی احمد دین کو بی کلاس بل گئی یہ بی کلاس انہیں راجہ صاحب کی وجہ سے ملی تھی ڈاکٹر کو بی چند بھار کو بعض نظر بندوں سے ملنے کے لئے ننگھری آئے تو راجہ صاحب نے ہمارا ذکر کیا ڈاکٹر صاحب طرح دے گئے۔ البتہ منشی جی کو دفتر میں بلوا لیا راجہ صاحب نے منشی جی سے کہا کہ وہ ڈاکٹر صاحب پر زور دیں کہ شورش و احسن کی بی کلاس ہونی چاہیے ڈاکٹر صاحب نے ان سے وعدہ بھی کیا لیکن لاہور جا کر صرف منشی جی کی سفارش کی ہمیں احوال ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا راجہ صاحب نے منشی جی کو ہموار کیا کہ وہ احتجاجاً بی کلاس قبول نہ کریں منشی جی نے ہمارے لئے کلاس مسترد کر دی راجہ صاحب نے ایک تفصیلی نوٹ لکھ کر بھیجا انہیں یقین تھا کہ میری اور احسن کی بی کلاس ہو جائے گی مگر منشی جی نے ایسا ایسی اپنا فیصلہ بدل ڈالا اور بی کلاس قبول کر کے گجرات جیل چلے گئے راجہ صاحب نے ہمیں چکیوں سے نکالا اور آٹھ بارک میں بھجوا دیا یہ ایک کھلی بارک تھی۔ اس طرح ہم پانچوں اکٹھے ہو گئے اس کا ایک فائدہ یہ پہنچا کہ شیر سنگھ کے چارج سے بھی نکل گئے اب ہمارا انچارج ایک اور سکھ افسیر سردار سیوا سنگھ ہو گیا جو بالطبع ایک شریف انسان تھا ماتحت افسر کی آنکھ بھانپ جاتے ہیں ایک تو وہ خود نرم خو تھا دوسرے راجہ صاحب کو مہربان پایا تو اور بھی مہربان ہو گیا جیل تو جیل ہی ہے مگر محسوس یہ ہوا کہ جیسے دماغ سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو راجہ صاحب نے افسر سے زیادہ انسان کا ثبوت دیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہماری زندگی بچالی۔ عید آئی تو گھر سے کھانا بھجوا یا وہ بڑے ہی کم گو انسان تھے بطور سپرنٹنڈنٹ اُن کا بڑا دبدبہ تھا لیکن ہمارے لئے انتہائی شفیق تھے۔

مارکسزم پر کچھ کتابیں ڈپٹی جلیرنے روک لیں۔ راجہ صاحب نے سبب پوچھا اُس نے کہا جناب! یہ لٹریچر کمیونزم سے متعلق ہے کارل مارکس کی تحریریں ہیں راجہ صاحب نے ایک دفعہ

کتابوں کو جتہ جتہ دیکھا کہنے لگے اس میں ہے کیا؛ معاشیات کے مصنفوں میں خیالات ان لوگوں کے جو ہیں سو ہیں ہم انہیں بیٹ نہیں سکتے کتابیں روک لیں تو کیا فرق پڑے گا؛ وماغ ان لوگوں کا مشغول نہ ہو تو جیل میں شرارتیں کرتے ہیں یہی ان کی مشقت ہے کہ پڑھا کریں کتابیں دے دیکھتے ان سے کونسی دیواریں ڈھے جاتیں گی ڈپٹی جیلر منہ نکھارہ گیا۔

### نیک انسان

میں دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی بعض کتابیں پڑھنا چاہتا تھا کوئی پچاس ساٹھ روپے کے لگ بھگ قیمت تھی والد کو لکھا کہ فلاں فلاں کتابیں بھجوادیں ادھر وہ بھی ان دنوں — عسرت کے دن گزار رہے تھے جو کما تے خرچ ہو جاتا۔

والد نے لکھا میرے پاس کونسی ہنڈی ہے کہاں سے بھیجوں؟ یہ تھوڑا ہے کہ تمہیں قرآن کر دیا ہے ڈھائی سال میں ان کا یہ پہلا خط تھا ادھر انہیں دو ہرے تہرے مدے تھے ایک تو تنگی تشریح کے دن دوسرا میرا چھوٹا بھائی یورشش بیمار تھا تیسرا پولیس والوں نے خاصا پریشان کر رکھا تھا جرم یہ تھا کہ وہ مجھے قابو میں نہیں رکھ سکے طبعاً وہ اس قسم کی کلکیٹریں اٹھانے کے عادی نہ تھے۔

راجہ صاحب نے خط پڑھا تو روک لیا ان کا خیال تھا کہ مجھے مدد ہو گا یا میں اپنی بیٹی محسوس کروں گا ہفتہ وار ملاحظہ پر آتے تو باتوں باتوں میں ان کتابوں کا نام پوچھا دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین کو خط لکھا کہ کتابیں وی پی کر دیں کتابیں آگتیں سیوا سنگھ سے کہا شورش کو ہنچا دو لیکن اُسے بتانا نہیں کہ میں نے منگوائی ہیں یہ کہنا کہ ناشرین کی طرف سے پارسل آیا ہے ایک روز سیوا سنگھ کے مُنہ سے اصل حقیقت نکل گئی۔

اگلے سال راجہ صاحب اسٹنٹ انکیپر جنرل ہو گئے ہمیں اضطراب ہوا کہ ایک اچھے

میں نے راجہ صاحب کے مخفی احسان کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو مسکرا کے ٹال گئے پوچھتا ہوں کس نے کہا ہے؟ آخر فرمایا

گھر والوں کو زندگی بھر کیا ہوا ہے قید کا غم؟ میں نے تمہارا شوق پورا کر دیا ہے راجہ صاحب چلے گئے لیکن جاتی دفعہ ہمیں آٹھویں بارک سے نکال کر ڈیوڑھی کے ساتھ ایک بلاک میں ڈال گئے۔ یہ بلاک شاہی قیدیوں کے لئے تھا یہاں ہم مقابلتہ آزاد تھے۔ مولانا ظفر علی خان جب پہلی دفعہ پانچ سال قید ہوئے تو پہلے آٹھویں بارک میں رہے۔ پھر ان کے لئے یہ بلاک بنایا گیا انہوں نے اپنی پانچ سال قید کے دن یہیں کاٹے تھے یہ ایک طرح کا جذباتی رشتہ تھا جس سے طبیعت مسرت محسوس کرتی۔ مولانا سے سیای رابیں اب مختلف ہو چکی تھیں تاہم طبیعت پر ان کی چھاپ موجود تھی اور ذہنی تلمذ بھی تھا قید کی مدت وہی تھی بلاک بھی وہی تھا محسوس ہوتا جیسے مولانا اب بھی ہمارے ساتھ ہیں اس تصور میں بڑی لذت تھی جیل کی لاتبریری میں ان کے وقت کی ایک آدھ کتاب بھی تھی بعض صفحوں کے حاشیہ پر ان کے قلم سے مدد لکھے ہوئے تھے ایک آدھ جگہ سالم شعر بھی تھا ایک کتاب کے نمت بالخیر یہ لکھا تھا

بچپن ہی سے لکھی تھی مقدر میں اسیری  
ماں باپ کہا کرتے تھے دل بند جگر بند

### کرشن لال چوہڑہ

راجہ صاحب کی جگہ فیروز پور ڈسٹرکٹ جیل سے رائے صاحب کرشن لال چوہڑہ آگئے وہ فیروز پور جیل میں پولیٹیکل قیدیوں سے الجھ چکے اور سرکار سے زیادہ سرکار کے وفادار تھے یہاں

ہمارے بارے میں انہیں علم ہو گیا کہ بڑی بلا ہیں کوئی ہفتہ بھر ادھر کا رخ ہی نہ کیا پریڈ پر آئے  
تو جو رو کر سی کاروائی غرور ساتھ تھا۔

”تمہارا نام جو ان؟“

جیل میں داخل ہوا ہے کہ قیدیوں کو اس طرح مخاطب کیا جائے کہ وہ مشتعل  
نہ ہوں جو ان کا لفظ اخلاقی قیدیوں کو پکارنے کے لئے بولا جاتا ہے لیکن حاکمانہ غرور سے  
اس رعب لفظ کو بھی خوار کر دیا ہے۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوبارہ پوچھا۔

”تمہارا نام جو ان؟“

میں چپ رہا۔

تیسری دفعہ پوچھا تو میں نے کہا

”مکٹ پر نام لکھا ہوا ہے“

سپرٹنڈنٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

برہماتند نے کہا — ”چوہڑہ صاحب! (یہ ان کے حاکمانہ غرور پر ایک اور تازیانہ تھا)

یہ بلانے کا طریقہ نہیں ہم لوگ اس لب و لہجہ کے عادی نہیں ہیں۔“

چوہڑہ جواب دے بغیر چلا گیا۔

سیواسنگھ نے چوہڑہ سے کہا ان سے الجھنا مناسب نہ ہو گا جس طرح یہ چل رہے ہیں  
ٹھیک ہے خواجواہ ایک نیا شوشر چھوڑنے سے پریشانی ہوگی بات چوہڑہ کی سمجھ میں آگئی نہ ہم اس



کے تھے بارہ تھے نہ وہ ہمارے لئے بار رہا۔

### ساتھیوں کی رہائی

سب سے پہلے احسن عثمانی رہا ہو گئے ان کے جانے سے شوسس ہوا کہ ہم ایک خاص قسم کی علمی فضا سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے ادیب اور شاعر بننے کے علاوہ سیاسی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے ہم انہیں پنجابی میں چھڑا کرتے یا آپس میں پنجابی بولتے تو وہ سخت احتجاج کرتے اپنی قید کے دن انہوں نے بڑی پامردی سے کالٹے تھے یہی قید ان کے لئے موت کا باعث ہوتی انہیں ہماری تکلیفوں کا احساس تھا باہر جا کر انہوں نے ہمارے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اجنبی تھے بس نہ چلا بھوک بٹرنال نے ان کا سارا ڈھانچہ ہلا دیا تھا۔ متعدد سے خون آتا رہا۔ اپنے گاؤں چلے گئے۔ وہاں جیسا کہ پہلے بیان کیا ہے اس صدمہ کی تاب نہ لا کر واصل بھی ہو گئے۔

و دیا ساگر بھی کچھ دنوں بعد رہا ہو گیا۔ ان دو کی رہائی کے تین ماہ بعد برہمانند کی میعاد قید بھی ختم ہو گئی۔ اب میں اور حکیم صاحب باقی رہ گئے برہمانند کی مفارقت سے جی ادا اس ہو گیا ہم دونوں ایک دوسرے کے جذباتی دوست تھے۔ وہ مجھ پر جان چھڑکتا میں اُسے پیار کرتا جس صبح اُسے رہا ہونا تھا وہ رات بھر جاگتا رہا رہائی کی خوشی فطری ہوتی ہے لیکن مجھ سے بچھڑنے کا اُسے سخت ملال تھا وہ خیال کر رہا تھا کہ جیسے کوئی عظیم صحبت برباد ہو رہی ہے جدا ہوتے وقت اسکی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے ہم دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر اس طرح روئے جیسے سادون کی جھڑی لگی ہو۔

یہ ذکر آچکا ہے کہ وہ ایک آریہ سماجی نوجوان تھا۔ گوروکل میں پڑھا اور وہیں نشوونما پائی تھی۔ اسلام یا اردو کے متعلق جو کچھ سیکھا ہم سے سیکھا تھا۔ حضور کی سیرت پر مولانا سید سلیمان ندوی

کے خطبات پڑھ چکا اور ان سے متاثر تھا ارمنان حجاز کا ایک قطعہ عموماً لگناتا ہے  
 مسلمان آں فیتہ کج کلا ہے      رمید از سینہ اوسوز آہے  
 دلش نالد چہرا نالد نہ دائم      نگاہے یار رسول اللہ نگاہے  
 ”نگاہے یار رسول اللہ نگاہے“ اکثر اس کے ورد زبان رہا یہ مصرع اُس کی زبان  
 پر چڑھ گیا تھا۔

اب جو رہا ہونے لگا تو کئی گھنٹہ ہم یکجا رہے یکجا تو پہلے سے تھے مطلب ہے کہ ہاتھ  
 سے نکلنے ہوئے ان دنوں کو یاد کرتے رہے۔ جیل کی روایت ہے کہ قیدی رہا ہوتے ہی ساتھیوں  
 کو بھول جاتا ہے میں نے یہی اندیشہ ظاہر کیا۔

”یہ کبھی نہیں ہوگا کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔“

”کیا اعتبار ہے؟“

”افسوس تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟“

”تم پر اعتبار ہے جہاں جا رہے ہو اُس پر اعتبار نہیں۔“

”پاگل ہو گئے ہو۔“

”نہیں دوسوسوں کا شکار ہوں۔“

اس نے کہا اچھا کان قریب کر تمہیں اعتماد کی سند دیتا ہوں۔ میں نے کان قریب کئے تو انتہائی شوق سے کہا

”رسول اللہ کی قسم! میں تمہاری یادیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں جو کچھ مجھ سے بن پڑیگا کر دوں گا۔“

”کافر کی قسم“

رسول اللہ کی قسم! کافر نے اس قسم کی لاج رکھی دوستی کا حق ادا کیا پہلے ہی دن اُس نے

صوبت کی چیزوں کا ڈھیر لگا دیا صابن، تیل، تولیہ چینی، گوارا، ٹوٹھ پیٹا، برش، غرض جو چیزیں سی کلاس کے ایک قیدی کو مل سکتی تھیں اُس نے چھ ماہ کے لئے بھجوادیں دوسرے تیسرے روز وہ لاہور گیا مسلمان اخباروں کو میری پتاسنائی انہوں نے ٹال دیا وہ سرکار کے ساتھی تھے اور جنگی فنڈ سے روپیہ لے رہے تھے۔ زمیندار نے ایک بے ضرر سائٹ لکھا البتہ پرتاپ اور ملاپ نے اس منتقلیہ سلوک کے خلاف سکندر حیات پر نکتہ چینی کی مہاشہ کرتن نے حسب معمول زور و زور مذہر لکھا برہمانند نے لالہ منوہر لال وزیر چیلنج سے ملاقات کرنی چاہی نہ ہو سکی پر بجات کے ایڈیٹر مہاشہ نانک چند ناز کو تمام کہانی سنائی وہ تیل ہو گئے چنانچہ برہمانند کو ساتھ لے کر وہ دوسرے یا تیسرے روز لالہ منوہر لال سے ملے اُن سے ماہرا بیان کیا لالہ منوہر لال نے مہاشہ ناز سے کہا کہ شورشش کا کیس (CASE) میرے علم میں ہے اخبارات میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی مجھے معلوم ہے لیکن میں اس کے معاملہ میں بے بس ہوں آپ سکندر حیات سے مل لیں اس کا معاملہ وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہے۔

لالہ منوہر لال نے ہندوؤں سکھوں اور کانگرس کے سیاسی قیدیوں کو ہر طرح کی مراعات دے رکھی تھیں۔ ایک نوا پنچہ فروش کو بھی اس کی وجہ سے بی کلاس مل گئی تھی کانگریسیوں نے انفرادی ستیہ گر کے دنوں میں جیلوں کو بورڈنگ ہاؤس بنا لیا تھا۔ جب چاہا اندر چلے گئے جب چاہا باہر آ گئے۔ فرضی اور حقیقی بیماریوں کی آڑ میں پیروں کا ایک ایسا رواج پڑا کہ جس کا جی چاہا کسی رشتہ دار کی موت کا افسانہ وضع کر کے یا اپنی بیماری کا نقشہ بنا کر رہا ہو گیا پنجاب میں ایک آدمہ مسلمان ہی براہ راست کانگرس میں تھا اُس کو بھی بی کلاس دلوادی گئی گو پی چند بھارگو سکندر حیات کے چہیتے تھے صرف احرار کو ان رعایتوں سے محروم رکھا گیا اور اس معاملہ میں دو نو متفق تھے مہاشہ ناز نے لالہ منوہر لال سے کہا:

”ننگری جیل بدترین قسم کے اخلاقی قیدیوں کے لئے ہے۔ عادی مجرموں کی اس جیل میں کسی سیاسی قیدی کو اس طرح رکھنا زیادتی ہے۔ شورشش تین برس سے وہاں ہے اور سی کلاس میں

ہے آخر اس ہونٹا کو تنہائی کو ختم کرنے کے لئے ہی اُسے کسی دوسری جیل میں بھجوا دیا جائے لالہ منوہر لال نے انہیں یقین دلا با کہ وہ اس معاملہ میں مجبور ہیں سکندر حسات اشارہ کریں ہر شے ٹھیک ہو جائے گی اُس میں فی نفسہ شورش سے کوئی عناد باضد نہیں ہے۔“

مہاشہ نازیہ جواب لے کر واپس آگئے۔ بڑے زور کا۔ اوارہ لکھا۔ برہماند نے کانگریسی رہنماؤں کو جھنجھوڑا۔ اصرار کو آمادہ کیا کہ اپنی کانفرنس میں اس کانٹریکٹس اور حکومت کو مجبور کریں کہ اپنی منشا و ذہن لوہے کے غرض اس ایک مخلص نوجوان کی شانہ روز محنت کا نتیجہ نہ نکلا کہ اب وہ ہوا نے پٹا کھایا

### لاہور کی یاد

کوئی تیس ماہ بعد ایک اکی جیل خانوں کے انٹیکٹر جنرل آنکے معلوم ہوا ہمارے ہی لئے آئے ہیں مہرے ہاں آکھڑے سوئے میں سب معمول جب مضا بوچھا آب کا نام؟ میں نے نام بتایا

”آپ کچھ کہنا جانتے ہیں؟“

”جی نہیں“

”کچھ کہنا ہو تو کہہ لو“

میں نے توری سے اندازہ کیا۔ غالباً اس لئے آئے ہیں کہ ہمیں کہیں اور بھجوا دیں۔ میں نے کہا یہاں سے بھجوا دیجئے۔“

”کہاں جاتیں گے آپ؟“

میرا خیال تھا کہ لاہور تو میرے لئے ممتوں سوچکا ہے کسی اور جگہ کا نام لوں۔ میں نے سیکورٹ اور گوجب لڑوالہ کا ذکر کیا۔ کہنے لگے ”ایک دفعہ پھر سوچ لو۔“

میں نے کہا تو پھر لاہور بھجوا دیجئے۔“

کہا بہت اچھا“ سر ہلایا اور مسکرا کے چلے گئے

— برہماتند کے بعد چوڑھ نے ہمیں پہلی چکی میں بھجوا دیا ہم نے غدر کیا چوڑھ نہ مانا سمجنت  
خضہ آیا احتجاج کیا نتیجہ چکبوں کا ضابطہ ہم پر نہ بننا گیا اور مراعات جو تھیں وہ اسی طرح رہیں پہلی چکی  
کا وجود ہی دبشت ناک تھا سپرنٹنڈنٹ نے ہمارے خود دارانہ رویے کو اپنی منہسی و جاہت کے  
سنائی سمجھا شیر سنگھ کو پھر سے مستط کرنا چاہا ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ بہ ہوا تو ہم جان کی بازی لگا  
دیں گے سپرنٹنڈنٹ کو جھکنا پڑا شیر سنگھ کے دل میں ان ذلتوں کی وجہ سے گرہ بندھی ہوئی تھی چوڑھ  
بھی بیٹی محسوس کرتا تھا میں ایک دن حوض پر بیٹھا ہمارا ہاتھ کا اچانک ایک قدمی نمبر وار نے جو  
سپرنٹنڈنٹ کا اردلی رہا اور ڈیرہ غازی خان کا بلوچ تھا میرے سر پہ ایک موٹا سا ڈنڈا دے مارا میں  
اس وقت صابن میں ”تھڑا“ ہوا تھا۔ میری چیخ نکل گئی اُس نے دوسرا وار کیا۔ میں نے فوراً سنبھالا لایا  
اور اُس کے تیسرے وار کو اپنے بازو پر روک لیا حکیم صاحب دوڑ کر لپکے

میرے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ اُن واحد میں شور مچ گیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم  
ہوا کہ پس منظر میں سپرنٹنڈنٹ کا ہاتھ تھا شیر سنگھ اور غلام حسین اس شطرنج کے تھرے تھے انہی نے  
نمبر وار کو استعمال کیا میں بھول گیا اِن دنوں میانوالی کے ایک اور احرار کارکن خان زماں بھی ہمارے ساتھ آ  
ئے تھے انہوں نے نمبر وار کو اس بُری طرح پٹیا کہ دو لہان ہو گیا سپرنٹنڈنٹ کو بھی نماڑا۔ سپرنٹنڈنٹ  
خوش خوش نظر آ رہا تھا اُس نے نمبر وار کو ضابطہ کی کوئی سزا دیئے بغیر مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ جیل میں بھجوا دیا  
ہمیں تسلی دینے کے لئے کہنا رہا کہ میں نے اُس کی دو ماہ معافی کاٹ لی اس کی نمبر داری منسوخ کر  
ڈالی اور اس کو قید تنہائی میں رکھ دیا ہے یہ سفید جھوٹ تھا سازش کا ایک ثبوت یہ تھا کہ جب تک  
نمبر وار حملہ آور رہا کسی جمدار نے آنا ضروری نہ سمجھا جو نہی خان زماں نے نمبر وار کو پٹینا شروع کیا

جھلسوں اور نمبرداروں کا ایک غول اُگیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ نمبردار ناک کاٹنے کی فکر میں تھا لیکن اُس کا واٹرن نہ لگا۔ یہ ہمیں ایک قیدی حجام نے بتایا جو ہر بند رہوں دن ہمارے بال کاٹنے اور ہر تیسرے روز ہماری شیونے آتا تھا۔ حجام مذکور چوری میں قید تھا لاہور میں میری تقریریں سننا رہا اور احترام کرتا تھا۔ پہلے اس کو تیار کیا گیا کہ وہ یہ کارنامہ سرانجام دے پھر اُس کی ہچکچاہٹ پر اس نمبردار کو چنا گیا نمبردار نے اس سے دو دفعہ استرا لیا لیکن موقع نہ ملا پھر سازش کنندگان نے عواقب و نتائج کے خوف با کسی اور وجہ سے ارادہ بدل لیا غالباً اس صورت میں خود اُن پر ذمہ داری کا بوجھ پڑتا تھا کہ استرا آیا کہاں سے؟ چکی میں پہنچا کیونکر؟ نمبردار کی تلاشی کیوں نہ لی گئی؟ وغیرہ ان چکیوں کا معاملہ اور بھی خطرناک تھا یہ جیل کے اندر جیل تھا اور یہاں ہوا کا جھونکا بھی مشکل سے آتا تھا۔

### مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی

ایک دن حجام نے ذکر کیا یا کانوں میں کہیں سے بھٹک پڑی کہ افغانستان سے کوئی وزیر قید ہو کر آیا ہے۔ لانا قد رنگ گندمی، داڑھی کھڑی، دراز قبضہ صبح و شام ساتویں اور آٹھویں بارک میں چل قدمی کرنا ہے۔ جیل کے حکام اس کا ادب کرتے اور خوف بھی کھاتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ افغانستان کا وزیر نہیں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ہیں۔ اُن کے علاوہ بہت سے کیونٹ اور سوشلسٹ نوجوان بھی نظر بند ہیں۔ مجھ پر نمبردار کے حملہ کی خبر اُن تک پہنچی تو انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے دریافت کیا سپرنٹنڈنٹ مگر گیا مولانا حبیب الرحمن اور پریم چند بھسین نہ مانے۔ نظر بندوں نے متفقہ طور پر سپرنٹنڈنٹ کی بات کو ٹھکرا دیا اور امرار کیا کہ جب تک خود نہ دیکھ لیں اس وقت تک وہ اسکی بات کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دیں گے سپرنٹنڈنٹ پہلے ٹالنا رہا پھر مان گیا مجھے اپنے دفتر میں بلا بھیجا وہاں مولانا حبیب الرحمن تھے اور ان کے ساتھ ایک نوجوان جو

ناخوش رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا میں نے خیال کیا کہ سپرنٹنڈنٹ کا ماہی جلا ہے لیکن وہ سو شلٹ پارٹی کے میگیٹری مشنری چنڈھین ایم اے تھے۔ میں اُن کے چہرے کی شرافت آنکھوں کی ہمیدگی اور لہجہ کی شہین سے بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے پوچھا آپ پر جو حملہ ہوا ہے اس میں کسی افسر کا ہاتھ ہے؟ میں نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ اور شیر سنگھ دونوں کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ اس خیال کی بعد میں تصدیق ہو گئی لیکن مولانا حبیب الرحمن چونکہ معاملہ کو طول دینے کے حق میں نہ تھے اسلذا مقدمہ ختم کر دیا گیا۔

پریم چند بھین نے سپرنٹنڈنٹ کو بید ڈانٹا انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ میرا سر بالکل بھٹ گیا ہے اور میں مفروب ہو کر ہسپتال میں ہوں! اس اعتبار سے سپرنٹنڈنٹ کو کان ہو گئے اور ہم پہلے سے زیادہ اپنے آپ کو طاقتور سمجھنے لگے۔

تمام نظر بند میری سی کلاس سے پریشان تھے۔ مولانا حبیب الرحمن نے گوپی چند بھارگوپر زور دیا کہ اس منقمانہ ذہنیت کو ختم کرائے لیکن نہ سکندر حیات مانتے تھے نہ گوپی چند بھارگوہی کو مجھ سے کوئی لگاؤ تھا سپرنٹنڈنٹ (کرشن لال چوہڑو) میری صاف گوئی پر ناخوش تھا مولانا اور پریم کی ملاقات کے بعد اس کا رویہ مختلف ہو گیا اُس نے ہمارے احاطہ میں آنا چھوڑ دیا مولانا حبیب الرحمن بڑے باتدبیر انسان تھے افسروں کو مٹھی میں لے لینا اُن کے باتیں ہاتھ کا کرتب تھا میری صحت دیکھ کر انہیں سخت دھکا لگا سپرنٹنڈنٹ کو مجبور کرتے رہے کہ مجھے دو وقت کھانا بھجوانا چاہتے ہیں سپرنٹنڈنٹ غدر کرتا رہا کہ ایک سی کلاس قیدی کو اسے کلاس کا کھانا کیونکر مل سکتا ہے؟ آخر بڑے غدر و انکار کے بعد سپرنٹنڈنٹ مان گیا اچانک بھنا ہوا گوشت اور پراٹھے ملے تو میں حیران ہوا مجھے علم نہ تھا بہر حال میں نے مولانا کا دل سے شکریہ ادا کیا سالن اور پراٹھے ٹوٹا دیئے اور کھلا بھیجا کہ سی کلاس میں رہ کر میں ان مراعات کا حقدار نہیں یہ چوری ہوگی اور اگر رعایت دی

جا رہی ہے تو خلاف ضابطہ ہے اور رضا کارانہ قید کے منافی! میں نے تین سوا تین برس سی کلاس کی بُری بھلی خوراک کھا کر اپنا ایک ذائقہ بنا لیا ہے۔ اب میں اس خوراک سے اُس ذائقہ کو توڑنا نہیں چاہتا توڑا تو لازماً میرے لئے ایک نئی آفت کا دروازہ کھل جائے گا آج مولانا اُن کے رفقا موجود ہیں کل وہ تبدیل ہو جائیں یا سپرنٹنڈنٹ رعایت واپس لے لے تو میرے لئے پریشان کن ہو گا بہتر یہی ہے کہ جو کلاس اور اس کی خوراک میرے لئے تجویز کی گئی ہے اسی پر اکتفا کروں سپرنٹنڈنٹ میرے اس انکار سے متعجب ہو اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے ماتحتوں سے کہتا رہا کہ اس کیریکٹر کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں ہم نے کتنی دقت سے اجازت دی اور اُس نے کس سرعت سے انکار کر دیا۔

### ترنگا لہرایا

ابھی میں تبادلہ کے مرحلے میں تھا یعنی لاہور سے تھریری احکام نہیں پہنچے تھے کہ شاہ آباد ضلع کرنال کے بعض ستیہ گر ہی چالان ہو کر آگئے انہوں نے ارادہ کیا کہ دو ایک روز میں چھبیس جنوری آرہی ہے یوم آزادی منانا چاہیے یہ کانگریس کی طرف سے آزادی کا دن تھا میں نے اختلاف کیا ان کے پاس چھوٹا سا ترنگا جھنڈا تھا جو اپنے کپڑوں میں چھپا کے لائے تھے اُن کا خیال تھا کہ اس روز جھنڈا لہرائیں گیت گائیں اور ممکن ہو تو باہر سے کچھ چیزیں منگوا کر پارٹی کریں میں اپنے نقطہ نگاہ پر قائم رہا اُن سے بہتیرا کہا کہ چوری کا پرچم لہرانا عوامتہا جی کی ہدایات کے خلاف ہے افسروں کے علم میں آگیا تو خواہ مخواہ ایک سادہ کھڑا ہو جائے گا لیکن ۲۶ جنوری کو ۴ بجے صبح انہوں نے پرچم لہرایا انقلاب زندہ باد کا نعرہ گونجا تو جمعہ رات بھاگا بھاگا آیا میں اُس وقت دھوپ میں بیٹھا قرآن مجید پڑھ رہا تھا اس نے آتے ہی ایک نوجوان سے پرچم چھینا اور پاؤں تلے



دوند ڈالائیں چونکہ تعلق نہ تھا اس لیے علیحدہ رہا تھا اب یہ دیکھا تو مجھے بھی تائی گیا حکیم صاحب جمدار سے الجھ گئے میں نے آگے بڑھ کر جمدار کو دھکا دیا اور اس کے پاؤں تلے سے جھبٹا نکالا فوراً ہی وارڈ فرم آگیا سپرنٹنڈنٹ پہنچا جھبٹا طلب کیا میں نے کہا جمدار نے پرچم کی ہتک کی ہے اب پرچم آپ لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا سپرنٹنڈنٹ نے بہتیرا اصرار کیا ہم نہ مانے بلکہ میں نے پرچم کو سینہ سے باندھ لیا سپرنٹنڈنٹ ناکام ہو کر واپس چلا گیا شام کے وقت اُس نے گاندھی جگتوں کو بلوایا انہوں نے مکھ دیا کہ پرچم حوالے کرنے میں انہیں کوئی اعتراض نہیں مجھے بلوایا اور تحسیر دکھائی میں حیران رہ گیا سپرنٹنڈنٹ نے کہا حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے حق میں نہ تھے لیکن ایسے ساتھیوں کو ساتھ لے کر لڑنا دانا ہی نہیں۔

القصر پرچم ان کے کپڑوں میں جمع ہو گیا یا بخیر شہا سلامت یہ تمہیلا تجربہ تھا پہلا تجربہ اسکول کی زندگی میں لالہ لاجپت رائے کے دیہانت پر ہوا اس کا ذکر آچکا ہے دوسرا قید کے آغاز میں ہوا ساتھیوں کو اسرار تھا کہ ہر روز اکٹھے ہو کر انقلاب زندہ باد کا نعروں لگایا کریں۔ ہم لوگ جو پہلے ہی کافی تجربے کر چکے تھے اس کے موافق نہ تھے ہم نے کہا جیل جلسہ گاہ نہیں نووارد ساتھی نہ مانے ہر روز شام کو نعرے لگانے لگے جیل والوں نے بہتیرا سمجھایا کہ یہ چیز ٹھیک نہیں کوئی نہ رکا ڈپٹی کمشنر نے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا کہ ان نعروں کو روکو جب ان کی منت سماجت کام نہ آئی اور ساتھی اپنے سیاسی زعم میں بے قابو ہوتے گئے تو ایک دن صبح سویرے ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سپرنٹنڈنٹ جیل مسلح گارڈ لے کر آگئے سب کو ایک قطار میں کھڑا کیا سپرنٹنڈنٹ نے لٹکار کر پوچھا تم میں سے کون نعرہ لگاتا ہے ہر کوئی چپ رہا دوبارہ پوچھا خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا دو چار دفعہ دھمکا کر سوال کیا مگر سب یوں تھے جیسے منہ میں زبان نہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے طعنے دینا شروع کئے بس یہی حوصلہ ہے اب بولو، کیوں نہیں بولتے؟ میں قطار کے آخر میں کھڑا تھا سپرنٹنڈنٹ کے

اشتعال دلانے سے غصہ میں آگیا قطار سے نکلا اور سپرنٹنڈنٹ کے سامنے اکھڑا ہوا۔

”جناب میں لگاتا ہوں“

”تم“

”جی ہاں“

سپرنٹنڈنٹ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اُس نے درستی سے کہا

”تم؟“

”جی میں نعرے لگاتا ہوں“

”پھر لگاؤ گے؟“

”وقت پر لگاؤں یا ابھی؟“

”شاہنشاہ! ہمارے حوصلے کی داد دیتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم نعروں کے خلاف ہو

اور تم نے کبھی ان کا ساتھ نہیں دیا محض ساتھیوں کا وقار رکھنے کی خاطر ذمہ داری لے رہے ہو۔“

جیل والوں کے علم میں تھا کہ نعرہ بازی کا لیڈر کون ہے چنانچہ پانچ چھ ساتھیوں کو اسی

وقت بیڑیاں پہنا کر مختلف جیلوں میں بھجوا دیا گیا یہ واقعہ ملتان جیل کا ہے۔

### دن کٹ گئے

شگمیری جیل کے دن ختم ہو رہے تھے بس لاہور کی فکر میں تھا مصیبت کے دن ہمیشہ ہی

پہاڑ معلوم ہوتے ہیں اور جب نکل جاتے ہیں تو معلوم

ہوتا ہے جیسے سن سے نکل گئے ہوں۔ آخر عجیب غریب سی یادیں رہ جاتی ہیں۔

عام قیدیوں سے میل ملاپ ناممکن تھا اگر بھولے سے کوئی اخلاقی قیدی ہم سے بات کر لیتا تو اسکی

غیر دقتی ہم نے تین سوائین برس اس طرح کاٹے جیسے اندھے غلام میں پڑے ہوں۔ کیا کیا تجربے نہیں ہوئے؟ کیسے کیسے دکھ نہیں اٹھاتے؛ نفس کے واردات عجیب ہوتے ہیں مانع و دل پر خیالات کے فائدے گذرتے رہے قید کا جو تصویر یا تصویر جیل مینول میں ہے یہ دن گویا اس کا نقطہ عروج تھے عطر :

ہم اس طرح تھے جیسے ہمارا خدا نہ تھا

ہم نے بڑے جی گردے سے مصائب کا مقابلہ کیا کرنل پوری کیمبل پور کا تھا مولانا گل شیر بھی کیمبل پوری تھے ایک دفعہ انہوں نے کرنل پوری سے کہا کہ آپ لوگوں نے ہمیں اس کالے پانی میں کیوں رکھا ہے؟

آپ کو (میری طرف اشارہ کر کے) اس لڑکے کی وجہ سے یہاں رکھا ہے چونکہ وزارت اسے عام سیاسی قیدیوں میں رکھنا نہیں چاہتی لہذا اس کی رفاقت کے لئے کچھ ساتھی یہاں رکھ دیئے ہیں“

مولانا نے کچھ اور کہنا سنا مناسب نہ سمجھا اور نہ وہ قید میں سوال و جواب کے عادی ہی تھے۔

### مولانا محمد گل شیر

جن علماء کے ایشارہ و استقامت کا تذکرہ کتابوں میں پڑھا ہے اور ان پر حیرت ہوتی ہے کہ اس جی گردے کے لوگ بھی ہو گزرے ہیں مولانا گل شیر ان کی ہو ہو تصویر تھے تحریک مجاہدین کے شرکاء۔ کی حق گوئیوں سے قربانی و ایشارہ کی جس عظمت کا احساس ہوتا ہے مولانا گل شیر میں اس عظمت کا یہ دم بکمال و تمام موجود تھا۔ وہ صحیح معنوں میں صحابہ کی جراتوں اور جہادوں کا نمونہ تھے۔ وہ اخلاق، حیا، شرافت، زہد، تقویٰ، عبادت، نیکی، قربانی کی ایک ایسی تصویر تھے کہ چراغِ جنتوں سے لکھیں

تو بھی اس قسم کے انسان ملنا مشکل ہیں۔ قرآن نے جس صبر جمیل کی تلقین کی ہے اور استقامت کا جو نمونہ حضورؐ نے پیش کیا تھا مولانا اس اسوہ حسنہ کا عکس تھے جانتے ہی نہیں تھے کہ شکایت کیا ہوتی ہے؟ صوم و صلوٰۃ کی پابندی فطرتِ نانیہ بھی ایک چوتھائی رات باقی رہتی تو اٹھ بیٹھتے مصیبتی پر چلے جاتے قرآن پاک اس گداز سے پڑھتے کہ حرفِ حرف دل پر نقش ہوتا چلا جاتا محسوس ہوتا کہ دل کی سنگینی صوم کی طرح پھسل رہی ہے بڑا قد صاف کھلا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، پٹے دار، جن میں کنپٹیوں کی طرف کنڈل بنے ہوئے نھے چوڑا چکلا سینہ، بھرواں جسم، کشادہ ماتھا، لہجہ میں مٹھاس، پنجابی بولتے اور اس بانگین سے بولتے کہ دل موہ لیتے تھے ایک دن احرار میں اپنے شمول کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا میں کیمبل پورا اور میانوالی کے عام مولویوں کی طرح ہی کا ایک مولوی تھا وعظ کب روٹی کمانی اور کھائی میں نے مدۃ العمر انگریز دشمن عمادہ کا تعاقب کیا اور انہیں اپنے علاقہ میں پھیلنے پھولنے نہ دیا شاہ جی بامولانا بسبب الرحمن جب کبھی اس علاقے میں احرار کی دعوت لے کر آتے ہیں مسلسل دورے کر کے ان کے اثر کو زائل کر دیتا جس سال حج کا شرف نصیب ہوا میں نے روضۃ النبیؐ پر خواہش کی کہ میں کس جماعت یا گروہ میں کام کروں؟ مولانا نے فرمایا اس دعا کے بعد میری آنکھ لگ گئی دیکھا حضورؐ فرما رہے ہیں احرار میں چلے جاؤ حج سے لوٹا تو احرار میں شمول کا اعلان کر دیا موجودہ قید اس شمول کی پہلی آزمائش ہے تب سے کیمبل پورا اور میانوالی کے خوانین پریشان تھے ایک رات اپنے گھر کی چھت پر سو رہے تھے کسی نے گولی مار کر شہید کر دیا اور اس طرح اس دیوانہ آباد میں استقامت کا ایک چراغ روشن ہوتے ہی بجھ گیا۔

### صوفی عنایت محمد سپروری

قید کے ان رفقا میں صوفی عنایت محمد سپروری بلا کے آدمی تھے جو ہر موسم ہندی کے موجد

ررتی حلال کھاتے اور رزق حلال کھاتے بارہا قید و بند کی صعوبتیں سہیں بڑے ہی بہادر انسان تھے جہاں کہیں حکومت سے ٹکڑے ہوتی پیش پیش ہوتے کوئی پندرہ سولہ برس قید کاٹی پر جماعت ملی شاہ کے مرید تھے لیکن حوصلہ و اعتقاد عام مریدوں سے مختلف پایا تھا تحریک خلافت میں قید رہے کانگریس کی سول نافرمانی میں جیل گئے تحریک کشمیر میں اندر ہو گئے کوئی سا موقع ہو جیل مزورہ چلے جاتے — شہید گنج میں نظر بند ہو گئے قادیانی نبوت کے لعاب میں تعزیر و صوبت کو لبیک کہا جنگ چھڑی تو راولپنڈی کی جامع مسجد میں کھڑے ہو کر فوجی بھرتی کے خلاف تقریر جھاڑ والی کھڑے گئے عدالت نے پوچھا

”یہ تقریر کی ہے؟“

”جی ہاں“

”آپ کو معلوم ہے کہ یہ مضابطہ دفاع ہند کی رو سے جرم ہے“

”میں اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کے سوا کسی مضابطے کو نہیں مانتا۔“

جانے مجسٹریٹ نے کیا کہا تعزیرات ہند کا نسخہ اٹھایا پاؤں کی ٹھوکریں رکھا اور کہہ کہ کلام اللہ کے مقابلہ میں اس کے احکام جوتی کی نوک کے قابل بھی نہیں ہیں۔

مجسٹریٹ نے چار سال قید کا حکم سنایا بڑے لاغر تھے۔ اس قید نے ان کا انجرو پنجر ملا ڈالار ما ہوئے تو عوارض کا شکار تھے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

### دوسرے ساتھی

احسن عثمانی کا قصہ پہلے آچکا ہے ان کی مقعد میں شیرنگہ نے دودھ کی جو نالیار دی تھیں اُس کے زخم اور احسن کی غیرت دونوں جان لیوا ہو گئے۔ قید گزارنے کے بعد گھر پہنچے

بمبار ہوتے اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

برہمانند نے میری حمایت میں بھوک ہڑتال کی تو شیر سنگھ نے اس کے ساتھ بھی بدسلوکی کی ہاتھ بندھوائے چوڑوں برگڑ کا پانی ڈالوا یا کٹیرے پھوڑے اور سلیمپوں سے آہستہ آہستہ پٹوایا یہ زخم اس کی بیماری کا حصہ ہو گئے وہ نشست جما کر بیٹھ نہ سکتا تھا۔

مولانا جلیب الرحمن لدھیانوی چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ جیل میں رہوں انہوں نے بڑے جتن کئے سپرنٹنڈنٹ سے کہا انسپکٹر جنرل کو لکھا سر منوہر لال پر زور دیا لیکن ان کی استدعا مسترد ہوتی رہی۔

مولانا بادشاہ طبیعت کے انسان تھے کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اللہ ہی تمام ضرورتیں پوری کرتا کھاتے بھی اور کھلاتے بھی بہادر اور اشجع تو تھے ہی سچی بات دار کے تختہ پر بھی کہہ جانے خوف پاس سے نہیں گدرا تھا جیل میں ان کا بڑا دبدبہ تھا مطالعہ کلبے حد شوق تھا گفتگو و لوگ کرتے چھوٹے چھوٹے فقرے کھری کھری باتیں شاہ ولی اللہ سے متعلق ابتدائی معلومات انہی سے حاصل کی تھیں الفرقان بریلی کا ولی اللہ نمبر بھجوا یا اور کہلا بھیجا کہ اس کو سبقاً سبقاً پڑھو مکتوبات امام ربانی بھی انہی سے لے کر پڑھے اور امام غزالی کی احیاء العلوم بھی ایک دن مجھے کہلا بھیجا کہ سکندر حیات کو چٹھی لکھو کہ مجھے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ بڑھنا ہے مولانا جلیب الرحمن لدھیانوی حسن اتفاق سے یہاں موجود ہیں اجازت دی جاتے سپرنٹنڈنٹ نے درخواست لیکر انسپکٹر جنرل کو بھیج دی انسپکٹر جنرل نے حکومت سے پوچھا اوپر سے ہدایات نہیں کہ شورش اور مولانا آپس میں ملنے نہ پائیں۔ اس درخواست کو ٹھکرا نا مشکل تھا جواب آیا کسی اخلاقی قیدی کا انتظام کر دو پنجاب کی تمام جیلوں میں ڈھنڈوا یا گیا ایسا کوئی شخص نہ ملا جو قرآن مجید ترجمہ سے پڑھا سکتا ہو سپرنٹنڈنٹ نے حکومت کو لکھا اور ساتھ ہی میری دوسری درخواست بھجوا دی درخواست میں درج تھا کہ مسلمان کو قرآن پاک پڑھنے سے محروم رکھنا سراسر

شکارتِ محبت ہے میں اس دولت و نعمت سے محروم رہا تو قیامت کے دن سکندر جیات اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابہ ہوں گے جواب آیا کہ باہر سے کوئی معلم رکھ دیا جائے ابھی یہ معاملہ جیل ہی رہا تھا کہ سو فنانا سبب المرطین کو اٹھا کر دھرم سالہ سب جیل میں بھیج دیا گیا کوئی ہفتہ عشرہ بعد مجھ سے کہا گیا کہ دھرم سالہ جانا چاہو تو جا سکتے ہو میں لاہور کے لئے تیار تھا سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا کہ اسکا پڑھنے اپنا ارادہ بدل لیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ارادہ نہیں بدلا استفسار کیا ہے وہاں مولانا کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو؟ اس جیسے میں اور دو ہفتے نکل گئے۔

### نظر بندوں کی بھوک ہڑتال

انہیں دنوں صوبہ بھر کے نظر بندوں نے جڑیہاں مجتمع تھے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ

(۱) ہمیں جرم کی نوعیت سے مطلع کیا جاتے؟

(۲) درجانی امتیاز کو ختم کیا جائے۔

(۳) تمام سیاسی نظر بندوں کو یکساں مراعات دی جائیں۔

(۴) ہر نظر بند کو اسے کلاس میں رکھا جائے اور اس کا وظیفہ مقرر ہو۔

(۵) صوبہ بھر کے نظر بند ایک ہی جگہ رکھے جائیں۔

جب سچاس ساٹھ نظر بندوں کی طرف سے حکومت کو یہ خط ملا تو پچھلے چم گئی۔ یہ ہمارا معاملہ نہیں تھا کہ اپنی ہی جان کے سوا کوئی معادینہ تھا ہر چکی کے دوپاٹ ہوتے ہیں جس چکی میں احرار پس رہے تھے اُس کے زمین پاٹ تھے۔ ہندو، احرار کو فرقہ پرست کہتے مسلمان ہندو پرست اور انگریز شکم پرست، اللہ تعالیٰ علیم و بصیر ہیں کہ ان طغیوں مہنوں کی حقیقت کیا ہے؟ اور جن لوگوں

کی زندگیوں میں قرن اول کے صحابہ کی زندگیوں کا عکس تھا وہ کس حد تک اس الزام کے سزاوار ہیں۔  
 انسکیٹریل دوڑا دوڑا آیا منو ہر لال پہنچا چھوڑو رام نے دو پھیرے ڈالے تینوں نے منتیں کہیں  
 لیکن نظر بند تہیہ کر چکے تھے کہ مطالبات منوا ہی کے دم لیں گے بھوک بڑتاں ہو گئی ہندو اخباروں نے سر  
 پر آسمان اٹھالیا ملک بھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

ہاتما گاندھی نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت نوجوانوں سے بد سلوکی کر کے انہیں دہشت پسند  
 بنا رہی ہے اگر ملک کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں کا سا سلہ ہوتا رہا تو وہ  
 بنے قابو ہو جاتیں گے انہوں نے حکومت کو انتباہ کیا کہ ان نوجوانوں کی شکایات کا بروقت تدارک  
 نہ کیا گیا تو وہ ملک کے عام نوجوانوں کو دہشت پسندی کے راستہ پر گامزن ہونے سے روک سکیں  
 گے یہ ایک پہلو وار نشانہ تھا جو خطا نہ گیا حکومت کو پندرہ دن کے اندر اندر سپر انڈاز ہونا پڑا نظر بندوں  
 کے تمام مطالبات تسلیم کرنے لگے لیکن ایک وار بھی ہو گیا ملک بھر کے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو  
 جو نظر بند کی حیثیت سے قید تھے راجپوتانہ — میں دیوبلی کے مقام پر نظر بندوں کے ایک  
 کیمپ میں بھیج دیا گیا جو فوجی انتظام کے ماتحت جنگلی قیدیوں کے طرز کا ایک ویرانہ آباد تھا۔ یہاں  
 نظر بندوں نے کچھ عرصہ بعد اس سوال پر بھوک بڑتاں کر دی کہ انہیں اپنے اپنے صوبے میں منتقل کیا جائے۔

### سبھاش چندر بوس

جنگ کا حال یہ تھا کہ انگریزوں کو مختلف محاذوں پر پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں —  
 سبھاش چندر بوس کلکتہ سے فرار ہو چکے تھے۔ پنجاب کی سی آئی ڈی کو اپنی ذہانت پر بڑا ناز رہا  
 ہے لیکن سبھاش کلکتہ سے نکل کے لاہور پہنچے یہاں ایک رات اُس کمرے میں رہے جو اس وقت  
 ایڈیٹر چٹان کا دفتر ہے۔ اگلی صبح سرحد پنچے سرحد سے قبائلی علاقہ پار کیا افغانستان چلے گئے اور



افغانستان سے برلن — ملک کو کچھ خبر نہ تھی آزاد ہند فوج بن چکی تھی انگریز اندر خانہ بلا ہوا تھا کہ فوج کو بھی انقلاب کی ہوا لگ گئی ہے نظر بندوں کو قدرتی طور پر احساس تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا تو وہ انہیں اس دور افتادہ علاقے میں گولیوں سے اڑادیں گے مرنے تو اپنے اپنے صوبے میں چلے جائیں ممکن ہے حالات کروٹ لیں اور کوئی دوسری شکل پیدا ہو۔ تمام ہندوستان بھوک ہڑتال کی پشت پناہ ہو گیا مرکزی اسمبلی میں شور مچنے لگا جلے جلوس شروع ہو گئے فرض حکومت ہل گئی اور نظر بندوں کو ان کے صوبوں میں منتقل کر دیا گیا۔

### چودہری افضل حق کا انتقال

حافظ کی بات ہے وقت کا تعین مشکل ہے منگمری جیل ہی میں اطلاع ملی کہ چودہری افضل حق کا انتقال ہو گیا ہے۔ چودہری صاحب احرار کا شہدہ دماغ تھے ان کا سیاسی حلقوں میں احترام بھی تھا اور خوف بھی وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ نگاہ بڑی دور رس تھی اس خیال پر بڑی پختگی سے قائم تھے کہ اسلام کو جو ضعف پہنچا ہے اسکی ایک وجہ تو مذہب کی تحقیقی روح سے مسلمانوں کی برگشتگی ہے دوسری وجہ سرمایہ داری کا وجود ہے جس سے نہ صرف اسلام کی نشوونما رک گئی ہے بلکہ جمہیوں کی سازش سے سرمایہ داری ہی اصل دین ہو گئی ہے ان کا عقیدہ تھا کہ جاگیر داری اور سرمایہ داری نے مسلمانوں کو ایک زبوں حال قوم بنا دیا ہے۔ وہ ایک ہی تقسیم کے قائل تھے اور وہ دولت کی منصفانہ تقسیم! سرفضل حسین نے چودہری صاحب کو نشیہ میں اتارنے کی بڑی کوشش کی برادری کا واسطہ دیا مگر چودہری صاحب مختلف دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے وہ ذاتی ایثار اور شخصی عظمت کے لحاظ سے قرن اول کے صحابہ کی نظیر تھے۔ سکندر حیات انہیں اپنے لئے تھوڑے سمجھتے رہے حکومت کی منشا بھی یہی تھی کہ احرار ختم ہوں

انگریزوں نے مسلمانوں کے من گروہوں کو مٹانا چاہا احرار اُن میں سرفہرست تھے کچھ ہی کہہ لیجئے پہنچا  
 میں احرار سے بڑھ کر کوئی گروہ انگریزی استعمار کا دشمن نہیں رہا اور چودہری افضل حق تو بڑی طرح  
 سامراج کے جان لیوا تھے ان کی صاف گوئی کا یہ حال تھا کہ کانگریس اور لیگ دونوں کے منہ پر  
 کھری کھری کہتے انہوں نے اپنے آخری خطبہ میں دونوں جماعتوں کے سرمایہ داروں پر تبصرہ  
 کرتے ہوئے لکھا تھا کہ لیگ کا سرمایہ دار ایک مغلوب طاقت ہے اُس نے جو طاقت اُڑائی ہے  
 وہ مسلمان عوام کی طاقت ہے اور مسلمان عوام کو ہندوؤں کی معاشی ناانصافی اور مجلسی چھوٹ چھات  
 سے بجا طور پر شکایت ہے یہی شکایت دو علیحدہ قوموں کا تصور پیدا کرتی ہے وہ کانگریس کے  
 سرمایہ دار کو مقابلتہ زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو سرمایہ دار چونکہ ایشیا کرنا اور  
 قربانی دیتا ہے اس لئے ملک کی حیات سیاسی کے لئے زیادہ مہلک و مضر ہے اس سرمایہ داری  
 ہی نے ملک کی انقلابی طاقتوں کا راستہ روک رکھا ہے۔

— یونی سنٹ وزارت برطانیہ کی سیاسی داشتہ تھی اُس نے احرار کو کچل ڈالا،

چودہری صاحب جیل ہی میں موت کے دروازہ تک پہنچ گئے دسراٹا آخری وقت آپہنچا تو  
 رہا کر دئے گئے آخر صحت ہی کی تلاش میں جان ہار ہو گئے۔

## مرافقے

انہی دنوں لاہور ہائی کورٹ کے نیشلسٹ وکلائٹ نے کانگریسی قیدیوں کے از خود مرافقے  
 شروع کئے رہائیوں کا ایک سیلاب بہہ نکلنا نام کانگریسی زعماء چھوٹ گئے شیخ حسام الدین بھی انہی  
 رہائیوں میں رہا ہو گئے احرار کے بعض دوسرے لیڈر بھی یکے بعد دیگرے چھوٹے گئے۔  
 بعض نے اپیلیں کیں اور نکل آئے۔ احرار میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور میں دو ہی تھے

ہو قید میں رہ گئے ہیں نے آخری وقت تک مرافعہ کی مزاحمت کی ٹیخ صاحب نے میرے بھائی یروش  
 مرحوم سے ممتاز نامہ لینا چاہا لیکن میں نے روک دیا انہوں نے اپنے طور پر مرافعہ دائر کیا جو عدلیہ  
 یا ناقص پیری کے باعث خارج ہو گیا اس وقت میں اپنی قید کا ساٹھ فی صد حصہ گزار چکا تھا۔  
 چودھری صاحب کی رحلت کے بعد مولوی مظہر علی اظہر احرار کے قائد ہو گئے۔ انہوں نے  
 حکومت الیہ ایجاو کی اور احرار کو ایک ایسے دورا ہا پر لاکھڑا کیا کہ کانگریس نے کٹھن ملا کا طعن کسا  
 اور لیگ نے غدار کی پھبتی۔ لیکن یہ سب بیرونی دنیا کی باتیں تھیں ہمیں سیاسیات کے خارجی  
 آثار چڑھاؤ کا کچھ علم نہ تھا۔

آخر وہ صبح بھی آگئی کہ میں بیڑیاں کھڑکھڑاتا لاہور روانہ ہو گیا منگرمی سنٹرل جیل  
 کے سیاہ پھانکوں نے چڑیل کی طرح گھوڑا اور بند ہو گئے لاہور سنٹرل جیل پہنچ کر میں نے  
 محسوس کیا کہ دوزخ سے اعراف میں آ گیا ہوں۔ ع  
 از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

YDP



لاہور پنچا تورات خاصہ بیت چکی تھی پولیس گارونے چھاؤنی کے اسٹیشن پر آتا رہا اور سیدھا سنٹرل جیل لے گئی۔ جیل والوں کو پہلے سے اطلاع تھی دربان نے ڈیوٹی آفیسر سٹرپر کو بلوایا اس نے وارنٹ وصول کئے پولیس کو رسید دی اور مجھے ٹیرسٹ وارڈ میں بھجوا دیا ٹیرسٹ وارڈ خطرناک سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص تھا یہ لاہور سنٹرل جیل کا سب سے خوبصورت بلاک تھا جگت سنگھ سکھ پو اور راج گورو کے جن ساتھیوں کو عمر قید ہوتی تھی یہ انہی کے لئے تعمیر ہوا اور انہی کو یہاں رکھا گیا دوسری جنگ عظیم میں یہ خصوصیت بدل گئی بعض دوسرے پولیٹیکل قیدی بھی یہاں رہنے لگے عام اخلاقی قیدی اسے ہم احاطہ بھی کتنے تھے کل بیس کوٹھڑیاں تھیں درمیان میں ہاورچی خانہ دروازہ کے سامنے غسل خانہ دوسری طرف بیت الخلاء، آخری نکر پر مشقت کے لئے بیرک تھی وہاں مشقت تو کیا ہوتی آپس میں گپ بازی کے لئے ڈرائنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی وہیں اکٹھے کھانا کھاتے اور ملکی حالات پر تبصرہ کرتے تھے ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا جہاں ایک طرف پھل پھول لگے ہوئے دوسری طرف سبزیاں اگی ہوتی تھیں۔ لان میں

والی بل یا نہیں کھلتے تھے غرض یہ ایک چھوٹا سا بورڈنگ ہاؤس تھا جس میں ایک عرصہ سے  
 دہشت پسند قیدی رہ رہے تھے اکیچے کچھ اور سیاسی قیدی بھی آگئے ان میں دو چار اعلیٰ کلاس  
 کے سیاسی قیدی تھے جنہیں غالباً جگہ کی کمی کے باعث یہاں رکھا گیا تھا میرے آنے سے  
 مسلمان پارچ ہو گئے پہلے چار میں ایک روز نامہ سیاست کے مالک و مدیر سید حبیب تھے جو  
 حکومت افغانستان کی تحریک پر نظر بند کئے گئے صوبہ کے وزیر اعظم سکندر حیات بھی ان کے  
 موافق نہ تھے۔ دوسرے ہانگ کانگ سے ایک مسلمان نوجوان جو دہری عبدالستار تھے تیسرے مشہور  
 سوشلسٹ لیڈر یوسف مہر علی جو تھے لاہور کا ایک نوجوان سیفی کاشمیری پانچواں اب میں تھا باقی  
 تمام بند تھے یا سکھ ،

میں ٹیرسٹ وارڈ میں داخل ہوا تو ایک ٹلٹ رات بیت جانے کے باوجود بعض کمروں  
 میں گپیں ہانگی جا رہی تھیں ٹیرسٹوں کے کمرے مقفل تھے اور وہ تقریباً سبھی ٹرپہ لکھ رہے تھے  
 میں بیڑیاں کھڑکھڑاتا ہوا آخر کے خالی کمرے پر رکا جس کا پچھلا حصہ گودام بنا ہوا تھا اور کوئی کمرہ  
 خالی نہ تھا مشقتی بریک میں ایک چار پائی ٹری تھی معلوم ہوا کہ میرے لئے رکھی گئی ہے ہر کمرے یا  
 کوٹھڑی کے پہلے حصے کی چھت اور دروازے لمبے کی سلانوں کے تھے یمین ویسار کی دیواریں  
 اینٹوں کی تھیں اُس وقت سیفی کاشمیری نے اپنے ساتھ جگہ دے دی اور میں برآمدے میں  
 سو رہا صبح اٹھا ہیئت کذاتی بدلی بیڑیاں اتروائیں قیدیوں کا جھول اتارا شیونوائی نہایا دھویا  
 شکلیں پہچاننے کی کوشش کی بعض چہرے شناسا تھے کچھ دوست نکلے اکثریت سے رہی علیک سلک  
 ہوتی کچھ فوجی قسم کے سکھ تھے جو سنگاپور سے سیاسی قیدی بن کے آئے تھے انہوں نے  
 محسوس کیا جیسے مندر میں کوئی طیچھ آگھا ہے بہر حال یہ ایک عارضی لہر تھی دو ایک دن میں نکل گئی  
 پرانے ٹیرسٹوں میں کشوری لال ہنسراج روپ چند گلاب سنگھ اور کندن لال تھے کانگریسی زعماء

میں چوہہری کرشن گوپال دت مشر گوندھانے (پو۔ پی) لالہ بریح کرشن چاندی والا ڈاکٹر سکھ بولل اور مشر اونکار ناتھ (دوہلی) سرٹلسٹوں میں یوسف مہر علی اور سرٹلسٹ سجن سنگھ مرگن پوری ان کے علاوہ بہار کا ایک کالا بھنگ و اجبی خط و حال کا ٹیرسٹ نوجوان بچہ بالو تھا جو پٹنہ کے سفارت سے بھاگ کر لاہور آیا اور یہاں سی آئی ڈی کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

سی کلاس میں ہم تین قیدی تھے بچہ بالو، سعفی کاشمیری اور میں۔ باقی سبھی اے یا بی کلاس میں تھے لنگر اکٹھا تھا اور ٹیرسٹ نوجوانوں کی بدولت خوراک میں کوئی امتیاز نہیں رہا تھا کھانا سبھی ایک ساتھ کھاتے کپڑے گھر سے منگوانے لباس بھی ایک سا ہو گیا بلا امتیاز سبھی سفید کھدر پہنتے تھے۔

وارڈ تو جیل ہی تھا لیکن ہوٹل نظر آتا۔ پہلے ہی دن منگمری سنٹرل جیل کے سارے غم غلط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ جہنم سے بہشت میں آ گیا ہوں۔ کہاں اس جیل کے شب و روز کہ انسان ہستی باری تعالیٰ پر غور کرنے لگتا اور دہریت کی حدوں تک نکل جاتا ہے کہاں لاہور سنٹرل جیل کہ مقابلتاً دارالافتاء محسوس ہوا پھر ٹیرسٹ وارڈ گویا جنگل میں جنگل! پہلی نظر ہی میں اندازہ ہو گیا کہ دانشوروں کی ایک چوپال ہے۔

اس سے پہلے بھی لاہور سنٹرل جیل میں کئی دفعہ رہ چکا اور اس کے کونے کھد رے سے واقف تھا۔ تب ٹیرسٹ وارڈ محض ایک ہوا تھا۔ وہاں پینپنا مشکل تھا۔ قیدیوں سے باتیں سنی رکھی تھیں کہ جن نوجوانوں کو یہاں رکھا گیا وہ خطرناک قسم کے دہشت پسند ہیں۔ انھیں عمر بھر کے لیے قید کیا گیا ان سے علیک سلیک مجرم اور میل ملاپ ممنوع ہے۔ اب داخل ہو کر دیکھا

تو نقشہ ہی دوسرا تھا۔ دہشت پسند، انقلاب پسند، دین پسند، دھرم پسند ترقی پسند اور رجعت پسند سبھی قسم کے لوگ موجود تھے۔۔۔ قدر مشترک یہ تھی کہ سبھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں مانوڑ تھے۔ آفت کے پر کالا؟ لیکن مجموعہ اُضداد!! سرسری نظر میں اندازہ ہو گیا کہ ذہانت و فطانت استقامت و ایثار، جرأت و مردانگی اور شرافت و سیاست کے نادر نمونے رہ رہے ہیں۔ گو بہت سی کنکریاں بھی ہیں لیکن ہیروں کی کمی نہیں اور سبھی میرے بیش قیمت ہیں۔ ایک سے اب بڑھ کر جن کی آب و تاب سے پورا بلاک جگمگا رہا تھا۔ فی الجہد سیاسی آبرومندوں کا ایک نگر تھا۔

## دوست

سید امیر شاہ جیلر تھے اور میجر حبیب اللہ شاہ سپرنٹنڈنٹ دونوں خاص خوبیوں کے مالک تھے کرنل پوری (الشیکر جنرل جیل خانجات) نے منگمری سے واپسی کے بعد میجر حبیب اللہ شاہ سے ذکر کیا کہ ایک سخت طبیعت کا قیدی آرہا ہے اس پر قابو پاسکو گے سید امیر شاہ جیلر نے میرا نام سنا تو فوراً آمادہ ہو گئے سناہ صاحب کے ساتھ میں کسی جیل میں کبھی نہیں رہا تھا میری ان کی واقفیت ٹرن میں انفاقہ ہوئی تھی میں ہمسفر دوستوں سے بات جیت کر رہا تھا انہیں گفتگو پسند آئی دوست ہو گئے جس واقف کار سے کبھی ملے تعریف کی منشی احمد دین (سوشلسٹ لیڈر) سے کہہ چکے تھے کہ شورش کو منگمری جیل میں سخت تکلیف ہے وہ یہاں آجاتے یا میں وہاں چلا جاؤں تو جو کچھ میرے بس میں ہو اُس کے لئے کروں اب جو میں لاہور آ گیا تو پہلے ہی دن صبح سویرے دفتر بلا بھیجا۔ بڑے تپاک سے ملے معافقہ کیا چودہری کرشن گوپال دت ہما شہ کرشن



ایڈیٹر پر تاپ سے ملاقات کر رہے تھے شاہ صاحب نے میرا نام لیا تو ہاشمہ جی آچل کر میری طرف بڑھے  
شاہ صاحب سے پوچھا اسی نوجوان کا نام شورش کاشمیری ہے؟

جی ہاں میرا ہی نام شورش کاشمیری ہے میں نے خود ہی جواب دیا۔

ہاشمہ جی حیرت و محبت سے تکتے رہے دیر تک باتیں کیں۔ خصوصیت سے منگمری جیل کے  
مالات پوچھے وہاں جو کچھ بتی وہ میرے جسم سے ظاہر تھی ایک مشت اشتخوان جو اس نمسہ کے سہارے  
جی رہا تھا صرف بڈیاں رہ گئی تھیں آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں چہرہ سیاہ پڑ گیا اور بالی نوجوانی ہی  
میں سفید ہونے لگے تھے ہاشمہ جی بزرگانہ انداز میں تھپکی دے کر چلے گئے دوسرے دن انہوں  
نے ایک بھر لوہا دار یہ لکھا عنوان تھا "شورش کاشمیری زندہ باد" اس ادارہ میں انہوں نے میری  
بے حد تعریف کی شاید سی اس سے قبل ان کے قلم سے کسی نوجوان کی تعریف میں اتنے عمدہ کلمات  
نکلے ہوں۔ انہوں نے ایک مرتبہ نوجوان کے انقلابی سوانح سے موازنہ کرتے ہوئے تبرک و تائش  
کے الفاظ میں لکھا کہ شورش کاشمیری جیسے نوجوان ہی ملک و قوم کا سرمایہ ہوتے اور جدوجہد  
میں انقلابی نوجوانوں کی قیادت کر سکتے ہیں انہوں نے یونیورسٹی وزارت کو آڑے ہاتھوں لیا  
کہ وہ شورش کاشمیری کو سی کلاس میں رکھ کر ذاتی انتقام کی پیاس بجھا رہی ہے۔

مجھے یہاں تشدد و انتقام کے سبھی مرحلوں سے گزار کر لایا گیا تھا اور اب مجھ پر کوئی سا  
تجربہ کرنا باقی نہ رہا تھا میجر حبیب اللہ شاہ کا سلوک بہر حال شریفانہ تھا لطف کی بات یہ ہے کہ وہ  
چکے قادیانی تھے ان کی ہمیشہ میرزا بشیر الدین محمود کے عقید میں تھیں قادیان کے ناظر امور عامہ  
سید زین العابدین ولی اللہ ان کے بڑے بھائی تھے انہیں یہ بھی علم تھا کہ میں آل انڈیا  
مجلس احرار کا جنرل سیکریٹری ہوں اور احرار قادیانیوں کے حریف ہیں بلکہ دونوں میں انتہائی  
عداوت ہے میجر حبیب اللہ شاہ نے اشارۃً بھی اس کا احساس نہ ہونے دیا انہوں نے

اطلق و شرافت کی اتہا کر دی پہلے دن اپنے دفتر میں اس خوش دلی اور کشادہ قلبی سے طے کر یا  
مدۃ العمر کے آشنا ہیں انہوں نے مجھے بہاروں میں رکھا اور اچھی سے اچھی دوا و غذا دینا شروع  
کی نتیجہ میری صحت کے بال و پر پیدا ہو گئے اور میں چند ہفتوں ہی میں تندستی کی راہ پر  
آگیا وہ بڑے جسور، انتہائی حلیم بے عد غلیظ اور غایت درجہ دیانت دار آفسیر تھے ان کے  
پہلو میں یقیناً ایک انسان کا دل تھا ان کی بہت سی خوبیوں نے انہیں سیاسی قیدیوں میں مقبول و محرم  
بنا دیا تھا۔

### بیوپار منڈل

میری آمد کے دوسرے یا تیسرے روز بیوپار منڈل کا قضیہ شروع ہو گیا بندو دو کا تدارک  
نے بکری ٹیکس کے خلاف احتجاج و ہنگامہ کیا ان کی پہلی کانفرنس منعقدہ لائل پور کے صدر  
خان عبدالقیوم خان (لیگ کے مرد آہن) منتخب یا نامزد ہوئے اور ایک زبردست صدارتی خطبہ  
پڑھا تھا بیوپاریوں نے ہرنال کی تو گرفتار شدگان میں مولانا اختر علی خان مدیر زمیندار بھی تھے  
ان کے علاوہ ایک اور انقلابی نوجوان کامرٹا احسان الہی بھی ساتھ تھا ان لوگوں کی آمد سے تمام  
سنٹرل جیل میں جہل پہل ہو گئی ایک میلہ سال گارہا۔ بڑے بڑے ہندو اور سکھ تاجر قید ہو کر  
آ رہے تھے جن میں اکثر ماہی بھائی ذہن کے لوگ تھے امرتسر کے باوا پڑوسن سنگھ اور لاہور  
کے لالہ دھنی رام بھلہ بھی اسی غول میں تھے مولانا اختر علی خان تو تکلفاً ہی آگئے تھے یا انہیں  
بہ تر غیب ملا لیا گیا تھا کامرٹا احسان الہی بیوپار منڈل کے آفس سیکرٹری تھے لالہ بہاری لال چاننہ  
تحرک کے لیڈر تھے غرض لاہور اور امرتسر کے سربراہ اور وہ تاجر اندر آگئے ان میں جو بہری  
بچے ہی تھے جن کے گلابی عارضوں کی رونق سے فکر شعر میں آسانی ہوتی ہے یہ گویا دولت

مورٹنسن کا ایک عجائب خانہ تھا اور ایک روز ہی میں ہزار بارہ سو قیدی جمع ہو گئے جیل پہلے ہی پتھر تھی ٹیرسٹ وارڈ کے سامنے کھلے میدان میں چھو لاریاں لگا دی گئیں یہ لوگ وہاں رکے گئے جب چھو لاریوں میں گنجائش نہ رہی تو اس سے متصل حوالات کی وسیع گراؤنڈ میں مزید چھو لاریاں نصب کی گئیں بہاری لال چاننہ برات کے دو لہاتھے انہوں نے ممانتا تیت کا ٹیپہ لگا لیا ان واحد میں ان کا دماغ کہاں سے کہاں پہنچا ان کے بعض نامور ماختوں کو ہمارے احاطہ کی بیرک میں جگہ دی گئی اکثر اپنی دولت کے باعث کانگریسی راہنماؤں کے ساتھ ٹک گئے کیٹیوں نے ازراہ نواز مندی اپنے کمرے ان کے لئے مخصوص کر دیئے تھے اُس روز ہسٹار ہو رہا تھا طبیعت ٹھیک رہی تھی دل نڈھال تھا سیفی کا شمیری پر ملاپ کے ماشہ لیشال کا بے حد اثر تھا لیشال میری آمد سے پہلے رہا ہو گیا لیکن سیفی نے حاضر و غائب اسکی خدمت اپنے او پر فرض کر لی تھی جب تک لیشال اندر رہا سیفی کی مالی امداد کرتا رہا سیفی اس کے کپڑے دے دیتا جوتے پالش کرتا لیشال رہا ہو گیا تو ہر جینے اُسے ضرورت کی چیزیں بھجوانے لگا سیفی نے مجھ سے کہا کہ اس کا برا آمدہ خالی کر کے بیرک میں چلا جاؤں کیونکہ برآمدہ میں وہ خود رہنا چاہتا اور اپنا کمرہ باؤپر دین لگے کو دے رہا ہے۔

میں بنجار کے غلبہ سے لاچار پڑا تھا میرا خیال تھا سیفی کو ضرور احساس ہو گا اور وہ مجھے جگہ خالی کرنے کیلئے نہیں کہے گا اس کا کہنا تھا چکر باؤپر دمن سنگھ کی بیٹی لیشال سے بیاہی جا رہی ہے لہذا اُس کا فرض ہے کہ وہ باواجبی کی خدمت کرے چار دن چار میں نے جگہ خالی کر دی کسی کو یہ خیال ہی نہ تھا کہ میں اس طرح بیمار پڑا ہوں اور میری تکلیف لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

بیرک میں رات بھر رہا اگلے روز بیوپار منڈل کے کچھ اور معززین آگئے یہ کٹر قسم کے ہندو تھے جن کا چھوت چھات پر یقین تھا اب مجھے ان کے لئے بیرک بھی چھوڑنی پڑی تھی

چھڑوائی گئی آخری کوٹھڑی کے برآمدے میں جہاں گودام تھا جگہ ملی رات بھر وہاں اکیلا پڑا رہا۔ پچھلے پہر ابراگیا سلاخوں کی چھت پر چٹائیاں ڈلی ہوئی تھیں ادھر سناٹا تیز ہو رہا تھا ادھر بوند بانندی ہونے لگی چھت نے ٹپکنا شروع کیا چار کبلوں کا جاڑا اور میں دو کبلوں میں پڑا تھا۔ نیند کہاں؟ رات بھر کراہتا رہا کسی دیش بھگت کی آنکھ نہ کھلی صبح ہو گئی میں بدستور کراہ رہا تھا جو لوگ بیرو پارمنڈل میں آئے تھے وہ مزاجاً اور فطرتاً ہندو تھے اختر علی خان اور احسان الہی اس غزل میں شترگرہ تھے اور خواہ مخواہ چلے آئے تھے لالاؤں نے بیرک کو پوتر رکھنے کے لئے مجھے وہاں سے چلنا کیا۔ اُن کے تعصب کا ایک ایک ورق کھلنے لگا یہ لوگ مولانا آزادؒ کے سخت مخالف تھے اُن کا جنال تھا کہ مولانا نے کانگریسی راہنماؤں کو اس تحریک میں حصہ لینے سے روک کر سکندر وزارت کی معاونت کی ہے مولانا آزادؒ زرعی قرضوں کے معاملہ میں سکندر وزارت کی ہمتوائی کر چکے تھے انہوں نے کانگریس اسمبلی پارٹی کو ہدایات جاری کی تھیں کہ وہ زرعی قرضے کے تینجی بلوں کی مخالفت نہ کرے ان بلوں کی زد براہ راست ان ہندو جہازوں پر پڑتی تھی جنہوں نے پنجاب کے بڑے بڑے مسلمان جاگرواروں کا خون چوس لیا تھا اور اصل سے زیادہ سود لے چکے تھے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کا بنگرہ اسمبلی پارٹی کے لیڈر تھے انہوں نے بظاہر مولانا کے احکام کی متابعت کی لیکن بیابن مخالف رہے جن لوگوں نے ان بلوں کے خلاف تحریک چلائی تقریباً سبھی کانگریسی راہنماؤں نے ان کی پشت پناہی کی کانگریس اسمبلی پارٹی کے ارکان کا نکتہ نگاہ یہ تھا کہ ہمیں ہندو و وٹروں نے منتخب کیا ہے ہم اُن کا مفاد کیونکر ترک کر سکتے ہیں؟

ایک زندہ دل انسان سمن سنگھ مرگند پوری بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں نظر بند تھے انہوں نے مجھے اس بیٹے حالی میں دیکھا تو ساتھیوں کی اس شتفاوت پر اُن کا سچا بھر

آیہ میرے پاس آتے اور زور دیا کہ میں ان کے کمرے میں رہوں وہ برک میں چلے جاتے جس ان کا اس  
 حال میں اپنا کمرہ چھوڑنے کے شہ ایک ایسا تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اپنے ہی  
 کمرے میں رہیں میں یہاں ٹھیک ہوں لیکن وہ مانے نہیں اصرار کیا کہ بیمار ہو چلو زبردستی بستر اٹھا  
 کر لے گئے خود اپنا بستر برک میں لگا دیا اور بیوپار منڈل کے سوداگروں کے سر ہانے ڈیرا ڈالا،  
 میں ان کی تیمارداری سے دو ایک روز ہی میں اچھا ہو گیا میجر حبیب اللہ شاہ نے قیمتی سے قیمتی  
 دوا ہبیا کی اور اچھی سے اچھی غذا۔ تاکہ منگمری جیل کے ظالمانہ ایام میں جو کچھ مجھ پر بیت چلی ہے اسکی  
 تلافی ہو اور میں گمشدہ صحت حاصل کر سکوں جب ساتھیوں کی اس بیگانہ وحشی کا انہیں پتہ چلا تو  
 تھق ہو اسید امیر شاہ اور بھی آزرہ ہوئے بعض کانگریسی راہنماؤں سے دبی زبان میں گلہ کیا  
 آخر ایک روز ان کی معادنت سے مجھے ایک کمرہ مل گیا سجن سنگھ اپنی جگہ آگئے سید امیر شاہ نے  
 اپنے طور پر مجھے بی کلاس کی مراعات دے دیں یعنی وہ تمام سامان بھجوا دیا جو بی کلاس  
 قیدیوں کے لئے مقرر تھا۔ میجر حبیب اللہ شاہ نے میری صحت کی خرابی کے پیش نظر اعلیٰ خوراک  
 اور پھل مہیا کرنے کا حکم دیا یہ سب کچھ مشترکہ کچن کی ملکیت تھا سید امیر شاہ نہیں چاہتے تھے کہ  
 میری ہیٹی ہو ایک تو انہیں مجھ سے اخلاص تھا دوسرے مسلمان ہونے کا احساس وہ عموماً گڑھتے  
 تھے کہ ٹکے ٹکے کے لوگ آئے اور بی کلاس میں ہیں لیکن میرا مسلمان ہونا جرم ہو گیا ہے انہیں  
 سی آئی ڈی کی عداوت کا بھی علم تھا اور یونی سنٹ وزارت کے انتقام و عناد سے بھی باخبر تھے  
 بہر حال وہ مجھے اپنی محبت سے نوازنے لگے میجر حبیب اللہ شاہ کبمال و تمام ان کے ساتھ تھے  
 راج محل نواز جو منگمری سنٹرل جیل میں سپرنٹنڈنٹ رہے اور وہاں اپنے شریفانہ اخلاق کا نقش  
 چھوڑ آتے تھے آجکل اسٹنٹ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات تھے آپ دو تین دفعہ تشریف  
 لاتے اور ہمیشہ شگفتہ الفاظ میں ذکر کیا مقصود یہ تھا کہ میرے ساتھ حسن سلوک ہو اس ہمدردی

میں ایک خاص جذبہ کارفرما تھا وہ میری بے بصاحتی سے بھی واقف تھے اور پامروی سے بھی لیکن انہیں بند ذہن کی مصیبتوں نے مجھ سے حسن سلوک پر آمادہ کیا تھا انہیں احساس تھا کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان سیاسی قیدیوں کا (الامناشاہ اللہ) کوئی پُرساں حال نہیں حکومت کے اعضاء مخالف اور کانگریس کے رہنما بے اعتنائے تھے بیکر، یہ روپیہ کانگریس کے بعض لیڈروں کا تھا اس میں سٹوڈنٹ کمیونٹی ٹیچرس یا دوسرے نوجوان شامل نہ تھے ابتداء میں ان کا رد کھا بن عارضی تھا کیونکہ ہم ایک دوسرے کے نسا ساندھے۔

اسی اثناء میں ہندوؤں کا نہوار لوہڑی آگیا لالہ دھنی رام بھلا اور دوسرے بڑے بڑے لالاقوں نے رات کو احاطہ کے صحن میں آگ کا لاؤ روشن کیا۔ الاؤ میں ساگوان اور صندل کی مکڑی کے علاوہ سیروں گھی اور جانے کیا کیا ڈالا گیا منسڑ پڑھے گئے ویدوں کا ہاتھ ہوتا رہا آدھی رات تک بی سماں۔ ہا یہ سارا سامان حکام کی اجازت سے منگوا یا گیا تھا وجہ یہ تھی کہ جیل کے وزیر سرمنوہر لال اور انسپٹر جنرل کرنل پوری تھے۔

صبح ہوئی تو بچہ بابو نے خاکستر کے گرد پھیرے ڈال کر چلانا شروع کیا ریشیوں کے نام پر دھوکا بھگوان کے نام پر فراڈ! ہم لوگ دلش کی سوتھرتا کے لئے گھر سے بے گھری کلاس میں رہے ہیں صبح و شام دو تولے سرسوں کے تیل میں تڑکی ہوتی باسی بنری اور مٹری ہوتی وال طتی ہے اور یہ لوگ آگ کو دودھ پلاتے اور گھی کھلاتے ہیں اُس بھگوان کو پھانسی لگا دو جو اس سے خوش ہوتا ہے۔“

بچہ بابو سی کلاس میں غریب الدیا رقبیدی تھا بے بس عاجز، تگدست۔ اپنی روٹی بھی عام اطلاق قیدیوں کے لنگر سے منگوا کے کھانا کسی میں حوصلہ نہ تھا کہ اسے ٹوکے پارو کے سب اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں پڑے رہے وہ متواتر بکے جا رہا تھا لالہ دھنی رام بھلا (مالک جلاشو پنی)

نے کہہ کر پاتاؤ اس نے گریبان سے پکڑ لیا۔  
 ”شرم کرو۔ گتو تاکی چڑی کے بوٹ بیج کر بھگوان کے نام پر گھی جلاتے ہو مندل چھوکتے  
 ہو ساگو ان کو تہ کرتے ہو تہ ہے تم سر اور تمہارے بھگوان پر۔ لعنت ہے تمہارے انسان  
 ہونے پر۔“

ساتھیوں نے بیج بچاؤ کر کے چھڑا دیا سبر نڈنٹ کو شکایت ہو گئی لیکن معاملہ پیش  
 ہونے سے پہلے ہی رفع دفع ہو گیا۔

تیسرے چونسے روز یہ سجا بھی اُتر گئی سکندر جیتنے کہلا بھیجا کہ دو روز تک دکانیں نہ کھولیں  
 تو شنگامی اختیارات استعمال کرتے ہوئے تمام دوکانوں کو سرکاری قبضہ میں لے لیا جائیگا لالاب تک  
 نغزوں نغزا۔ اس اعلان سے پریشان ہو گیا۔ رکھ رکھاؤ کی اُکھ صلح ہوتی۔ سب۔ ہا موئے۔ معاملہ سبوں  
 کا تواریخ۔

دھمکی میں مر گیا چونہ باب سبر دتھا

### دیوتا سروپ

بہاری لال چاننہ دیکھتی آنکھوں دیوتا سروپ ہو گئے۔ متحدہ ہندوستان کے آخری  
 انتظامات میں جب کانگریس مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں نے اکٹھے میں انرا شروع کیا تو بہاری لال چاننہ  
 بھی میدان میں آگئے نہ عم انہیں یہ تھا کہ وہ اس تحریک کی بدولت ہندو بن گئے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد  
 ملکٹ کے اہل و اول کا جائزہ لینے کے لیے فلپی ہٹل لاہور میں فرڈکش تھے تو وہاں بہاری لال چاننہ  
 بھی کوہیں سے اُلکے سر لانا سے ملاقات کے لیے بہتیرے جتن کئے مگر ملاقات نہ ہو سکی دعوت  
 ہندو پارٹی میں شریک ہونے کو چائے کی میز پر بیٹھے اول فول بکتے رہے۔ بعض دوستوں نے سوال کیا

یا نہ جی آب اور یہاں؟ کہنے لگے کانگریس کے ٹکٹ کا بھجواؤ پوچھنے آیا ہوں مولانا کے کان میں بھی بھجک چڑگی وہ پہلے ہی ان سے ناخوش اور تحریک سے بیزار تھے۔ انہوں نے نہ صرف ملاقات سے انکار کیا بلکہ بعض اعلیٰ کانگریسیوں کی اس خواہش کو بھی ٹھکرا دیا کہ چائنہ کو ٹکٹ دیا جائے۔ مولانا نے چائنہ کے مقابلہ میں ایک معمولی آدمی کو ٹکٹ دیا چائنہ نے اس کو اپنی تنگ سمجھا ان کا خیال تھا کہ پکری ٹیس کے سلسلہ میں انہوں نے ہندو عہد کی بڑی خدمت کی ہے۔ لازماً یہ نشست ان کے سوا کوئی نہیں لے سکتا تھا اپنے ٹکٹ پر کھڑے ہو گئے لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہار گئے۔

پہلو ارشد کی تحریک میں نہ صرف بڑے بڑے ہندو و ماجر پکڑے گئے بلکہ شاہ عالمی دروازے کا مشہور بد معاش لالہ بلی شاہ (نبل والا) بھی اپنی منڈلی سمیت گرفتار ہوا تھا۔ ایک طرف باوا برہمن سنگھ۔ امزہ پیم کے خسر سردار کرتار سنگھ کو انزہ اور کرشن لال بھلہ جیسے لوگ تھے تو دوسری طرف ان کے ہمراہ مام و کاندار

### کامریڈ احسان الہی

کامریڈ احسان الہی دو برس پہلے اسی جیل میں شاہی قیدی تھے اور تقریباً آٹھ سال رہے جب ان کا چور نکل گیا تو راکھ و بیٹے گئے۔ الزام ان کے خلاف یہ تھا کہ انہوں نے پنجاب میں ٹیرسٹ موومنٹ کی نیورکھی بہت سے نوجوانوں کو انقلابی بنایا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ وہ صوبہ کے بیشتر انقلابیوں کے استاد رہے تھے۔ انہیں ٹیرسٹ موومنٹ کو نظم میں رکھنے کا خصوصی بلکہ حاصل تھا۔ بھگت سنگھ (شہید وطن) پر بودھ چندر (وزیر تعلیم بھارتی پنجاب) کامریڈ رام کشن (وزیر اعلیٰ بھارتی پنجاب) اور بیسیوں نوجوان جو پھانسی پا گئے انہی کے سنا کر دیکھتے یہ تمام انقلابی تحریک میں ان کے زیر تربیت رہ چکے تھے۔ افسوس احسان الہی نے اپنے سوانح حیات قلمبند نہ کیے اور اب تو انہیں یاد کرنے والا



میں کہتی تھیں سب شد کو پیار سے ہو چکے ہیں۔ رہا ہوتے تو روزگھر کا سوال درپیش تھا۔ اُن کے بھائی ایک نامور طبیب تھے ایک اچھے گھرانے میں شادی کر دی لیکن ان کی معاش کا سوال حل نہ کیا، بعد بروز شگفتگی گھرتی رہی مسلمانوں نے پوچھا کہ نہیں کہ احسان الہی آٹھ برس جیل میں کیوں رہا اور اُس کی کہانی کیا ہے۔ عام ہندوؤں کے نزدیک مسلمان ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار۔ بہت سے ہندو نوجوانوں کے دل میں اُس کا احترام تھا اور وہ ہیر و نگہ کر اُس کی پوجا کرتے تھے لیکن بہر حال وہ مسلمان ہی تھا آخر معاش سے عاجز آکر اُس نے بیوپار منڈل کی ملازمت کر لی اور آفس سیکرٹری ہوتے ہوئے بکریا گیا سپٹ سی مارنے اُس کو اودھ متوا کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے لئے نہیں بچوں کے لئے جیسا تھا لیکن جینے کی آسائشوں سے محروم تھا یہ ایک ٹریجڈی ہے اور اس ٹریجڈی کا تذکرہ پہلے صفحہ میں ہو چکا ہے کہ پنجاب سی آئی ڈی نے اُن مسلمان نوجوانوں پر جو آزادی وطن کی تحریک میں حصہ لینے اور برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے میں پیش پیش رہے نہ صرف انتہائی تشدد روا رکھا بلکہ انہیں جسمانی طور پر ناکارہ کر دیا اور دماغی طور پر ہلاک و بے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو مسلم نوجوان ہتھے چڑھے گیا اُس کو منجر بنا لیا جو ہتھے نہ چڑھے اس کو اس بُری طرح میں ڈالا کہ پناہ بخدا خود مسلمانوں میں اپنی ہی قوم کے ان نوجوانوں کے لیے جذبہ باتپاک نہ تھا ان نوجوانوں کے معاملہ میں عام مسلمان من حیث القوم سرد ہر تھے احسان الہی محض انقلابی ہی نہ تھا بلکہ ایک عمق مری نوجوان تھا اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس کی نگاہ میں علم کی بنا پر بہت کم لوگ سمجھتے تھے۔

### بھگوتی چرن

اُس کو اپنے استاد بھگوتی چرن سے بے پناہ اخلاص تھا بھگوتی نے اُس کی زندگی بدل ڈالی اُن دنوں تمام ملک میں ہم چھٹا کرتے تھے۔ وہیں سے پنجاب تک علاقہ بھگوتی چرن کی را

میں تھا۔ بھی نوجوان اُس کو گورو کہتے ایک روز وہ دریا تے راوی کے کنارے ذخیرے کے گننے و رختوں میں  
دستی ہوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ایک بم بھٹا اور جان لیوا زخم تھپوڑ گیا بھگوتی چرن زخموں  
سے چور ہو گیا۔ اُس کرٹین تھا کہ اب اُس کا بیجا حمل ہے اُس نے ریگتا شروع کیا تاکہ اپنے آپ کو راوی کی  
سوہوں کے حوالے کر دے سکے۔ لیو جو اس وقت ہمراہ تھا اس اذیت ناک مادے سے  
لاپ اٹھا۔ بھاگ بھاگ ٹھہر بیچا دو ایک ڈبوں کو لیا اور اٹھے پاؤں واپس آگیا۔ بھگوتی چرن اس وقت  
دریا کی طرف ریگ رہا تھا اُس کا جسم لہو لہان تھا دیکھتے ہی کر لہتی ہوئی آواز میں بولا۔  
”تم لوگ بھاگ جاؤ میں ختم ہو رہا ہوں بلکہ ختم ہو چکا ہوں الیسا کہ ہو کہ پولیس آجائے اور تم  
پکڑے جاؤ اب یہاں خطرے کے سوا کچھ نہیں رہا۔ چلے جاؤ۔“  
ساتھیوں نے اٹھا کر ساتھ لے جانے پر اصرار کیا اُس نے مسترد کر دیا۔  
”پاکل ہو گئے ہو۔ چلے جاؤ۔“

بھگوتی ریگتا ریگتا تنک گیا اُس نے سوچا کنارا ابھی بہت دور ہے اور وہ اس  
سے پہلے ہی مر جاتے گا۔ آخر ایک ڈھکی ہوئی جھاڑی میں گھس گیا اُس نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنا  
جسم نوکر شاہی کے حوالہ نہیں کرے گا جب پر بودہ چندرا اور احسان الہی ٹوٹے ٹھٹے ڈھانڈے  
وہاں پہنچے تو بھگوتی چرن دم توڑ چکا تھا لیکن اُس کا چہرہ کہہ رہا تھا۔ کہاں آگئے ہو بھاگ جاؤ۔“  
پولیس نے کئی دن تلاش کیا لیکن لاش نہ ملی۔ آخر ایک جھاڑی سے ہڈیوں کی ٹھھی ہاتھ آئی  
اُس کی روح ہی نہیں جسم بھی غائب ہو چکا تھا۔

### دھرم کی بات

مولانا اختر علی خان بڑے تاک سے ملے کسی وعدے کیے لیکن رہائی کے بعد بھی وعدے

دو فریق کی کہہ کرنی ہو گئے لالہ دھنی رام بھلہ کے فرزند کرشن لال بھلہ میرے ساتھ ہی پڑھے تھے جاتی دفعہ چندن نام کی آر یو ویدک معجون دے گئے جو کمزوری رفع کرنے کے لیے ایک طرح کی دوا سن تھی اس سے مجھے خاصا فائدہ پہنچا ان کے والد نے مجھے بنجار میں سردی سے بچنے کے لیے ملو بندو یا مقامین نے دھو کر واپس کیا انہوں نے چولہے میں جلا دیا پر اے ہندوؤں کی ہما جی چھوت چھات کا اندازہ ہوا بلکہ تلخ تجربہ لیکن ان کی نوجوان پود میں تعصب کا نام و نشان تک نہ تھا ابھی یہ لگ سانس نہیں ہوتے تھے کہ بیک دوست نلیفہ کے کباب اور نان دے گیا ہم چار مسلمان شینس گراؤنڈ میں بیٹھے کھا رہے تھے کہ دو ایک بندو راہنماؤں کو ناگوار گزارا بے لفظوں میں احتجاج کیا پنڈت کشوری لال سن رہے تھے۔ اٹھ کر ہمارے پاس آگئے۔

”مجھے کیا کھا رہے ہو؟“

”نان کباب“

”ہمیں پوچھا ہی نہیں؟“

”یہ آپ کے کھانے کی چیز نہیں بڑا گوشت ہے“

”تو کیا ہمیں کاٹتا ہے“

”جی نہیں۔۔۔ دھرم کی بات ہے“

”چھوڑو جی دھرم کو لاؤ کباب اور نان۔۔۔ پنڈت نے خود ہی ایک نان اور کچھ کباب

اُٹھا لئے۔ اور آنا فنا چٹ کر گئے۔

### نامور سیاسی قیدی

یو پارمنڈل کے قیدی چلے گئے تو جیل میں ایک سکون ہو گیا۔ بالخصوص ہمارے۔

میں جو شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ تعصب جاتا رہا۔ اخلاص آگیا۔ ہفتہ عشرہ بعد اس دوران میں دعوتِ مسیحی آگئی۔ ایک سردار بھگت سنگھ شہید وطن کے بھائی سردار کلیسر سنگھ جو میرے ساتھ ملتان جیل میں تھے دوسرے لائلپور کے کامریڈ سحر گل یہ دونوں سوشلسٹ تھے۔ انتہائی تہادور انتہائی دلیر ہاتھ گا ندھی نے اگست ۱۹۴۶ء میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلائی تو قیدیوں کا میلہ لگ گیا۔ کئی ہلاک اسے کلاس کانگریسی قیدیوں کے لئے مخصوص ہو گئے جن میں دو شاہی بیبرلیں بھی تھیں۔ ایک پرانا بڑھی خانہ جو شاہی احاطہ نمبر ایک کہلانا اور جیل کے بڑے دروازہ کی بائیں سمت خراس گھر سے آگے تھا۔ دوسرا شاہی احاطہ جیل پریس کے بغل میں آسنے سائنے کے دو حصوں میں تقسیم تھا پرانے بڑھی خانے میں کامریڈ احسان الہی آٹھ برس رہے تھے نئے شاہی احاطہ میں ایک دماغ سے کرتی پارٹی کے دو سکھ لیڈر رہے تھے غالباً ایک تیجا سنگھ سونتر تھا دوسرے کا نام یاد نہیں آرہا جب یہ لوگ رہا کر دیتے گئے تو ان احاطوں میں اسے کلاس قیدی رہنے لگے اب جو پولیٹیکل مومنٹ چلی تو نامور قیدیوں کے لئے ان احاطوں کو مخصوص کر دیا گیا۔

کانگریس اسمبلی پارٹی کے بیڑے ڈاکٹر گوپال چند جھارگو کو نئے شاہی احاطہ میں رکھا گیا ان کے سیکرٹری مسٹر ملک راج بھی ان کے ہمراہ تھے ادھر وہلی کے لالہ رگھونندن سرن جو انڈین چیمبر آف کامرس کے صدر رہ چکے تھے گرفتار ہو کر آگئے۔ انکے ساتھ وہلی کے کانگریسی رہنماؤں کی ایک کمیٹی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر مدھویر اور تیج کے ایڈیٹر لالہ دلش بندھو گپتا لاہور سے مولانا داؤد غزنوی، مہاشہ زیندردیوان جمن لال اور سیٹھ سدرشن نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہ لوگ پرانے بڑھی خانہ میں رکھے گئے باہر باغیچہ میں چھو لدا ریاں لگا دی گئیں۔ ایک دن سچ صاحب بھی آکلے۔ مولوی عبدالعنی ڈاڑا اور شہزادہ آزاد سمبٹ بالوی بھی چلے آئے ایک روز صبح اٹھ کر دیکھا تو پروفیسر ملک راج چڈھا موجود تھے جو دیوبلی کمیٹی ٹوٹنے کے بعد علاج کی غرض سے یہاں بھیج دیئے گئے تھے۔

اچانک ہی پروردہ چندر بھی آگئے ایک دن ڈیوڑھی سے وہیں آکر دیکھا کہ میرے کمرے کا طے ہی  
 بدلا ہوا ہے پہلے تو مجھے متعاطف ہوا کہ میں کسی اور کمرے میں گھس آیا ہوں دیکھا تو اپنا ہی کمرہ تھا  
 اتنے میں یا مین ڈار نے میرے کاندھے پر بازو رکھ دیئے اور اپنی عیبک کے دبیز شبلیوں  
 سے اس طرح ہنسا جیسے گارھی لٹی کا گلاس چھلک رہا ہو نہیں ان سے پہلے متعارف نہ تھا  
 لیکن یہ جانتا تھا کہ سوشلسٹ ہیں اور لدھیانہ میں رہتے ہیں اس عمر میں وہ نوجوان تو نہیں  
 رہے تھے کہولت کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ان کا دل اور دماغ دونوں جوان تھے عشق و عاشقی ان  
 کی فطرت تھی ایک ہی لحظہ میں اس طرح بے تکلف ہو گئے جیسے بچپن میں ساتھ کھیلے ہوں  
 بولے معافی چاہتا ہوں کہ بلا اجازت آپ کے کمرے میں آگھسا ہوں اور کوئی کمرہ خالی نہیں تھا  
 جن ساتھیوں سے سیاسی رشتہ ہے ان کے ساتھ رہنا مشکل ہے سو چا تو تمہارے  
 نام قرعہ پڑا تم نے تو اسے ایڈیٹر کی میز بنا رکھا تھا میں نے باقاعدہ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی  
 شکل دے دی ہے۔“ ط

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

نی الجملہ یا مین پر لے درجے کا حسن پرست تھا۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی اس کی فطرت کا  
 حسن تھے منہ آتی بات کہہ ڈالتا اس کے سوشلسٹ ساتھی اس سے بدکتے اور کیونٹ گہراتے وہ ان  
 سب کا مجیدی تھا کانگریسی رہنما کئی کتراتے انہیں چھیڑنا اور خلی لینا اس کا شعار تھا۔ اپنی ہانڈ و  
 ہمار طبیعت کے باعث سب پر حاوی ہونے لگا اور ہو گیا۔

### طبیعتوں کی بقلمونی

لاگرسى رہنما اپنے اپنے مزاج کی تقسیم کے مطابق دو تین دھڑوں میں بٹے ہوتے تھے ان

میں لاگ بھی تھا اور لگاؤ بھی زیادہ عنقریب سماجی ذہنیت کے ہندو راہنماؤں کا تھا  
 ڈاکٹر گوپی چند بھارگواس قبیلے کے سردار تھے لالہ بھیم سین سحر اور دیوان چمن لال کھرے نیلسٹ  
 نے پر بودھ چندر بھی اسی دھڑے کے تھے سرتاپا ہندوستانی۔ وہ گئے سوشلسٹ یا کمیونسٹ تو وہ  
 ہندو تھے نہ مسلمان۔ صرف سوشلسٹ تھے یا کمیونسٹ اور یہی ان کا دھرم تھا ٹیڈ ریلٹوں  
 میں ایک دو نو جوان کمیونسٹ تھے لیکن قدیم قیدی ہونے کی وجہ سے ان کا اپنا ایک گروہ تھا۔ سوشلسٹوں  
 کی طاقت خاصی بڑھ گئی تھی یوسف مہ علی کے علاوہ ان کے صوبائی لیڈر بھی آگئے ان سب  
 سے میرا قدیمی تعلق تھا ان کے حسن اخلاق سے اور بھی گہرا ہو گیا جہاں تک ایک دوسرے کے  
 احترام کا تعلق ہے۔ کمیونسٹ بھی میرے ساتھ مخلص ہی رہے اور کانگریسی راہنماؤں کی اکثریت  
 بھی تعصبات کے باوجود احترام کرتی رہی مولانا آؤد غزنوی کا رویہ انتہائی مشفقانہ تھا وہ سب کے  
 تھے اور ہر شخص ان کا احترام کرنا تھا خوش خوراک اور خوش پوشاک کسی کو ان کے لب و لہجہ سے شکایت  
 نہ تھی جن خوش اخلاق بزرگوں کا تذکرہ پڑھنے میں آتا ہے وہ اس کا کامل نمونہ تھے آدمی ان  
 سے مل کر اور ان کے ساتھ رہ کر گرویدہ ہو جاتا تھا ان میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عیب بین  
 اور عیب چین نہ تھے ہر کوئی ان کے لئے بچھا جاتا کسی کو ان سے نغی یا جلی شکایت نغی تو یہ کہ

۱۱، فقیری میں شاہی کرتے ہیں۔

۱۲، مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں صوبہ کانگریس کی صدارت پر مسلط کیا ہے۔  
 کانگریس کے ہندو راہنماؤں کی اکثریت کا یہ حال تھا کہ وہ مسلمانوں کو کانگریس میں بلانے  
 ضرور لیکن دروازہ بند رکھتے تھے جو مسلمان اوپر سے آتا اس کو اس طرح زچ کرتے کہ آخر کار  
 بھاگ اٹھتا جیسا کہ میاں افتخار الدین نے کیا یا پھر ان کا اجیر ہو کر رہ جاتا جیسا کہ پنجاب میں  
 ایک صاحب خلیفہ فضل الدین تھے یا پھر کبھی کبھار استثنائی کیفیت پیدا ہو جاتی مجلس احمدیہ کی الگ

عظیم کا محرک اور وجہ کے علاوہ یہی ذہن تھا۔۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ٹیگس بائی کمانڈ میں ان صوبوں کے انچارج تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی دوسرے صوبوں کی مسلمان وزارتوں کے انچارج بھی مولانا ہی تھے۔ پنجاب کا ٹیگس کے ہندو زعماء جو صوبائی جماعت پر قابض تھے مولانا آزاد کے خلاف اور سردار پٹیل کے موافق تھے لیکن مترانی کا حوصلہ نہ تھا چوبیسوں کی طرح کترتے رہتے۔ مولانا داؤد غزنوی کا ٹیگس میں شامل ان کے لیے سو مان روح تھا انہیں یہ خطرہ تھا کہ آئندہ چل کر بھی وہ صوبہ کانگریس کے سربراہ ہوں گے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو جو مدت سے صوبہ کے کرتا دھرتا تھے ڈاکٹر سعید الدین کچلو کی صدارت کے ضرور معاون ہو جاتے کیونکہ ڈاکٹر صاحب ایک تو اعلیٰ گھرے ٹیلنٹ تھے دوسرے انہیں مولانا عبدالقادر قسوری کے ہمراہیوں مجلس احرار کے رہنماؤں اور میاں افتخار الدین کے ساتھیوں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا دو نواک دوسرے کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتے تھے سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر کچلو کو مولانا ابوالکلام سے ناراضی تھی بھارگو کا دل کچلو کے سوا کسی بھی مسلمان کی طرف مائل نہ تھا یا پھر یہ کہ ان کے دل میں کسی بھی مسلمان کے لیے احترام نہ تھا۔

### بھارگو اور سمبڑیا لوی

شہزادہ آزاد سمبڑیا لوی کانگریس کے کل وقتی کارکن تھے تھوڑی بہت تنخواہ بھی ملتی ہوگی ۱۹۴۷ء میں وہ بھی پکڑے گئے۔ ملتان جیل میں انہیں اعصاب میں درد کا عارضہ ہو گیا مرمن بڑھا تو لاہور بھیج دیئے گئے گوپی چند بھارگو کے احاطہ ہی میں شہزادہ آزاد کو رکھا گیا وہ دن بھر تڑپتے رہے لیکن ڈاکٹر بھارگو کو بچوں تک نہ ریگی معاشہزادہ صاحب کا بخار تیز ہو گیا چہرہ پر دم آنے لگا جسم سوج گیا میجر حبیب اللہ شاہ دوڑے دوڑے آئے انجکشن دیا شہزادہ صاحب

کو قہر سے سکون ہوا میر صاحب نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو سے کہا کہ وہ ہر تین گھنٹے بعد انہیں ایک انجکشن دیتے رہیں ڈاکٹر صاحب نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس خدمت سے معذور ہیں شہزادہ صاحب صبح سے نڈھال ہو رہے تھے ڈاکٹر بھارگو اپنی نشست پر چرخہ کاتتے رہے۔ ویش بند ہو گیا کتابیں پڑھتے رہے کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ انہیں ناگوار تھا کہ ان کے ساتھ کیوں رکھا گیا ہے مسلمان اور مندر میں اطرین کی حیثیت میں فرق بھی مختلفہ۔ تصور شہزادہ صاحب کا یہ تھا کہ وہ کسی وقت ڈاکٹر صاحب کا ساتھ چھوڑ گئے تھے بھارگو نے سپرنٹنڈنٹ سے مطالبہ کیا کہ مریض کو جیل کے ہسپتال میں بھجوادیں سپرنٹنڈنٹ نے جگہ نہ ہونے کا عذر کیا اگلے روز سرمنوہر لال وزیر جیل خانہ آنکے بالوائے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے فوری طور پر شہزادہ کو واپس ملتان بھجوادیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اندازہ تھا کہ ان کی اس ذہنیت کے خلاف ناراضی پیدا ہوگی نیکن وہ اپنی سٹ کے پکے تھے۔

مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرو شروع کیا تو ڈاکٹر صاحب کے حاومت میں رسوخ کا یہ حال تھا کہ جس شخص کو چاہتے بہتر کلاس دلوادیتے جسے چاہتے پرول پرہا کر دیتے سردار سکندر حیات نے انہیں رعایت دے رکھی تھی کہ وہ صوبہ بھکر کی جیلوں کا دورہ کریں پولیٹیکل قیدیوں کے آرام و آسائش کا جائزہ لیں اور اس ضمن میں جو تجویز مناسب سمجھیں وزارت کو لکھیں بلاتاًخیر عمل ہو گا لیکن اس سے کانگریس کے ہندو دوستوں ہی کو فائدہ پہنچا مسلمان کانگریس میں خال خال تھے گنتی کے جو لوگ تھے ان میں سے دو چار کو بہتر کلاس مل گئی لیکن ان کی حیثیت یہ تھی کہ جیسے بہتر کلاس خیرات کے طور پر دی گئی ہو احرار کے معاملہ میں سردار سکندر حیات اور ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ہنجیال تھے نتیجتاً مسلمان قیدیوں سے جو نامناسب سلوک بھی ہو سکا روارکھا گیا اس تندہ و بہمت کے خلاف کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی۔



سرمنوہر لال ڈاکٹر گوپی چند کے اشارہ ابرو پر چلتے تھے پٹیل قیدیوں کے معاملہ میں ٹاکر صاحب جڑھاتے ہو جانا گسی عدلیہ یا ناخبر کا سوال ہی نہ تھا۔

ہم نے مولانا داؤد غزنوی سے عرض کیا کہ وہ ڈاکٹر بھارگو کے اس سنگدلانہ رویہ کی کیا توجیہ کرتے ہیں؛ لیکن وہ خود کشیدہ خاطر تھے سرد آہ بھر کر چپ ہو گئے ہم نے آنا دسبرٹالی کی علالت سے بدسلوکی پر خود ڈاکٹر گوپی چند سے احتجاج منا لیا کیا لیکن یہ کہہ کر ٹال گئے کہ میں کیا کر سکتا تھا اور ایک بیمار کی ذمہ داری کیوں کر لے سکتا تھا؛ کلیرنگ کو غصہ آگیا اس نے کہا

”جی ہاں ایک اہنسا وادی یہی کہہ سکتا ہے“

ٹاکر صاحب انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے جو انہیں کرنا تھا وہ کر چکے تھے بات آئی گئی ہوگی لیکن اس ایک واقعہ نے کئی واقعات کو جنم دیا جس سے فکر و نظر کے اختلاف میں کلمہ کھلا تصادم ہو گیا۔

### سیلفی کاشمیری

مجھے یہاں آتے ہوئے کوئی دو ماہ ہو چکے تھے اور اب میں ہر شخص کی طبیعت و مزاج سے آشنا تھا کانگریسی زعما اور کمیونسٹوں کو چھوڑ کر باقی بچنے تو جوان تھے مجھے اپنا سرخیل سمجھتے اور مسلمان قیدی تو بچھے جاتے تھے الا سیلفی کاشمیری جس نے سیاسی زندگی کا اتحاد مجلس احرار اسلام لاہور کی سیکرٹری شپ سے کیا لیکن ایک ایکی کانگریسی میں جا پہنچا اور کانگریسی کے اُس گروہ میں شریک تھا جو مسلمانوں کے خلاف تھا۔ سیلفی جموں کے غول رکھنے میں قید ہوا تھا اُس کے والد انارکلی میں درزی کی دوکان کرتے اور نہایت فیک نفس انسان تھے ہیشال نے اس شرط پر اس کی ضرورتوں کا ہاتھ بتایا تھا کہ وہ بندی کیلئے گا

نورمانڈہ ہندی ہی میں اُس کو خط لکھے گا چنانچہ اُس نے جیل میں صرف یہی کام کیا اس کو نہ اسلامیت سے کوئی شغف رہا اور نہ وہ کسی گروہ یا جماعت ہی سے وابستہ تھا جب ٹیرسٹ وائرڈ کی آبادی بڑھی تو اس کو کسی اور جیل میں بھیج دیا گیا جب تک وہاں رہا پیشال ہی کا ہو کے رہا اُس نے خود مہر دگی قبول کر لی تھی۔ کسی ساتھی کو اُس پر اعتماد نہ تھا۔ بعض نزدیک از زبانیں اس کی عاداتِ خفی و جہلی پر اکثر و بیشتر تبصرہ کرتیں لیکن ہمارے لغت سے وہ خارج ہو چکا تھا۔

### سید حبیب

سید حبیب کے معاملہ میں مجھے ایک عجیب کشمکش سے گزرنا پڑا۔ اُن کے خاندان سے میرے خاصے تعلقات تھے۔ گوان تعلقات کا آغاز مسٹر مقبول انور اودی مدیر معاون روزنامہ سیاست کی بدولت ہوا تھا جو میری طالب علمی کے زمانے سے دوست تھے۔ میں نے شعر کہنا شروع کئے اور کسی قدر مشق ہو گئی تو ان کی وجہ سے سیاست میں چھپنا شروع ہوتے۔ اس طرح سیاست مرحوم کے عملہ سے ایک دوستانہ علاقہ پیدا ہو گیا۔ سید حبیب کے براہِ خورد سید عنایت اللہ شاہ بڑے ہی نیک نفس انسان تھے ان کے دو بڑے لڑکے سید عطا۔ اللہ شاہ اور سید عتیق اللہ شاہ میرے جگری دوست بن گئے سہانیت شاہ مجھے بھی بلوڑوں کی طرح سمجھنے لگے سید حبیب اپنے بھائی کے بالکل الٹ تھے عنایت شاہ کے وجود میں ایک مثالی انسان بسا ہوا تھا۔ سید حبیب شاہ بدگمان طبیعت کے انسان تھے عنایت شاہ فقیر منش تھے لیکن سید حبیب فقیری میں بادشاہی کے خواب دیکھتے۔ ان کی اخبار نویسی کا انحصار دشنام و سلام پر تھا جس سے بگڑتے اُس کی تباہی پر تپل جاتے۔ خود اسی تباہی کے ہاتھوں تباہ ہو گئے۔ اُن کی سیاسیات میں ذاتیات کا حصہ تھا جس سے دوستی کا نٹھی جب تک بنی رہی

نجد ہی پھرائس کے لئے اصول یا صداقت جو کچھ ہوتا قربان کو دے مٹن گئی تو پھر ان کے سامنے کوئی سا اخلاقی اصول نہ تھا وہ اپنے دشمن کو ہر تہیارسے قتل کرنا جائز سمجھتے تھے لاہور میں مسلمانوں کے تین روزنامے تھے زمیندار انقلاب اور سیاست پہلے دو تو اپنے ایڈیٹروں کی تالیفیت اور وجاہت کے باعث قابل اعتناء تھے مولانا ظفر علی خان کی ہجو نگاری سے لوگ ڈرتے تھے لیکن وہ ایک ادیب طراز تھے جو کچھ لکھتے زبان و بیان کی خوبی سامنے رکھ کر لکھتے۔ سید حبیب برہنہ گفتن کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے جس کے پیچھے بڑگئے اس کی عورت و ابرو کے دشمن ہو گئے۔ ان کے مزاج میں غرور تھا اور دھڑ سے روپیہ جمع کر کے لاتے تو دفتر میں نواب بن کر بیٹھتے یہ روپیہ ختم ہو جاتا تو پھر دورہ پر نکل جاتے۔ ان کے اخبار کی جہات کا انحصار زیادہ تر بڑے چھوٹے جاگیرداروں اور اڑتے پھرتے دونوں کی امداد پر تھا شہید گنج کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن حبیب تحریک ٹھنڈی رہ گئی تو سرجماعت علی شاہ سے اُلجھ گئے کیونکہ وہ سرزاد معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کے مریدوں کے زمرے میں تھے اور وہی بولی بولتے جو مرید بولتے تھے سید حبیب مدۃ العمر سید جماعت علی شاہ کے حامی رہے بلکہ ان کی سیاسی شہرت کو قائم کرنے میں حصہ لیا دونوں میں تغلین خاطر تھا میرزا معراج دین نے شہید گنج کی بلا گونالنے کے لئے جب انہیں جج پر بھجوانا چاہا تو سید حبیب آڑے آگئے انہوں نے پیر صاحب سے کہا کہ وہ اس مرحلہ میں جج پر دجائیں۔ پیر صاحب نہ مانے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سید حبیب کی پیر صاحب سے ٹھن گئی جس دن وہ جج کو جارہے تھے ان کے بعض مریدوں نے سید صاحب کو پیغام دیا کہ پیر صاحب یا فرما رہے ہیں۔ سید صاحب نے تشریح لہجہ میں جواب دیا کہ وہ ان سے ملنے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہیں میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی بڑے ہوشیار اور کاتیاں آدمی تھے شہید گنج کی تحریک کو انہوں نے بڑی جاکم تھی

سے ناکام کیا تھا سید صاحب اس بڑی طرح اُلجھے کہ تلواریں ٹکرائیں سید صاحب بے عزت کرنے سے نہ رکتے تھے میرزا معراج دین بدلہ لینے میں مشتاق تھے سید حبیب مولانا ظفر علی خان سے اُلجھ چڑھے ڈاکٹر عالم کو بھی رگیدا۔ الیکشن کا نتیجہ نکلا تو سردار سکندر حیات کو دھر دگڑا، سردار گلشن بیگ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جج تھے اُن سے پیچ پڑا تو چپت کر کے دم لیا سرسہر بڑا میرسن صوبہ کے گورنر نے ملاقات میں بد تمیزی کی تو پیچھے پڑ گئے۔ قلم کی نوک پر جو آیا مارا گیا۔ سردار صلاح الدین سلجوقی سندھ وستان میں افغانستان کے قونصل جنرل تھے اُن سے مدتوں دوستانہ رہا۔ بگڑے تو ایسے بگڑے کہ بے پناہ ہو گئے غرض نیاست انہی لڑائیوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا جنگ کے زمانہ میں رکار کے ہتھے چڑھ گئے حکومت نے افغانستان کی شکایت پر نظر بند کر دیا۔ اندر بھی لڑائی باندھ رکھی تھی سرکار نے ہر طرح کی مراعات دی ہوئی تھیں۔ جیل کے حکام عزت سے پیش آتے لیکن سید صاحب کی طبیعت کو چین نہ تھا گورنر کو خط لکھا کہ مجھے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا ہے لہذا اب ماہ کی رخصت دی جائے درخواست مسترد ہو گئی سید صاحب نے آؤ نہ دیکھا تاؤ گورنر کو اب اور خط لکھا جس میں سکندر حیات کو ملا حیاں سناتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ انگریز تو نکاح کی اہمیت کو سمجھتے ہی نہیں کیونکہ ان کے معاشرہ میں نکاح سرے سے ہے ہی نہیں سکندر حیات کے نزدیک بوجہ نکل متروک ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خط غیر شریفانہ اور ناقابل برداشت تھا شاہ صاحب کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس کے علاوہ اور کئی اسباب تھے جن کے باعث انہیں لاہور سے اٹھا کر کسی دور دراز جیل میں بھیج دیا گیا۔

یہ تباہی تھی خود اپنے ہاتھ کی لائی ہوئی

شاہ صاحب چاہتے تو لاہور میں رہ سکتے تھے یہاں انہیں بہت زیادہ آرام حاصل تھا خود

نور اللال ان کا خیال رکھتے سپرنٹنڈنٹ جیل مسجد حبیب اللہ شاہ ایک تو خود شریف النفس انسان

تھے دوسرے میرزا بشیر الدین محمود نے بھی ہانپیں کہہ رکھا تھا۔ شاہ صاحب قیمتی سے قیمتی  
دوائیں سرکاری فرج پر حاصل کرتے کھانے پینے کو بھی بہت کچھ ملتا اب چونکہ کاروبار کی تباہی  
سے گھر کے حالات بدل گئے تھے اور بیویاں بھی دو تھیں اور ان دونوں کے گھر بھی الگ الگ  
تھے اس لیے سبھی کچھ گھر بھجوا دیتے ٹفن کی سیر صبح آتا اور شام کو یہ چیزیں اُس میں بند ہو کر  
چلی جاتیں۔ جنگ کا زمانہ تھا دوائیاں ہنگی تھیں بازار میں بک جاتی تھیں۔

شاہ صاحب نے دو چار بڑے ہندوؤں کے ساتھ رسم و راہ رکھی لیکن وہ بھی دل سے ان کی  
عزت نہ کرتے تھے ان کے سوا ہر ایک سے اُن کا بھگڑا تھا برتری کون مانے؟ چھوٹی چھوٹی  
شکایتیں جمع ہوتی گئیں نتیجہً بعض دوسلوں سے تصادم ہو گیا میں شاہ صاحب کی عزت ہی  
کرتا رہا اُس کی وجہ اُن کے بھائی اور بھتیجے تھے لیکن شاہ صاحب کو ایک تو عمر نے چڑھا کر دیا  
تھا دوم مزاج ہی کچھ ایسا پایا تھا اس کے علاوہ گھر کی صورت حال سے پریشان تھے مستقبل قریب  
میں رہائی کا امکان نہ تھا دھونس سے رہنا چاہتے تھے امد حکومتیں ان حالات میں دھونس  
کہاں مانتی ہیں۔

### ٹیلو کے لیے اُسترا

جیل میں ٹیلو ہانے کے لیے سیون اوکلاک کے بیڈتے تھے میری طرح کچھ دوست ایسے  
بھی تھے جو خود سیون بنا سکتے تھے ہم نے سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کی کہ وہ ہمارے لئے  
حجام کا بندوبست کریں سپرنٹنڈنٹ راضی ہو گئے لیکن عذریہ کیا کہ تو امد کی رو سے اُسترا جیل  
میں نہیں آ سکتا اور وہ قیدی حجام مٹرا اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یہ پایا کہ سید صاحب چونکہ  
عمر میں سب سے بڑے ہیں اور اُن سے اُسترا کے غلط استعمال کا خطرہ بھی نہیں، لہذا وہ ایچ

پاس اُسترا رکھیں حجام ہر روز صبح سویرے حجامت کر جایا کریگا۔ شاہ صاحب نے اس کو بھی اپنی بلا دستی پر معمول کیا حجام کو حکم دیا کہ سب سے پہلے اُن کا خط بنایا کرے دو قیمتی اُستریں منگوانے گئے کوئی مشراستی روپے میں آئے تھے۔ ایک اُسترا شاہ صاحب نے اپنے لئے مخصوص کر لیا وہ سراسر اے اعظم کے لیے، شاہ صاحب نے کمال نہ کیا کہ دونوں اُستریں گھر بھجوا دیئے اور ان کی جگہ دس پندرہ روپے کا ایک اُسترا منگوا کر رکھ دیا اپنا خط وہ بلبڈ سے بنواتے رہے جس روز پڑھتی ہم صبح سویرے شیونواتے اور کپڑے بدلتے تھے ایک دن شاہ صاحب بال کٹوانے لگ گئے معمول یہ تھا کہ صبح شیونواتے اور دوپہر کو بال کٹواتے تھے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ سپد صاحب سے عرض کی کہ وہ حجام کو ذرا جلدی فارغ کر دیں۔ شاہ صاحب نے ارادۂ تاخیر کر دی جیسے ہمارا سکا تم انہیں کوئی سد ہو ہم ناموش ہے شاہ صاحب خوروں کی عزت نفس کا مطلقاً احترام نہیں کرتے تھے۔ ہم نے حجام سے کہا بھائی یہ اُسترا ہمارے نیے آیا ہے آپ سب سے پہلے ہمارے شیون بنا دیا کریں حجام نے کہا شاہ صاحب نہیں مانتے۔ ہم نے کہا وہ شیون نہیں بنواتے صرف داڑھی کے فالٹو بال تریشواتے ہیں۔ شاہ صاحب گبڑ گئے۔ ہم سی کلاس والوں کو ڈلتے ہوئے فرمایا سب سے پہلے اسے کلاس قیدیوں کی حجامت بنے گی سی کلاس قیدیوں کی باری بعد میں آتی ہے کوئی حق نہیں ان کا انہیں محض رعایت دی گئی ہے۔“

اس قسم کی باتیں وہ عموماً کیا ہی کرتے تھے اب جو انہوں نے اس طرح زبان کھولی تو بی کلاس قیدیوں میں سے ایک کوتا دا گیا۔ شاہ صاحب کو سختی سے ٹوکا شاہ صاحب کا فرض تھا کہ وہ انہیں جواب دیتے لیکن انہوں نے اُلٹا مجھے مطعون کرنا چاہا حالانکہ میں ان کے بھائی کی دگر سے اُن کا احترام کرتا اور اس قصہ سے الگ تھا لیکن شاہ صاحب ان

دونوں بھائی سے بھی انداز تھے بھائی کا لڑکھانے لگے کہ میں اُن کے اشارے پر اُن سے شہرت لگاواں  
 کہہ رکھتا ہوں اور جو کچھ ہو رہا ہے اُن کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ سید عنایت شاہ میں  
 شرکاً شائبہ تک نہ مخاؤہ حقیقتاً فرشتہ سیرت انسان تھے۔

دونوں بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن عنایت شاہ کو خراج ہوا کرتے ہوئے  
 مسرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں اس قسم کے لوگ بھی موجود تھے سید حبیب کے  
 بارے میں یہ خیال مانع ہے کہ اللہ کو پیار سے ہو چکے ہیں اور یہی چیز اُن حالات کے اقتضا کو  
 روک بنی ہوئی ہے جن حالات نے انہیں عبرت کا درق بنا دیا تھا۔ شاہ صاحب کی  
 یہی مصنوعی رعوت انہیں لے ڈوبی اور وہ کہیں کے نہ رہے۔ اُسٹری کے معاملہ میں آپے  
 سے باہر ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھر میں اُسٹری بھجوا دینے کا راز فاش ہو گیا۔ شاہ صاحب نے  
 حجام کو گالیاں دیں کہ اُس نے پر راز کھولا ہے اب ایک طرف اکیلے شاہ صاحب دوسری طرف  
 ٹیرسٹ وارڈ کے بھی قیدی، لوبت بہ اینچار سید کہ شاہ صاحب کو لاہور جیل سے نکلنا پڑا منظر گڑھ  
 یا کسی اور جیل میں اُن کا چالان کر دیا گیا جاتے جاتے ڈٹ گئے کہ میں نہیں جانا حکام نے منتیں  
 کہیں ہاتھ جوڑے لیکن شاہ صاحب ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے آخر جیل والوں نے آنکھیں  
 دکھائیں شاہ صاحب بیدھی الٹلی گھی نکلنے ہی نہ دیتے تھے ساتھیوں کی ہمدردیاں پہلے ہی  
 کھو چکے تھے ایک تو اس قسم کے واقعات ان کے ہاں عام تھے دوسرے انہوں نے رہائی  
 کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ممبر اور صوبائی سرکار کے مقدمہ میں کیٹی کو جو عرضداشتیں  
 جمعیں اور ان میں جو واقعات لکھے تھے وہ سیاسی اخلاق کے منافی تھے شاہ صاحب نے  
 ان عرضداشتوں میں تحریر کیا تھا کہ وہ فلاں فلاں موقع پر فلاں فلاں ریاستوں میں فلاں فلاں  
 نوعیت کی بااثر خدمات انجام دے چکے ہیں جس انفالتان کی شکایت پر انہیں نظر بند

کیا گیا ہے وہاں بھی حکومت ہندی خواہش پر فلاں کام کیا تھا اور اب انہیں صرف اس لیے قید میں رکھا جا رہا ہے کہ سکندر حیات ان کے ذاتی مخالف ہیں۔

بہر حال شاہ صاحب کو وارڈروں اور قیدی نمبرداروں نے زبردستی کاٹھھے پراٹھایا اور ایک عجیب مٹھک انداز میں ڈیوڑھی تک لے گئے جہاں انہیں پولیس گلارو کے حوالے کر دیا گیا شاہ صاحب کے جانے کا کسی کو قلق نہ تھا سمجھی خوش تھے اور اس کی وجہ جیسا کہ عرض کیا خود شاہ صاحب ہی تھے۔

یوسف مہر علی نے شاہ صاحب کی عرضداشتوں کو اپنی آنکھوں دیکھا تھا اور غالباً انہیں سپرٹنڈنٹ نے وہ تحریریں دکھاتی تھیں انہی سے یہ باتیں رازدار دوستوں میں پہنچی تھیں عرضداشتوں میں جن خدمات کا حوالہ دیا گیا ان میں ایک خدمت یہ تھی کہ عزیز ہندی القاتلان سے والپسی پر جب شاہی قیدی بنا دینے گئے تو حکومت نے بہت چاہا کہ ان سے کچھ حاصل کرے لیکن تمام کوششیں رائیگاں ہو گئیں شاہ صاحب حکومت کے کام آتے تھے۔

### عزیز ہندی

عزیز ہندی سال ۱۹۱۴ء میں ہجرت کر کے افغانستان گئے تھے وہاں سالہا سال رہے مختلف سفارت خانوں سے تعلق پیدا کیا کئی انقلابی تحریکوں کی مالی اعانت کرنے رہے ان کے سامنے برطانوی حکومت کو الٹا دینے کا ایک مشن تھا امان اللہ خاں پٹ گئے تو انہیں بھی ہندوستان آنا پڑا پنجاب سی آئی ڈی کے مسلمان افسروں نے انہیں بہت ستایا لیکن ان سے کچھ نہ لے سکے۔ شاہ صاحب نے ہوم سیکریٹری سے رابطہ پیدا کر کے اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کیں سو دا بھی ہو گیا لیکن ایک ارہن رہ گئی شاہ صاحب چاہتے تھے کہ



عزیز ہندی سے اکیلے ملیں اُن سے اپنی رشتہ داری بھی ظاہر کرتے تھے لیکن سی آئی ڈی تنہا  
 طاقت پر متفق نہ ہوئی شاہ صاحب نے بہتیرے جتن کئے تمام اکارت گئے آخر میرزا معراج دین  
 سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کے ہمراہ ٹانگت ہوئی عزیز ہندی انڈی نہیں تھے بیل منڈھے نہ چڑھی دو خوشلی  
 ہاتھ لوٹ آئے میرزا معراج دین نے کسی دوست سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو میں اُس وقت  
 یہی سمجھا کہ سی آئی ڈی نے حسبِ عادت گپ چھوڑی ہے لیکن شاہ صاحب کے اپنے اعترافات  
 سے یہ بات ثابت ہو گئی۔

عزیز ہندی بھی اسی پرک میں تھے۔ ایک دن انہوں نے خود ہی یہ سارا قصہ بیان کیا کہ شاہ صاحب  
 کس طرح اُن سے راز حاصل کرنے آئے تھے ان کے دل میں بھی شاہ صاحب کے بیٹے  
 کوئی وقعت نہ تھی وہ ایک دیوانہ مزاج انقلابی اور اسلام دوست فلسفی تھے۔  
 مطالعہ اُن کا بہت وسیع تھا۔ عصر حاضر کی تمام تحریکوں کے عالم تھے۔ ان سے میں نے سوشلزم کیونزم  
 فاشزم اور انارکزم کے بارے میں کئی کتابوں کا علم حاصل کیا۔ بعض چیزیں سبقاً سبقاً پڑھتا رہا  
 اُن کا عقیدہ تھا کہ انسانیت کی بھلائی کے لئے اسلام کی تعلیمات سے زیادہ کوئی فلسفہ یا  
 فکر موزوں نہیں ہے۔ اس موضوع پر وہ بہت کچھ لکھتے رہے لیکن طبع نہ کرایا امان اللہ خان کے  
 عزل پر اُن کی کتاب "ذوال غازی" بڑی معلوماتی دستاویز ہے پاکستان بنا تو بروایت خان لیانٹ علیخان  
 کے ایما۔ پر آزاد قبائل میں چلے گئے وہاں جن کے ہاں ہمان ٹھہرے تھے ان کی معرفت  
 حکومت افغانستان کے ہاتھ آگئے۔ سترہ برس تک کچھ پتہ نہ چلا کہ حیات موت کی کس سرحد پر  
 ہیں؛ ایک روز اپنا ملک افغانستان سے رہا ہو کر لاہور پہنچ گئے ہیں۔

اب وہ ایک مشتِ استخوان ہیں قدرت نے ان کی صحت کو ایک ایسا کھنڈر بنا دیا ہے  
 جس کی رونق مرچکی ہو سترہ برس کی قید نے ان کے دل و دماغ دونوں کو متاثر کیا ہے حواسِ خمسہ

کا ایک احتجاج رد گئے ہیں۔ طبیعت میں ایک ولولہ ضرور ہے اور یہ ولولہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا ہے لیکن جس دنیا میں اب لوٹ کر آتے ہیں وہ اتنی تجرور فتنار واقع ہوتی ہے کہ ان کے خیالات اور اس کے واقعات بس مطابقت پیدا کرنا ناممکن ہو چکا ہے بہر حال ان کے افکار کی ایک اڑان ہے اور وہ اس دشت افکار میں قلبیں آبلہ پا کی طرح ہیں۔

### جیل یا کلب

جیل تو بہر حال جیل ہے لیکن لاہور سنٹرل جیل مقابلہ آرام وہ تھا۔ سو ساسٹی اتنی اچھی مل گئی تھی کہ اکادمی کا لٹریچر بن گیا تھا۔ دن رات سیاسیات کے موضوع پر بات چیت ہوتی۔ ادب بھی پلٹا شاعری بھی ہوتی جدید و قدیم کا تذکرہ رہتا۔ لطیفے اڑتے تو دونوں ہی سماں بندھا رہتا کئی کئی راتیں اسی کی نذر ہو جاتیں وطن و وطنہ کا بازار گرم ہوتا مگر لطافت ہاتھ سے نہ بھٹتی تاریخ ابیاست معاشیات تو گویا روزمرہ کے مضامین تھے ادب سے کم لوگوں کو دلچسپی تھی شاعری کا چمکہ چودہری کرشن گوپال دن کو تھا لیکن بانگ درا کی بعض نظموں تک! وہ خوش آواز تھے لہک لہک کر پڑھتے۔ پوپار منڈل والوں کو اقبال کی مینیر نظموں اپنے ہی نام سے سناتے۔ چودہری صاحب نے اپنے بارے میں یہ تاثر پیدا کر رکھا تھا کہ وہ سبید عطا۔ اللہ شاہ بخاری سے بڑے خطیب ہیں اور ہندوؤں میں ان سے بڑھ کر کوئی مقرر نہیں لیکن ان کی معلومات بڑی سطحی تھیں۔

### یوسف مہر علی

یوسف مہر علی تاریخ اور سیاسیات کے عالم تھے انگریزی ادب کا مذاق بھی خوب

پایا تھا اور مصنف اور مولف تھے ہمیں کیا پڑھنا چاہیے اس عنوان سے انہوں نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے تشریحی حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر وسیع المطالعہ ہیں اُس وقت اُن کی عمر ۲۰-۲۲ سال کے لگ بھگ تھی۔ سرخ و سپید رنگ، کتابی چہرہ، کھلا ماتھا، لمبی پلکیں، سرگین، میاں قد، گفتگو میں رس، چال میں آہستہ خزان، بلکہ مخزائی مہبتی کے ایک بڑے گھرانے کا سپراغ تھے جسے پرکاش ناراتن اچھوت پٹور وھن اور رام منوسہر لوسیا کے ساتھ مل کر سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی اور اسی کے ہو گئے تھے گاندھی جی سے وِجی نائیڈو اور مولانا آزاد انہیں بے حد عزیز رکھنے انہوں نے یہ عنوان ہمارے لیڈر کانگریسی راہنماؤں کے سوانحی خاکے بھی لکھے تھے۔ یہ کتابچہ بے حد مقبول ہوا اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر لاکھوں کی تعداد میں بک گیا۔

معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اُٹھتے اور مجھے ساتھ لے کر احاطہ میں ٹھلا کرتے کئی عنوانوں پر گفتگو رہتی افراد و شخصیات خصوصیت سے زیر بحث آتے۔ ان دنوں وہ سیاحتِ پاکستان کے ہم سے ایک کتاب لکھ رہے تھے اس کتاب کی اکثر معلومات دوستوں سے حاصل کرتے۔ بالخصوص مسلم سیاسیات کے بارے میں میرا نقطہ نگاہ معلوم کر کے اس کا تجزیہ کرتے اور خاصی بحث کے بعد کسی راتے پر متفق ہوتے۔ رات کو جب گنتی بند ہوتی تو گھنٹہ دو گھنٹہ ٹھلتے۔ میں ساتھ ہوتا انہی مومنومات پر گفتگو ہوتی وہ جیل میں ضابطے کے سختی سے پابند تھے کبھی فضول بحث نہ کرتے نہ منڈلی لگاتے نہ عام جھگڑوں میں پڑتے تمام دن پڑھتے یا لکھتے کھانا بھی اپنے ہی کمرے میں کھانے بس ٹھیلنے کے وقت باہر آتے انہیں مجھ سے ایک اُنس ہو گیا تھا اور ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی سیرت کا عکس دوسروں پر ڈالتے ہیں کوشش اُن کی یہ تھی کہ میں راتوں کے بعد سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہو جاؤں۔ وہ مجھے

اپنے ہائی کمانڈ میں لینے کی خواہش کا بھی اظہار کرتے رہے مگر میں ان کے ڈھب کا نہ تھا۔ میں ہندوستان سے برطانوی حکومت کے انخلا کی مدت تک نوٹیشلسٹ تھا لیکن میرے دل و دماغ میں کچھ عصبیتیں بھی تھیں مہرے تجربہ نے مجھے تیشلزم کی ہندو چھاپ سے باعنی کر دیا تھا۔ میں اقوال کی جگہ اعمال دیکھتا حسب بھی کانگریس کے بعض راہنما مجھ سے آزادی کے سوال پر گفتگو کرتے یا ملکی سیاسیات زیر بحث آئیں میں مسلمانوں کی انفرادیت کے مسئلہ کو نمایاں کرتا تاہم میرا نقطہ نگاہ فریب قریب وہی تھا جس کا اظہار ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا تھا کہ

”ہندو من سین الجماعت تنگ دل اور تنگ نظر ہیں مسلمان من صحت الجماعت

بزول اور کوتاہ اندیش“

صحیح الفاظ تو مرے سامنے نہیں ممکن ہے اب آدھ لفظ کا فرق ہو لیکن اجتماعی مفہوم یہی تھا ایک دفعہ یوسف مہر علی کی موجودگی میں ہندو مسلم مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ میں نے مولانا محمد علی کا یہ فقرہ نقل کیا تو ہیرک اٹھے

”وہ ہندو جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہتے ہیں کمیونسٹ ہیں اور وہ مسلمان

جو اپنے آپ کو کمیونسٹ ظاہر کرتے ہیں خود غرض ہیں“

وہ تاریخ کے مادی پس منظر پر یقین رکھتے اور اس کے احوال و ظروف کی مدد سے ہی میں اقوام و ملل کے افکار و اعمال کو پرکھتے تھے میں نے جب انہیں پنجاب کانگریس کے نمینڈوں کے خدو و حال سے آگاہ کیا اور اس بات کی صراحت کی کہ ان لوگوں کا سیاسی چال چلن کیوں نہ ہو مشکوک ہے تو وہ حیران رہ گئے مثلاً اس دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں امرار نے سب سے پہلے برطانوی سامراج کو لاکارا اور فوجی بھرتی کے بائیکاٹ کا اعلان کیا سکندر وزارت نے امرار کو اس بُری طرح مارا کہ مظالم کی حد ہو گئی ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور ان کے ساتھی نہ صرف تماشاً دیکھتے

سبے بلکہ ورپودہ سکندر وزارت کی اعانت کی۔ لیکن ذہین کے مسلمان احرار کو کانگریس کا  
 اچرہ بچھے اور کانگریس کے ہندو دنیا کٹھن ملا ان کے نزدیک احرار صوری اور معنوی غلطیے فرقہ پر  
 بن تھے یہ واقعہ ہے کہ پنجاب کانگریس کے ہندو راہنماؤں نے سکندر وزارت سے ذہنی طرد پر مجبور  
 کر لیا تھا کہ کانگریس سے باہر وہ جس مسلمان جماعت سے جو سلوک بھی چاہیں کریں انہیں کوئی  
 قرض نہ ہو گا یہی ہوا۔ احرار پٹتے رہے کانگریس نے تماشا دیکھا مسلمانوں نے قہقہے  
 لگاتے انگریز مطمئن رہا کہ مٹھی بھر لوگوں کی ایک مسلمان جماعت گھر میں اور گھر سے باہر کسی اعتنا  
 کے قابل نہیں ہے یوسف مہر علی کو جب ان تفصیلات کا علم ہوا تو وہ شدید رونا گئے۔ بلکہ  
 انہیں نلق ہوا کہ کتنے ہی اصول بعض افراد کی وجہ سے ناکارہ ہو جاتے ہیں وہ خود بھی اپنی آنکھوں  
 سے کئی واقعات دیکھ چکے تھے۔ جتنے دن یہاں رہے ہر روز ہندو ذہنیت کا تجربہ کرتے رہے۔  
 ایک دن انہوں نے مختلف واقعات و حالات کی کڑیاں ملاتے ہوئے مہانت گاندھی کے اس  
 قول کا اظہار کیا کہ

”پنجاب سی آئی ڈی کا صوبہ ہے“

مولانا ابوالاعلام آزاد نے بھی اپنے ایک خطبہ میں لکھا ہے کہ

”اس زمین نے حق و انصاف کے حلاف سب سے زیادہ خون بہایا ہے“

بعض نوجوانوں نے مولانا سے استفسار کیا کہ وہ پنجاب میں کیوں نہیں آتے؟ یہاں کے حالات زیادہ خراب  
 ہیں فرمایا جو وجہ یہاں آنے کی ہے وہی نہ آنے کی؟ ”آں انڈیا کانگریس کمیٹی کے بڑے  
 بڑے راہنماؤں نے پنجاب کانگریس کو کبھی عزت یا مسرت سے نہیں دیکھا۔ یوسف مہر علی  
 کا یہ تاثر اور بھی گہرا ہو گیا چنانچہ جب وہ رہا ہو کر بمبئی واپس جانے لگے تو ان واقعات سے کچھ زیادہ  
 خوش نہ تھے یہاں وہ تھوڑے سے دن رہے لیکن اپنی عالماہ بعیرت کا نقش چھوڑ گئے



تین سال گزار چکا ہے اس کی جسمانی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔

ہمارے احاطہ میں کوئی نوجوئے شب ایک دراز قد نوجوان ٹھلٹھا ہوا نظر پڑا،  
 دھان پان پھرہ صاف بیس باتیں برس کی عمر کا لڑکا سنو ریش بہ لحاظ عقیدہ  
 اُن لوگوں میں سے ہے جو عزت و اکبر و کے ایک پر خود شلمہ کو غیر معروف  
 زندگی کی عمر دراز سے بہتر خیال کرتے ہیں۔

شورش میں عمل پہلے سوچ بعد میں ہے۔ وہ پر جوش شخص انتہائی جذباتی  
 اور شاعرانہ لب و لہجہ کا نوجوان ہے۔ اس کی پسند و ناپسند دونوں شدید ہیں۔ اس  
 کا حافظہ نہایت قوی اور محکم ہے مجھے کسی نے بتایا کہ اردو شاعری میں جو چیز  
 شورش کے حافظہ اور علم سے باہر ہے وہ قابلِ اعتنا ہی نہیں اس کے  
 آنے سے فضا میں چہل پہل اور چمک دمک پیدا ہو گئی۔

ایک دن روپیہ پسیہ کا ذکر ہو رہا تھا کہنے لگے انسان کو روپیہ پسیہ سے مطلقاً محبت  
 نہیں کرنی چاہیے بولوگ روپے کی پوجا کرتے ہیں وہ سوسائٹی کے لئے ناسور ہوتے ہیں اس  
 ضمن میں اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میری سالگرہ تھی والد کے دوستوں نے مجھے بہت سا روپیہ دیا  
 میں نے سو روپے کا ایک نوٹ اڑا لیا والد کو پتہ چلا تو مجھے بلا کر کان کھینچے پھر سو روپے کے اُس  
 نوٹ کا سگریٹ بنا کر چھونک ڈالا۔ فرمایا۔ بیٹا روپیہ کو اس سے زیادہ اہمیت کبھی  
 نہ دینا۔ اس سے بس اتنی ہی محبت کرنا جتنی اگر بیڑیرے سے کرتا ہے یوسف مہر علی کتوا سے تھے۔  
 میں نے شرارتاً دریافت کیا تو کہنے لگے والدین میور کرتے ہیں لیکن پارٹی کے کاموں ہی  
 سے فرصت نہیں۔ لڑکی کے والدین ایک لاکھ روپیہ نقد دے رہے ہیں۔ پارٹی  
 کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ بچے پر کاش مجبور کرتے ہیں کہ شادی کر لو اور جو لاکھ روپیہ مل رہا ہے

پارٹی کے حوالے کر دتا کہ پارٹی کی مالی حالت سدھر چکی۔

”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“

کتنے لگے جب پارٹی کو فنڈ کی ضرورت ہے تو بہ شادی کرنی ہی پڑے گی۔“

لیکن قضا انہیں اس سے پہلے ہی کھا گئی اور وہ جہاں بار ہو گئے۔ زندہ رہتے تو ملک کے چند بڑے لیڈروں میں سے ایک ہوتے۔

### کیونسٹ اور خاکسار

دن تیر کی طرح نکلتے جا رہے تھے کام دام کوئی تھا نہیں ایک تو جو لوگ یہاں تھے وہ اعلیٰ مرتبہ کے پولیٹیکل لیڈر یا اعلیٰ درجہ کے پولیٹیکل کارکن تھے ان میں کیونسٹ تھے سوشلسٹ تھے کانگریسی تھے ٹیرسٹ تھے۔ احرار میں تو صرف میں ہی تھا باقی سب رہا ہو چکے تھے ۱۹ مارچ کے حادثہ لاہور میں جو خاکسار پکڑے گئے اور اب عمر قید گزار رہے تھے وہ عام اخلاقی قیدیوں کے ساتھ سی کلاس میں رہ رہے تھے اور ٹہری حالت میں تھے۔ ان کے علاوہ بعض حادثاتی پولیٹیکل قیدی تھے مثلاً کچھ لوگ ہانگ کانگ سے گرفتار ہو کے آئے تھے ان میں ہوشیار پور کا ایک مسلمان چودہری عبدالستار بھی تھا ایک دو شخص ایسے بھی تھے جو سیاسی تھے لیکن کسی پارٹی کے ساتھ نہ تھے۔

ان مختلف گروپوں میں بھی پولیٹیکل قیدی ہونے کی حد تک تو لگاؤ تھا لیکن لاگ زیادہ تھی مثلاً کیونسٹ جنٹا کی جنگ ریمپلز وار، کانگرہ لگانے کی وجہ سے الگ تھلگ تھے۔ ہٹلر کے روس پر حملہ نے انہیں اتحادیوں کا ہمنوا کر دیا تھا۔ وہ جنگ میں غیر مشروط تعاون کر رہے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ اتنا دیوں کی فتح سے خوش ہوتے اور غوریوں کی فتح سے افسردہ،



فن کا اصل تصادم سوشلسٹوں سے تھا جو گھر کے بھیدی تھے اور ان سے کٹ کے الگ ہو گئے تھے۔  
 سوشلسٹوں کا خیال تھا کہ روس کے جنگ میں شامل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری  
 جنگ برطانیہ سے ہے روس سے نہیں۔ برطانیہ نے ہماری آزادی سلب کر رکھی ہے  
 اور یہی موقع ہے کہ انگریزوں کو آنکھیں دکھا کر ہم اپنی آزادی حاصل کر سکتے یا قریب لاسکتے  
 ہیں۔ سوشلسٹوں کا دعویٰ تھا کہ ہندوستانی کمیونسٹوں نے اپنے دماغ سے سوچنا چھوڑ دیا ہے جو ماسکو  
 کہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ انہیں ہدایات بھی بالواسطہ — آئی ہیں بلکہ ماسکو کی پارٹی لندن  
 کی پارٹی کو ہدایت کرتی ہے اور لندن کی پارٹی جس کے سیکرٹری ہیری پولٹا ہیں ہندوستان کی  
 پارٹی کو کنٹرول کرتی ہے سوشلسٹ جیل میں کمیونسٹوں کے مقابلہ میں زیادہ تھے اور یوں بھی  
 حسن اتفاق سے اُن کے بہترین دل و دماغ لاہور میں اکٹھے ہو گئے تھے ہر روز عورتوں کی فتح پر  
 گیت گھرے جاتے جنرل رومیل کو خصوصیت سے سراہا جاتا لیکن یہ جو کچھ بھی تھا کمیونسٹوں کو۔  
 چڑانے کے لیے تھا۔ کمیونسٹوں کے بارے میں سوشلسٹوں کا یہ عقیدہ رہا اور وہ انہیں  
 واقعات و نظریات کی روشنی میں بیان کرتے تھے کہ کمیونسٹ صرف وقتی تھکنڈوں پر یقین رکھتے  
 ہیں و کمیونزم کے سوا کسی کے وفادار نہیں افراد اُن کے نزدیک کوئی شے ہی نہیں وفاداری  
 صرف پارٹی کی ہے بھوٹ بولنا اُن کا آرٹ ہے اخلاقی قدریں ان کے نزدیک  
 اصنافی ہیں۔ اُن کے نزدیک کسی مقصد کا حصول ہی ذرائع کے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ کرتا  
 ہے۔ آدمی اپنے موقف کے لیے اخلاقی یا غیر اخلاقی جو بھیار چاہے استعمال کر سکتا ہے —  
 کمیونسٹ اپنا وار کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ طاقتور ہوں تو مہلک سے مہلک وار  
 کر جاتے ہیں کمزور ہوں تو گھات میں رہتے ہیں یہاں چونکہ کمزور تھے اس لیے کڑھتے  
 ضرور تھے مگر ہر وار سبہ جاتے البتہ کانگریسی لالائوں کو زچ کرنے میں سوشلسٹوں کے ہمنوا

تھے بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے! ان لوگوں کے نزدیک فرقہ واریت کا تصور ہی لغو تھا وہ اس خیال سے متفق تھے کہ کانگریس کی لالہ لیڈر شپ نے مسلمانوں کا سماجی اور معاشی مقابلہ کر کے قومی تحریک کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ لالوں پر طرح طرح کی پھبتیاں کتا ان کا روز مرہ تھا۔

تعصب سے یہ لوگ اتنے ہی دور تھے جتنا دشمنی سے تاریکی —

ایک روز میں احاطہ اول کی ساتویں بیرک کے پاس سے گذر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک ایسے نوجوان پر ٹھہر گئی جو کھلے میدان میں بیٹھا بان بٹ رہا تھا اس سے پیشتر کہ میں اُسے پہچانتا اُس نے مجھے پہچان لیا اور بڑی نیاز مندی سے سلام کیا۔

”تمہارا نام اکبر ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔ مجھے محمد اکبر کہتے ہیں“

محمد اکبر موچی دروازہ کاربنے والا اور خاکسار تھا۔ شریف، وجہیہ، نیک سیرت،

نیک نسل اور بااخلاق۔

”تم یہاں کیسے آئے ہو؟“

”خاکساروں کے قصاد میں“

”۱۹ مارچ کے قیدی ہو؟“

”جی ہاں“

”کتنی قید ہے؟“

”عمر قید“

”کتنے ساتھی ہو؟“

”سات“

”سب اکٹھے ہو“

”جی نہیں۔ اڑدی ملتی ہے۔“

”شقت کیا ہے؟“

”میں تو ہاں بٹتا ہوں۔ ایک ہسپتال کی ڈسپنری میں ہے۔ ایک منج کٹائی کرتا ہے۔

چار مچھاپے خانے میں ہیں۔“

اکبر خاکساروں کے تشکیل اور نوجوان سالاروں میں سے تھا عمر برو بالا بلندی نشی آنکھیں  
تیمکسی چتوئیں ستواں ناک سٹول جسم عمر کوئی ۲۲ برس لیکن اب اُس کی عمر کا نکھار اڑا جا رہا  
تھا قیاس بہ تھا کہ اُسے کوئی غم چاٹ رہا ہے۔

۳۱۳

تین سو تیرہ خاکساروں کا تاریخی حبیش جو ۱۹ مارچ کو کفن بدوش نکلا تھا وہ اسی  
حبیش میں تھا ہیرا منڈی کے چوک میں پولیس سے مل بھیر کے دوران ایک لرزہ خیز تصادم  
ہو گیا خاکساروں نے ڈٹ کے پولیس کو مارا بالخصوص انگریز انسروں کو نوک دم بھگکا دیا لاہور کے  
سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر کینسفرڈ کا چہرہ بگاڑ ڈالا ایک سارجنٹ مسٹر بیٹی کو موقع ہی پر  
چت کر دیا۔ ایک اور پولیس آفسیر سکروگی کے چہرے پر بلیچ کا ایک ایسا ٹھپہ لگا یا کہ  
وہ بدڑو ہو گیا۔ بیٹی اور سکروگی یہ دونوں اکبر کے ہاتھوں پٹے تھے اکبر نے بتایا کہ جب وہ بیٹی کو

عزیمدی کی بریک رات گزارنے کے لیے ہر روز بدلی جاتی اور اُسے گنتی بند کرتے وقت  
بتایا جاتا ہے کہ آج رات وہ کس بریک میں رہے گا اسی کا نام پنجاب کی جیلوں میں اڑدی لگتا ہے۔

ٹھیک کر کے نکلا تو اس وقت ایک حشر برپا تھا۔ اکبر نے پاس ہی تالی خیر لوہا والی انہی کے مکان کی یا ملامد سے  
 خاکسار بھی ادھر ادھر ٹھہنے لگے کوئی زہرہ مشتری کے چوبارہ میں چلا گیا کوئی جمیدی اور الٹی جان  
 کے کوٹھے پر لیکن پولیس زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ نمانیداروں، ہیڈ کانسٹیبلوں اور کانٹیبلوں  
 نے کنجروں کے کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کر خاکساروں کو کئی کئی منزلوں سے نیچے پھینکا کئی گرتے  
 ہی مر گئے ہو سکیاں بھر رہے تھے انہیں گولیوں سے بھون دیا اور چوکروں میں چھپ کے بچ  
 رہے تھے انہیں کنجروں نے پکڑوا کے مروادیا کنجروں نے بعض کو ٹھوں سے روپوش خاکساروں کو  
 خود گرا دیا غرض چاروں طرف رقصِ لہلہ کا تماشا تھا انگریز امسروں کے قطرہ ہاتے خون  
 کا بدلہ لیا جا رہا تھا۔

جب کنجربھی پولیس کے معاون ہو گئے اور انہوں نے انعامن یا رحم کا سوال ہی اٹھا دیا  
 تو بوڑھیوں اور کنجروں سے بچنے کے لیے اکبر عینی دروازہ سے نکل گیا قریب ہی بیڈ ٹھا بازار کے  
 نگر پیر ایک ہندو حلوانی کی دوکان نھی اُس کا تالا توڑ کر کڑا ہی کے نیچے چولہے میں چھپ گیا ایک  
 اور سا نھی یوسف بھی اُس کے ساتھ تھا دونوں کئی گھنٹے وہاں چھپے رہے دن بھر کرفیولگا رہا  
 آغاز شب میں ایک حوالدار ادھر سے گزرا لو اسے دوکان پر تالانہ دیکھ کر شبہ ہوا۔ اس نے چوہی  
 نختوں پر ڈنڈے مارے یوسف نے اندر سے دروازہ کھول دیا اور اس طرح یہ دونوں گرفتار  
 ہو گئے۔ ایک قیامت گزر چکی تھی لیکن اس کے باوجود بعض کوٹھوں سے تاناری ری کی آوازیں  
 آرہی تھیں اور معمول کے مطابق مجرا بھی ہو رہا تھا اکبر نے بتایا وہ سر جھکائے پولیس کے نزعہ  
 میں چلا جا رہا تھا لیکن ایک بازار ہی آواز اس کے ہنرمند تھی ۔

بیری رسوائی کے خونِ شہد اور پے ت

داسن یار خدا ڈھانپ لے پردا تیرا

ہر قتل اکبر کے گھمسنوں کے چھتا کے اس حسب حال آواز کو اور بھی غمزدگ کر رہے تھے۔  
 تھوڑی دیر پہلے پولیس اکبر کو قلعہ میں لے گئی اور یہ سب آوازیں اس طرح قاتب ہو گئیں جیسے  
 سرے سے موجود ہی نہ تھیں۔ قلعہ کی کہانی بیان کرتے وقت اکبر کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو  
 بہنے لگے یہ آنسو اس کے سرخ رخساروں کی زرد دیوار پر مٹی کے دیوں کی طرح جھلملا رہے  
 تھے۔ اُسے یا اُس کے ساتھیوں کو سیاسیات اور اُس کے ہیچ و خم کا قطعی اندازہ نہ  
 تھا وہ پائلیس کی مبادیات سے بھی نااہل تھے لیکن انہیں بالخصوص اکبر کو بہ لال ضرور تھا کہ قلعہ  
 میں اس کے ساتھ جو سلوک مسلمان پولیس افسروں نے کیا وہ حد درجہ ہیما نہ تھا کیا واقعی وہ مسلمان  
 تھے یا اکبر کا دشمن تھا؟ رہ رہ کے یہ سوال اس کے دل و دماغ کو کھاتا رہا اتنے سال گزر  
 جانے کے باوجود وہ اس صدمہ کو نہیں بھولا تھا اُس نے تشدد کے ایسے ہولناک  
 واقعات سنائے کہ خود خوف خدا تھرا رہا تھا۔

### پولیس کیل قیدی

میں نے اکبر کی پتاسٹن کر اُسے یقین دلایا کہ ہم خاکسار قیدیوں کے لیے انشاء اللہ کچھ نہ  
 کچھ ضرور کریں گے میں نے ساتھیوں سے ذکر کیا تو گاندھی بھگتوں نے جھک کر فرمایا کہ  
 خاکساروں کو وہ سرے سے پولیس کیل قیدی ہی نہیں مانتے ہیں کیونستوں کے لیڈر چٹت نشوری لال  
 نے میری ہمتوانی کی کہ خاکساروں کو ضرور مراعات ملنی چاہتیں وہ بہر حال پولیس کیل قیدی ہیں  
 لیکن خود وہ کوئی مطالبہ یا اقدام کرنے کے حق میں نہ تھے سوشلسٹوں میں پر دنیہ تک راج چڑھا  
 سردار سمن سنگھ مرگند پوری اور سردار کلبر سنگھ نے میری تائید کی اور آمادہ ہو گئے کہ اس  
 ضمن میں اگر خاکسار کوئی قدم اٹھائیں تو وہ عملاً اُن کے ساتھ دیں گے اس جیسے جیسے میں چار دن

گذر گئے جو دہری کرشن کو پالوت کئے لگے کہ خاکسار پولیٹیکل قیدی نہیں۔ انہیں زبردستی پولیٹیکل بنا نا غلط ہوگا میں نے ان سے دریافت کیا۔

”آپ کے نزدیک پولیٹیکل قیدی کی تعریف کیا ہے؟“

”جواب نو وہ کیا دیتے ادھر ادھر کی باتیں لے بیٹھے نقطہ نگاہ ان کا یہ تھا کہ یہ لوگ

تشد کے حائی امریت کے پیروکار اور ایک فرقہ دار جماعت کے رکن ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے انسان مارے ہیں۔

میں نے کہا اول تو یہ میرے سوال کا جواب نہیں آج ہر وہ شخص پولیٹیکل قیدی ہے

جو غیر ملکی غلامی کے خلاف کسی بھی تحریک یا تنظیم کی سیاسی جدوجہد کے باعث قید ہو گیا ہے جو شخص قوم و ملک کے لیے قید ہوتا ہے پولیٹیکل قیدی ہے رہا تشدد کا سوال تو یہ بڑا رسٹ۔

بھی تشدد کر کے قید ہوئے ہیں ان پر بھی قتل ڈاکہ اور دہشت کے الزامات تھے امریت کا سوال ہی عجیب ہے غور سے دیکھا جائے تو اس قسم کی امریت خود کانگریس ہائی کمانڈ

کی فکری سیادت میں ہے خود گاندھی جی اپنی شخصیت کے بارے میں کانگریس سے کامل اتباع چاہے ہیں رہا الزام کہ انسان مارے ہیں تو ۱۹۴۲ء کی کانگریس تحریک میں بھی انسان ہی مارے

گئے ہیں۔ اب رہا فرقہ دار جماعت کا سوال تو کسی جماعت کو صرف اس لیے فرقہ دار نہیں

کہا جاسکتا کہ کسی ایک مذہب کے پیروؤں کی اکثریت پر مشتمل ہے یا اس کے اعلیٰ اصولوں پر اہمان رکھتی ہے۔

میں نے اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی جب اچھوتوں

کو ہندو قوم کا جزو قرار دینے کے لیے برت رکھتے ہیں تو کیا وہ فرقہ دارانہ نہیں ہوتا؟ ۱۹۴۱ء میں

ہندو مہا سبھانے بھاگل پور میں اپنا سالانہ اجلاس کرنا چاہا اسی دن بقرعہ بدھتی حکومت نے

غلام کے غدرشہ کو محسوس کرتے ہوئے اجلاس بند کر دیا مہاجیما کے صدر سارو کر دفعہ ۴۴۲ توڑ کر گرفتار ہو گئے اور صرف ایک دن جیل میں رہے لیکن مہاجیما نے احتجاجی بیان دیتے ہوئے کہا کہ حکومت نے بھارت بھوشن سارو کر گرفتار کر کے شہری آزادی پر چوڑا لگاتی ہے کیا یہ ایک فرقہ وارانہ جماعت کی اعانت نہ تھی؟

دیوان جین لال بھی بہ بانیں من رہے تھے انہوں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا وہ سلوک جو سکندر حیات کی وزارت نے خاکساروں سے کیا ہے کوئی کانگریسی وزارت کرتی تو مسلمان غدر مچا دیتے سارا ملک ہل چکا ہوتا لیکن یہاں چونکہ وزیر اعظم مسلمان ہے لہذا مسلمانوں کی حالت یہ ہے جیسے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا پنت وزارت کا ذکر کرتے ہوئے دیوان صاحب نے کہا کہ اُس نے خاکساروں کے ساتھ سکندر وزارت کے سگدلانہ سلوک کا عشرِ شیر بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن مسلمان اخباروں اور مسلمان راہنماؤں نے ہنگامہ برپا کر دیا مگر اس غظیم تشدد پر وہی اخبار اور راہنما منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے کسی نے چوں نہیں کی ہم پر خاکساروں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟

میں نے دیوان صاحب سے کہا جس طرح آپ سوچ رہے ہیں اس طرح نہ سوچئے بلکہ اس طرح سوچئے کہ جو ظلم سکندر وزارت نے خاکساروں پر کیا ہے ہندوؤں یا سکھوں کی کسی جماعت پر کیا ہوتا تو آپ کیا کرتے؟ یوں چیپ رہتے؟ کانگریسی اپوزیشن سکندر وزارت کی معاون ہوتی؟ اور اپوزیشن لیڈر وزیر اعلیٰ کے گن گاتے؟

دیوان صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ میں خاکسار قیدیوں کو بہتر کلاس دیتے جانے کے حق میں ہوں لیکن ان کی اخلاقی یا سیاسی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ذمہ داری انکی اپنی تنظیم اسکی طاقت اور قیادت پر ہے۔

میری تجویز یہ تھی کہ خاکساروں کو بہتر کلاس دلوانے اور موجودہ سلوک بدلوانے کے لئے ہم بھوک ہڑتال کریں سرور کلپیر سنگھ بھوک ہڑتال ہی کی وجہ سے کئی عارضوں کا شکار تھے تاہم میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے خود بھی تیار ہو گئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے خاکسار بھوک ہڑتال کریں ہفتہ بعد ہم شامل ہو جائیں گے پھر جب تک انہیں پولیٹیکل قیدیوں کی مراعات نہ مل جائیں بھوک ہڑتال جاری رہے۔ مصیبت یہ تھی کہ خاکسار سیاسی ذہن بالکل نہ رکھتے تھے انہیں علامہ مشرقی یا ادارہ علیہ پر اعتماد تھا اور اسی کے حکم سے سوچتے تھے اپنی فوت فیصلہ تھی ہی نہیں ان لوگوں نے ادارہ علیہ سے استفسار کیا تو جواب آیا کہ اجازت نہیں دی جاسکتی تاہم ہماری پشت پناہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاکساروں کی مصیبت کا بڑا حصہ ٹل گیا۔ اور اس سے پہلے جو سلوک ان سے ہو رہا تھا اس میں کمی ہوتے لگی۔ میں نے سبید امیر شاہ (جلیہ) سے ذکر کیا تو آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے

۱۱) قوم ساٹھ ہولڈر شپ مضبوط ہو تو حکومت کے ہسرے کان بھی کھل جاتے ہیں۔

۱۲) عزت نفس مانگنے سے نہیں ملتی بلکہ اُس کی حفاظت خود کی جاتی ہے۔

۱۳) کانگریس طاقت ور ہے لیڈر مضبوط ہیں حکومت ان کے سامنے بھگتی ہے خاکسار جردل قوم کی ہاری ہوتی جماعت ہے۔

۱۴) ان نوجوانوں کو ٹنکست کے احساس نے بے حوصلہ کر دیا ہے اپنے حقوق بھی نہیں مانگ سکتے نہ حقوق کے لیے لڑنے کا حوصلہ ہے نہ اس طریق کار سے واقف ہیں۔

۱۵) مسلمانوں میں کوئی معاون نہیں نہ اُن کی آواز ہے جماعت مرچکی ہے عوام



بیگانہ میں ہندوؤں کو کیا پڑی ہے کہ ان کے لئے گوازا اٹھائیں۔  
 عزمن کنی مہینوں کی تنگ و دو کے بعد ان کے معاملہ میں یہ ہو گیا کہ  
 ۱۱، ان میں جو قیدی سخت مشقتیں کرتے تھے ان کی مشقتیں ہلکی ہو گئیں۔  
 ۱۲، ملاقاتوں میں رعایت ہونے لگی۔  
 ۱۳، آزادی کو روزانہ سے ہفتہ وار کر دیا گیا۔  
 ۱۴، اور انہیں بھی سیاسی قیدی تصور کیا جانے لگا۔

### مال کی میت

اکبر اپنی شادی کے مہینہ یا سوا مہینہ بعد جبل آ گیا تھا اس کو اپنی بیوی کی جوانی اور جدائی کا  
 شدید احساس تھا اچانک ماں پر مرض الموت نے حملہ کیا اور وہ جوان بیٹے کو ایک نظر دیکھ لینے کی  
 خواہش لے کر مر گئی کچھ لوگوں نے چاہا اکبر کو ایک دن کے لیے پیرول پر رہائی مل جاتے کیونکہ  
 انفرادی ستیہ گرو کے دوران پنجاب کے بہت سے کالگریسی فرضی اور حقیقی رشتہ داروں کی بیماری یا موت  
 کے عذر پر رہا ہوتے رہے تھے لیکن یہ ایک خاکسار کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوتی اکبر کے اعزہ جنازہ  
 لے کر سنٹرل جبل کے دروازہ پر پہنچے سید امیر شاہ نے خدا ترسی کی اور میت کو ڈپوڑھی میں رکھوا دیا  
 اکبر کو بلایا کہ ماں کا چہرہ دیکھ لے اکبر نے اشکبار چہرے کے ساتھ ماں کو آخری سلام کیا اور اٹھے پاؤں  
 پچھتائیں کھانا باک میں آ گیا۔ پھر دنوں تک آہوں میں مستغرق رہا لیکن بے بس تھا۔

### خاکساروں کی رہائی

مختہ پنجاب کی آخری وزارت میں لالہ مجیم سین سچر جبل خانوں کے وزیر تھے۔ میرے

ساتھ اُن کے مراسم نہایت غلصانہ تھے میں نے اُن سے کہا کہ خاکساروں کو چھوڑ دیں وہ فوراً  
 مان گئے لیکن رہائی اُنکی رہی میرا اصرار جاری رہا وہ یہی کہتے کہ میں آرڈر کر چکا ہوں تاخیر ہوتی گئی  
 میں نے زور دیا کہ اتنا عرصہ ہی کلاس کر دیں کہتے لگے کہ یہ آرڈر اس سے بھی پہلے کر چکا ہوں آخر  
 عقدہ کھلا کہ انسپکٹر جنرل پولیس بینٹ اور ہوم سیکریٹری میکڈانڈ نے کاغذات دہا رکھے ہیں  
 ملک تصرفات ملک سے باہر تھے وزارت ڈانواں ڈول ہو رہی تھی ہندوستان بھر میں  
 فسادات شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ سچ کوئی قدم اٹھاتے ملک تصرفات نے وزارت  
 سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک نیا دور شروع ہوا آخر پاکستان بن جانے کے بعد نواب  
 افتخار حسین ممدوٹ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خاکساروں کو رہا کر دیا نہ بینٹ رہا میکڈانڈ  
 خاکسار رو گئے اور رہا ہو گئے۔ اکبر رہائی کے بعد مجھے ملا تو اُس کا رنگ روپ اُڑ چکا تھا معلوم ہوا  
 میری رہائی کے بعد خاکسار ملتان سنٹرل جیل بھجوا دیئے گئے تھے جہاں انہوں نے کچھ  
 دنوں بھوک ہڑتال بھی کی جس سے اکبر کی صحت بل گئی رہائی کے دوسرے  
 سال اکبر نوجوانی ہی میں حرکت قلب بند ہونے سے رحلت کر گیا ماں نے یاد کیا اور وہ ماں  
 کے پہلو میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

### خیالات کی لہریں

۸ جیل کی راتیں اور جیل کے دن عجیب ہوتے ہیں نکل جاتیں تو سن سے لکل جاتیں  
 نہ لکس تو ریگ ریگ کر چلتے ہیں منگمری سنٹرل جیل کا عالم یہ تھا کہ ڈراؤنی راتیں اور بھیانک  
 دن تھے یوں کہتے کہ دن رات میں کوئی امتیاز نہ تھا محسوس ہوتا تھا کہ شب و روز عمر کو  
 چبا چبا کر کھا رہے ہیں۔ لاہور میں معاملہ اٹھ رہا یہاں ہم شب و روز کو چھانکتے اور ڈکارتے

چلے جا رہے تھے مائیں کبھی کبھی اُداس ہو جاتی تھیں لیکن دن وصل کے لمحوں کی طرح ڈال  
 صبرتے اُڑے چلے جا رہے تھے میرا حال عجیب تھا کبھی شاعر ہو کر غزل میں ٹوب جاتا کبھی  
 سیاستدان کی طرح سوچتا اور افکار کی چٹانوں سے ٹکراتا کبھی ایک ادیب کی طرح خیالات  
 کے تاتے بانے بناتا کبھی خطیب بن جاتا اور دیواروں سے مخاطب ہوتا۔

شاید کوئی پتھر مری اُداز سے گھیلے

مجھے معلوم تھا اور باقاعدہ اطلاعات آرہی تھیں کہ خورشید بیار ہے لیکن بے بس تھا  
 باہر کی دنیا اس تیزی سے بدل رہی تھی کہ اندر بیٹھ کر ہم اس کا اندازہ ہی نہ کر سکتے  
 تھے انسان فطرتاً تبدیلی چاہتا ہے ہم برسوں سے ایک ہی چار دیواری میں پڑے تھے  
 ایک سا ماحول چلا آ رہا تھا ہر پھر کر وہی صورتیں سامنے آتیں کبھی سب خوش ہوتا تو کبھی طبیعت  
 اُچاٹ ہو جاتی صرف خیالات تھے جو موسموں کی طرح پلٹا کھاتے تھے اُن کی آمد و رفت سے  
 گرمی و سردی اور بہار و خزاں کا لطف پیدا ہو جاتا لیکن یہ بھی احساس پر موقوف تھا  
 طبیعت شگفتہ ہو تو خزاں بھی بہار ہوتی ہے طبیعت بد مزہ ہو تو بہار بھی بہت جھڑنظر  
 آتی ہے قید اسی کا نام ہے کہ حسرتیں اُبھرتی رہیں اور امیدیں قتل ہوتی جاتیں جب کبھی شاعرانہ  
 فوق آنکھیں کھولتا تو دل و دماغ کا عالم ہی اور ہوتا وہ تمام رعنائیاں یاد آتیں جنہیں اوائل عمر  
 کی مشرے یادوں کے ساتھ دفن کر آیا تھا پہروں سوچتا کہ وہ دوست کہاں ہیں جن  
 کے ساتھ میرا بچپن گزرا لڑکپن جوان ہوا یہی سوچتے سوچتے سو جاتا اور سوتے سوتے  
 جاگ اُٹھتا میری طبیعت کئی طبیعتوں کا مجموعہ ہے اس میں بکے رگ بہت ٹھوڑے ہیں  
 بلکہ سرے سے ہیں ہی نہیں ہیں نے مگر بھر کوشش کی ہے کہ لوگ گیتوں کی طرح رہوں دوڑتا  
 نے کبھی بیت الغزل سمجھا کبھی لکیر بھول گئے یا پھر مصرع طرح سمجھا کہ مذاق کے مٹا

گرہ لگاتے ہے۔

اس گہا گہی کے باوجود جو اُس وقت سنٹرل جیل کی اس وارڈ میں تھی۔ میں ایسا ایکی تہا ہو جاتا اور اس تہناتی میں اپنے آپ کو اس طرح پاتا جیسے کسی شاعر کی فکرِ احاطہ نگارش سے نکل گئی ہو۔

### نوک جھونک

ایک روز صبح سویرے میرے پاس چودہری عبدالستار آئے اور کہنے لگے آپ ہمارے ساتھ ڈرائنگ روم میں کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ میں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں میری عادت ہے۔ کہنے لگے جی نہیں آپ ہمارے ساتھ کھایا کریں۔ آپ کے آٹے سے پہلے اکثر بوڑھے یا بڑے کانگریسی رہنا ہمیں حقیر سمجھتے تھے کوئی مسلمان بھی اُن کی نگاہ بن نہیں جیتا تھا پھر تین کا سا سلوک کرتے آپ کی وجہ سے فصاطیٹ گئی ہے اور ہم بھی قدرے دلیر ہو گئے ہیں البتہ ایک چیز بہت کھلتی ہے اور وہ ان لوگوں کا کھانے کی میز پر تبصرہ ہے یہ لوگ ہر لغز کے ساتھ مسلمانوں کی ہنک کرتے ہیں جس سے ہمارے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔

”کہتے کیا ہیں؟“

”ایسی باتیں کرتے ہیں جس سے مسلمانوں کے خلاف حقارت

پائی جاتی ہے۔“

”گالی دیتے ہیں؟“

”جی نہیں، ان کی باتوں سے قومی احساسات مجروح ہوتے ہیں“

”کوئی خاص بات؟“

”مثلاً قائد اعظم پر تبریٰ تولتے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایسی باتیں  
کہہ جاتے ہیں جن سے بہت دکھ ہوتا ہے۔“

”وہ کون لوگ ہیں ان کے نام کیا ہیں؟“

”چودھری کرشن گوپال دت اور ڈاکٹر سکھ پولال اور ان کے ساتھ چودو چار  
بورڈوائٹاپ کے کانگریسی ہیں۔“

”کون کون مسلمان آپ کے ساتھ کھانا کھاتا ہے؟“

”کھانا تو ہم سب اکٹھا کھاتے ہیں لیکن میری نشست آخر میں ہے قریب تو وہ  
پھٹکنے ہی نہیں دیتے“

”میں نے آپ سے یہ پوچھا ہے کہ اور کون مسلمان آپ کے ساتھ کھانا کھاتا ہے؟“

”مسلمان تو میں اکیلا ہی ہوں چونکہ طبیعت محسوس کرتی ہے اس لئے  
آپ سے کہتے آیا ہوں“

”اچھا کوئی بات نہیں آج شب کاکھانا آپ کے ساتھ ہو گا یا میں ڈار سے بھی  
کہہ دو بات میں ان سے خود کر لوں گا۔“

”کلبیر سنگھ وغیرہ کو بھی میں نے مطلع کر دیا۔ یا میں باوجود بیکہ  
کڑقم کا سوشلسٹ تھا یسٹن کرا سے تاؤا گیا کہنے لگا کوئی بات نہیں آج ہی سب  
تھیک ہو جاتے گا“

”جونہی رات کے کھانے پر ہم اکٹھے ہوئے لالاؤں کو استعجاب ہوا  
کرشن گوپال دت نے کہا“

”آج تو کچھ بانٹنا چاہیے آپ لوگ بھی پہلی دفعہ چلے آتے ہیں۔“

● سمجھتے تھے کوئی نئی بات ضرور ہے لیکن کسی نے کوئی ایسی بات نہ کی جو ہم لوگ گروہ ٹکاتے اگلے روز ٹیڑھ لولہ نے ڈاکٹر گوپی چند بھار گولالہ دلش بندھو گپتا (ایڈیٹر تیج) ہما شہ ویر مندر اور اس گروہ کے دوسرے افراد کی دعوت کر رکھی تھی کھانے کی میز پر بیٹھے تو قائد اعظم کے ایک بیان پر جو اسی دن نکلا تھا تبصرہ ہونے لگا کرشن گوپال دت نے نبریٰ کیا دلش بندھو نے تقریباً میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا چودہری جی اصحاٹ کیجئے جو الفاظ آپ نے کہے ہیں وہ عزیز شریفانہ ہیں اس کھلی گالی کا مطلب ہے کہ آپ عاجز ہو چکے ہیں“

چودہری صاحب نے بھڑک کر کہا ”آپ کو جناح سے کیا ہے“

اس سے پہلے کہ چودہری صاحب اپنا فقرہ مکمل کرتے ہیں نے ان کی بات کاٹ دی تھی ! آپ ٹھیک کہتے ہیں میں جناح کا پیرو نہیں لیکن آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی عظیم ترین اشریت کے لیڈر ہیں ہم بطور مسلمان ان کی ہتک نہیں سن سکتے یا میں نے فوراً ہی میسر می تائید کی کلبیر سنگھ اور ملک راج نے بھی صا د کیا کہ اس قسم کے کلمات سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی طرح ایک دن مولانا ابوالکلام کا ذکر آگیا چودہری صاحب نے ملاحظیاں شروع کیں یا میں نے جواب آں غزل چھیڑا ڈاکٹر گوپی چند بھی مولانا کے سخت خلاف تھے کچھ کہتا چاہا میں نے روک دیا۔ دہلی اور پنجاب کے اکثر کانگریسی سجا شس چند بوس کی ریس میں مولانا کو ازراہ تحقیر مغل اعظم کہتے ہم بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے بعض اوقات سخت سست کلمات بھی نکل جاتے ایک دن میاں انخار الدین پر تبصرہ ہونے لگا پتہ نہیں کسی نے کیا کہا لیکن جو کچھ کہا ناروا تھا۔ ہم نے روکنا چاہا تو سکھ یولال نے کہا ”مسلمان لیگی ہو یا کانگریسی پھیلو تو اندر سے مسلمان ہی نکلتا ہے۔“

ڈاکٹر سکھ پال سوامی شرودھانند کے داماد تھے مجھے ہندی پڑھایا کرتے اور میں ان کا ادب کرتا تھا لیکن اب کے میں بھی ضبط نہ کر سکا اب دیا تو بگڑے ہندی پڑھانا موقوف کر دی ماضی کے ہندو مسلم فسادات پر گفتگو چل رہی تھی یا میں نے کہا تالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے تحریک خلافت کے گمشدہ اتحاد کا سبب بیان کرتے ہوتے میں نے کہہ دیا کہ اس فساد کے بانی سوامی شرودھانند تھے بس طوفان اگیا ڈاکٹر سکھ پال لال اک بگولا ہو گئے دلش بندھو گیتا کو تو چین نہ پڑتا تھا کہ میں نے کیا بک دیا ہے غرض اس قسم کی رُپر لطف بھڑپوں سے ہم نے ان کی بے قابو زبانیں بند کر دیں جو ہمیشہ مسلمانوں ہی کے افراد و حالات پر گفتگوشانی گفتار کی مرتکب ہوتیں اور اُس کو نیشنلزم کا حصہ گردانتی تھیں۔ ان بوڑھے دلش بھگتوں کے دماغ میں یہ بات بسی ہوئی تھی کہ مسلمان اچھوت ہیں سیاسی طور پر ہمیں ہیچ خیال کرتے ان کا خیال تھا کہ سیاست میں وہ بہت آگے ہیں یہ بات حقیقتاً درست تھی مگر بہادری کا فتنہ اپنے ہی سینہ پر لگانا اصولاً اور واقعہً غلط تھا جو مسلمان ان کی جماعت سے باہر رہ کر غیر ملکی حکومت سے لڑ رہے تھے وہ زیادہ بہادر تھے ان کی بد نصیبی یہ تھی کہ اپنی قوم ہمدرد نہ تھی ہمایہ قوم دل سرد تھی اور حکمران بیدرد تھے۔

### رگھونندن سرن

قائد اعظم کے سلسلہ میں ہم نے چودھری کرشن گوہالی دت اور لالہ دلش بندھو گیتا کو ٹوکا تو کہیں سے اس کی بھیک لالہ رگھونندن سرن کے کان میں پڑ گئی مجھے بلا بھیجا اور کہا تم نے ٹھیک کیا یہ دونوں اسی سلوک کے مستحق تھے۔ گیتا کے متعلق کہا کہ اس کی وجہ سے دہلی کی فرقہ وارانہ فضا کبھی صاف نہیں ہوئی اس ذہنیت ہی نے جناح جیسے انمول ہیرے کو

کانگریس سے بدظن کر دیا کانگریس سے بدظن ہونا تو خیر کوئی بات نہ تھی — ہندو مسلم اتحاد ہی کو ناممکن بنا دیا ہے۔

دھونندن دہلی کے روسا میں سے تھے لاکھوں روپے کے مالک بلکہ کر درپتی رائے زادہ ہنسراج کے داماد دھان پان لب ولجہ کے اعتبار سے بے زبان غیبت کرتے نہ سنتے شرافت ان کا طبی حسن سخا ان کی باتیں بڑی مٹھی ہوتیں تصنع اور ریا سے نفور نام و نمود سے کوسوں دور موٹروں کے بہت بڑے تاجر کئی شہروں میں ان کی دوکانیں تھیں تقریباً سبھی ریاستوں کے راجے مہاراجے ان سے کاریں خریدتے گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی وہی موٹریں سپلائی کرتے جب کبھی وائسرائے یا دہلی کے اعلیٰ حکام کو مہمانوں کے لیے نفسیں کاروں کی ضرورت ہوتی ان کے ہاں سے موٹریں منگانی جاتیں طبیعت میں بے نیازی تھی۔

کئی وائسرائے ان کے ذاتی دوست رہے۔ گاندھی جی انہیں انتہائی عزیز رکھتے انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ قائد اعظم ان کے گہرے دوست ہیں دہلی آتے تو ان سے ضرور ملتے ہیں وہ قائد اعظم کی بے حد تعریف کرتے اور کہتے تھے کہ انہیں متحدہ ہندوستان سے جو اختلاف ہے وہ ہندوؤں کی اجتماعی روش کا رد عمل ہے قائد اعظم سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوتے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے ہماننا جی کی خواہش پر ان سے کہا کہ کانگریس سے صلح کیوں نہیں کر لیتے؟ جب اختلاف کا آخری حل بھی یہی ہے قائد اعظم نے ہنس کر فرمایا رگھونندن! مسلمان من حیث الجماعت سیاست و معیشت کے میدان میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں جب تک ان کی ملی انفرادیت تعصبات کی حد تک بچتہ نہیں ہو جاتی اس وقت تک کوئی سمجھوتہ مشکل ہے اب اگر کوئی مفاہمت ہو جائے تو اس میں مسلمانوں کا قطعی خسارہ ہے فی الحال اس سمجھوتہ کو ٹالتے رہنا ہی مفید ہے اس میں پیچھوتہ کر لوں تو اس کا مطلب ہو گا مسلمانوں



کاہنتوں میں اہ نام —

”سرن جی نے بتایا کہ قائد اعظم کی طبیعت پر ہندو لیڈر شپ کے طرز عمل کا تجرباتی رد عمل یہ تھا کہ وہ اس پر اعتماد ہی نہ کرتے تھے مجھ سے اکثر کہا کرتے کہ کانگریس مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں چاہتی وہ سمجھوتے کی بات چیت کو ٹالنے کے لیے سمجھوتے کا نام لیتی ہے آخر کانگریس خود کیوں نہیں بولتی کہ وہ مسلمانوں کو دینا کیا چاہتی ہے؟ سرن جی کو اس وقت بھی یقین تھا کہ ملک تقسیم ہو گا کیونکہ ہندو آخر وقت تک کچھ نہیں دیں گے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ پاکستان بن کے رہے گا۔“

سرن جی امیروں کی طرح بیمار ہی رہتے بیماری کا آخر وقت تک پتہ نہ چلا کیا ہے؟ اپنے خراج پر مالش کرانے کا انتظام کر رکھا تھا ہر روز مال روڈ کے کسی حجام کی درکان سے اب مالش آتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ مالش کر کے بلاناغہ پندرہ روپے لے جاتا دو ماہ تک مالش ہوتی رہی ایک دن مجھ سے تخلیہ میں کہنے لگے میں ان نیشنلسٹ مسلمانوں کی مالی امداد کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت قید میں ہیں ایک فہرست تیار کرو اور جو ماہانہ چاہو ہر نام کے ساتھ لکھ دو۔ ماہ بہ ماہ ان کے گھروں میں پہنچتا رہے گا میں نے عرض کیا مجھے ایسے لوگوں کا کچھ علم نہیں۔ مولانا داؤد غزنوی سے کہتے وہ شاید آپ کو السی فہرست دے سکیں وہ مقرر رہے کہ یہ فہرست میں ہی تیار کروں میں ٹال کے چلا آیا اور اگر پر بودھ سے گلہ نہا کر کیا کہ سرن جی غالباً مجھ اپنی امداد کے لیے منتخب کرنا چاہتے ہیں انہیں شاید میری عزتِ نفس کا احساس نہیں یا ان کے نزدیک غریب میں عزتِ نفس ہوتی ہی نہیں پر بودھ جی نے مجھے یقین دلایا کہ سرن جی بہت بلند آدمی ہیں وہ اس طرز کی سوچ کے عادی نہیں انہیں تم سے اخلاص ہے تمہارے مصائب سن کر ان کے دل میں تمہاری عزت ہو گئی ہے ہمیشہ تو رعیت

کرتے اور خوش ہوتے ہیں پر بوجہ جی نے اُن سے ذکر کیا تو فوراً میرے پاس چلے آئے  
 اس ضمن و خوبی سے میرے خیال کی تردید کی جیسے کہہ رہے ہوں۔ ع  
 یہ وہم کہیں تم کو گنہگار نہ کر دے  
 انہیں مجھ پر بے حد اعتماد تھا وہ یہ جانتے تھے کہ میں کسی شخص یا ساتھی سے کوئی  
 تحفہ وصول نہیں کرتا اور نہ کسی خواہش پر مرتا ہوں بلکہ اپنے ہی خیالات میں عموماً اور  
 لگن رہتا ہوں۔

### حلال اور حرام کا

جیل میں ہم سب کا کھانا اکٹھا پکتا اور ذبیحہ آتا تھا ایک دن بیٹھے بٹھائے  
 سردار گوپال سنگھ قومی کو مترات سو بھی یا جانے کیا خیال آیا کہ بعض سکھ دوستوں کو  
 اپنے ساتھ ملا کر چھٹکا کا مطالبہ کر دیا گوپال سنگھ قومی صوبہ کانگرس کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت  
 سے قید ہوتے تھے آدمی خوش مزاج اور خوش گفتار تھے لیکن یکایک ہی اس مطالبے  
 سے انہوں نے ہم سب کو حیرت میں ڈال دیا میں نے اُن سے کہا اس سے فائدہ؟  
 کہنے لگے — ہمارا مذہب ہی حق ہے

”لیکن یہاں تو لنگر اکٹھا ہے اور سب کا کھانا ایک ہی دیگ میں پکتا ہے“

دماغ نے کہنے لگے چولہا الگ کر لیجئے جب ہم حلال کھا لیتے ہیں تو آپ چھٹکا کبوں  
 نہیں کھاتے؟ سیفی کا شمیرتی بھی تو کھاتا ہی رہا ہے۔

میں نے قومی صاحب کی بات کو پہلے تو مذاق سمجھا لیکن جب وہ سختی سے مطالبہ کرنے  
 لگے تو میں نے صاف کہہ دیا کہ یہاں نہیں پک سکنا اکثر ٹریسٹ اور سوشلسٹ بلکہ کانگریسی

بھی میرے ہوا تھے۔ میجر حبیب اللہ شاہ نے لکھا کیا منہ کہا کہ میں جھٹکا نہیں دے سکتا اب تہ  
آپ کا مطالبہ گورنمنٹ کو بھیج سکتا ہوں ڈاکٹر گوپی چند سے ذکر آیا تو طرح دے گئے۔  
کہنے لگے ہم تو ماس کھانے ہی کے خلاف ہیں اگر ذبیحہ آتا ہے تو جھٹکا آنے میں کیا سرج  
ہے؟ جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ پھلجھڑیاں چھوڑنے میں لطف محسوس کرتے ہیں اور انہیں  
مسلمانوں کی ہر چیز سے نفرت ہے بلکہ عمداً ان باتوں کو اختیار کرتے ہیں جن سے مسلمانوں  
کے جذبات کو صدمہ پہنچے یا ان کی عزت نفس زخمی ہو تو میں نے ہر اتما گاندھی کے نام ہرنٹنڈنٹ  
جیل کی معرفت ایک خط لکھا جس میں اس شخصانہ کا ذکر کیا میں نے یہ بھی لکھا کہ صوبہ کانگریس  
کے یہ بیٹا ہمارے موجودگی میں مولانا ابوالکلام آزاد کو گالیاں دیتے اور نثر ناک باتیں کرتے  
ہیں آخر میں لکھا کہ یہ سب کچھ وہ لوگ کر رہے ہیں جو آپ کے بھگت کو ملاتے ہیں اور جنہوں  
نے سنہ ۱۹۱۷ء وادھی ہونے کا روپ دھار رکھا ہے سپرنٹنڈنٹ نے یہ خط پڑھ کر ڈاکٹر جھاڑو  
کو بلوایا کہ وہ بھی پڑھ لیں ان کا رنگ فق ہو گیا۔ گویا سنگھ قومی اپنی ضد پر ڈٹے رہے۔ میں  
خط بھجوانے پر مہر تھا سکھ دستوں نے اپنے وقار کا سوال بنا لیا اگلے ہی دن سرمنوہر لال ایچک  
آگئے ہیں نے ان سے کہہ دیا کہ ان لوگوں کو یہاں جھٹکا منگانے کی اجازت دی گئی تو اس کا  
مطلب ہو گا کہ ہم لوگ ان سے الگ ہو جائیں اور غالباً یہ لوگ بھی جانتے ہیں اگر انہیں  
قید میں ہمارے جذبات کا پاس نہیں تو باہر ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ اگر بے سہارا  
مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمیں الگ کیا گیا تو ہم اس مشیڈیم کے خلاف بھوک ہڑتال کر دیں  
گے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ متحدہ قومیت کے دیوتا کس ذہنیت کے ہیں؟ سرمنوہر لال یہ  
سن سنا کر واپس چلے گئے شام کو ان کی طرف سے حکم آ گیا کہ جو لوگ جھٹکا کھانا چاہیں  
ان کے لیے بورسٹل جیل کا نیا حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے چنانچہ گویا سنگھ قومی اور ان کے

ساتھی جھکے لے شوق میں بوسٹل جین چسے گئے۔

### اذان

چودھری عبدالستار پاسبوم و صلواتہ انسان تھے ہر روز صبح سویرے کلام پاک کی تلاوت کرنے ایک دن کسی سکھ بائبرسٹ، قیدی کے منہ سے نکل گیا کہ سویرے ہی سویرے کالوں میں قرآن پھونسنے جو ہم نے احتجاج کیا اور تمام ساتھیوں سے کہہ دیا کہ اس قسم کے کلمات برداشت نہیں کئے جا سکتے میوٹا مثدل کے دنوں میں پو پھٹتے ہی اوم اوم شروع ہو جاتا اور دباؤ نے اسٹوک پڑھے جاتے تھے سکھ ہر روز پوجا پاٹھ کرتے اور اکٹھے ہو کر سن سمری اہل بکار نے ہیں اپنے اپنے عقیدے اور دھرم کا معاملہ ہے عبد بونی اعتراسن نہیں تو آب کو اداں پر کیا اعتراض ہے میں نے اور چودھری عبدالستار نے ملے کہا کہ ہر صبح اذان دیکھنا ٹیڑھا کر سب اذان دی تو دلش بھگتوں کو حیرانی ہوئی، سرگوشیاں ہونے لگیں ایک نے کہا یہ اذان بھی خوب رہی دوسرے نے کہا یہاں مسجد تھوڑی ہے دوسرے نے کہا انہیں کیسے کہا جاتے چوتھے نے کہا آب و ہوا فرقہ دارانہ ہو گئی ہے آج تک ایسا نہیں ہوا تھا ہمارا اور ڈان چیزوں سے پاک تھا غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک دوست درمیان میں آگیا میں نے اس سے کہا جو لوگ ہماری اذان سرائت نہیں کرتے جس میں صرف اللہ کی بڑائی کا اقرار و اعلان ہے وہ ہمیں بطور مسلمان کیونکر برداشت کریں گے پھر یہاں جیل میں ان کے اندرونی جذبات کا بہ حال ہے آزاد ہندوستان میں ان کا حال کیا ہوگا آخر متحدہ قومیت کا مطلب کیا ہے، خود سپردگی! ان لوگوں! اجارت ہے کہ تو دینے دھرم کے مطابق جو چاہیں کریں اپنے ننوار منائیں اپنے

دشمنوں اور مبینوں کا چرچا کریں وید کے اشلوک پڑھیں گیتا کا باب کریں رامائن پڑھیں  
 سیاہی سے لے کر مہارانا پرتاپ تک کی تختین کریں اور ان کے یوم مناسبتیں لیکن ہم  
 نماز پڑھیں اذان دیں اور قرآن کی تلاوت کریں تو انہیں فرقہ واریت کی بُو آنے لگتی ہے  
 کیا فرقہ واریت کا مطلب مسلمان قرآن اور اذان ہے اگر انہیں ہمارا وجہ دگوارا نہیں تو  
 بے شک ہمیں احاطہ سے الگ کر دیں کیونکہ انہیں یہاں فوقیت حاصل ہے اب تو یہ  
 لوگ اکثر بیت میں ہیں دوسرے بہتر کلاس میں تیرے جیل خانوں کے وزیر سر منبر لال اور انپکڑ  
 جنرل کرنل پوری انہی کے ہیں ہم لوگ نہ نو حکومت کی نگاہ میں ذی حیثیت ہیں نہ ہمیں اپنی  
 قوم پسند کرتی ہے ان بانوں سے بہ لوگ قدرے ٹھٹک گئے یوں ہی ان میں کوئی منفی قدم  
 اٹھانے کا حوصلہ نہ تھا۔

میں گاندھی بھگتوں کی اس کھیپ پر عموماً طعن و تعریض کیا کرتا اور وہ چپ ہو  
 رہتے غرض اس طرح ہم نے اذان دینے اور قرآن پڑھتے کا حق محفوظ کر لیا پھر کسی  
 کو جرات نہ ہوئی کہ جڑ بڑھتا۔ مابخر نما سلامت

یہ ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ ان جھیلوں کو عموماً کانگریسیوں کا وہ گروہ پیدا کرتا جو کالی  
 دل کے ساتھ تھا اور سردار پٹیل کا پرچہ نیشلسٹان بھگتوں سے در بگہ نفور تھے اور کینسٹوں یا سوسٹوں  
 کے لئے تو یہ سب چیزیں اصنافی تھیں تاہم یہ لوگ سماجی طور پر بندوبست نہ ہو سکتے تھے اپنے ہتواروں سے انہیں اتنا  
 ہی لگاؤ یا لاش تھا جتنا کہ ایک مذہبی آدمی کو ہوتا ہے۔

### حبیب اللہ شاہ اور بیڈرسن

ایک دن میجر حبیب اللہ شاہ نے مجھے یاد کیا ان کے دفتر میں گیا تو ہوم سکریٹری کا

ایک خط دکھایا جس میں سردار گوپال سنگھ قومی سے جھٹکے کے تنازعہ کا ذکر تھا اور اس امر کی بدایت کی گئی تھی کہ اذان دینے سے ٹیرسٹ وارڈ کے قیدیوں میں جو بد مزگی پیدا ہوتی ہے اس پر قابو پایا جائے انگریزی میں دوغلی زبان ہے ایک ہی لفظ کے کئی مفہوم ہوتے ہیں میں نے اور میجر حبیب اللہ شاہ نے اس خط سے جو مطلب اخذ کیا یہ تھا کہ اذان دینے کی حوصلہ شکنی کے بارے میں یہ معاملہ یہ خط داخل دفتر ہو گیا میجر حبیب اللہ شاہ نے بھی کوئی توجیہ نہ دی، نہ ہم نے غور کیا لاہور کا ڈپٹی کمشنر ہنڈرسن تھا اس نے ایک دن اس سوال پر کوئی تاؤ وار بات کہی میر صاحب کو غصہ آ گیا ہنڈرسن کو فوراً ٹوکا۔

”آپ اذان یا قرآن کے بارے میں محتاط رہیں و میں نہیں روک سکتا“

میر صاحب ہنڈرسن سے اُلجھ پڑے ایک دفعہ پہلے بھی ہنڈرسن نے حضور کا نام بے ادبی سے لیا تو اس سے اُلجھے تھے۔ تمام جیل میں اُن کی اس حیثیت کا پھر چاہتا ایک دن ہتہ چلا کہ ہنڈرسن سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہمراہ بٹرسٹ وارڈ کا معائنہ کرنے آ رہا ہے سکھ پہلے ہی ناراض تھے کہ سردار سمبھورن سنگھ کو ایک آنہ جو مانہ کر کے اُس نے ذلیل کیا تھا کمبونسٹوں کے دل میں اس کی عزت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا سوشلسٹوں میں کلبر سنگھ وغیرہ ملتان میں رہ کر اس کی سختیوں کا مزہ چکھ چکے تھے میرے ساتھ ملتان میں گرفتاری کے موقع پر جو سلوک ہوا تو ہنڈرسن ہی ڈپٹی کمشنر تھا۔ میں اُس سے ویسے ہی متنفر تھا یوں بھی ہنڈرسن فطرتاً ایک گورہ ہی تھا ہم سب نے صلاح کی کہ اس کی ہتک کرنی چاہیے۔ گاندھی وادوں کو تو ہم نے الگ کر دیا کہ وہ بڑھی خانہ چلے جائیں خود ہم نے یہ طے کیا کہ اسے کوئی رسب نہ دیں سپرنٹنڈنٹ یا کوئی بڑا آفیسر جیل میں آتا تو ہم تعظیماً اپنی اپنی کوٹھری کے اُگے کھڑے ہو جاتے وہ پوچھتا کچھو اتا چلا جاتا ہنڈرسن کے معاملہ میں

جم نے رکھا کہ اپنی کوٹھڑی کے برآمدے میں کرسیاں بچھائیں اور ٹیوٹر کر کے بیٹھ گئے ہینڈرسن نے اس طرح دیکھا تو جمل بھٹن کر لوٹ گیا۔ وزیر بک میں ہمارے خلاف بہت کچھ لکھا حتیٰ کہ جیل کے حکام پر بھی نکتہ چینی کی کہ سیاسی قیدیوں کو اتنی مراعات دے رکھی ہیں کہ نہ انہیں قید کا احساس ہے نہ نظم و نسق کی پروا کرتے ہیں سچر جلیب الٹا کا بیان تھا کہ میں نے سرکار کو جو تصدیقی رپورٹ بھیجی ہے اس میں صاف لکھ دیا ہے کہ جو لوگ ٹیرسٹ وارڈ میں ہیں ان کو حکومت نے خطرناک قیدی قرار دے رکھا ہے بعض کے متعلق یہ ایسا موجود ہیں کہ ہندوستان محوری طاقتوں کی زد میں آتا ہوتا انہیں گولی سے اڑا دیا جائے۔ ایسے قیدیوں کے ساتھ نباہ کرنا اور انہیں قید میں رکھنا سہل نہیں سٹر ہینڈرسن ایسے قیدیوں سے تعظیم یا متابعت کا مطالبہ نہیں کر سکتے یہ لوگ قانون شکنی کی بدولت بلکہ سرکاری اندیشہ کی بناء پر اندر آتے ہیں انہیں اندر قانون نہیں سکھایا جا سکتا انہیں قانون کے تحت قید ہی رکھا جا سکتا ہے۔

— ہینڈرسن کو اس کے بعد دوبارہ آتے کا حوصلہ نہ ہوا۔

### سکندر حیات کا انتقال

ٹیرسٹ وارڈ کے انچارج اسٹنٹ جیلر لالہ پیرس رام سادہ دل اور شریف انسان تھے ہر وقت ہنستے اور مسکراتے میں تے اُن کے ماتھے پر کبھی ترشی یا تلخی نہ دیکھی ہم سے تو خیر کیا ترشی کرتے اخلاقی قیدیوں کے حق میں بھی مہربان تھے ایک دن علی الصبح دوڑے دوڑے آتے اور کہنے لگے —

”سکندر حیات کا انتقال ہو گیا ہے گزشتہ رات اپنی ایک بیٹی اور دو بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہو کر آرام کے لیے بیڈروم میں گئے تھے کہ حرکت قلب بند ہو گئی

گھنٹہ پہلے جس شامیائے میں براتی بیٹھے تھے اب وہاں ماتمی بیٹھے ہیں۔“

موت کے دروازہ پر بھی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں میرا اجماعہ پن تھا کہ میں نے اُن کی موت پر خوشی محسوس کی میرے ماتے اُس وقت کچھ ذہنی تصویریں تھیں۔

مثلاً اُن کا اسرار کو تختہ ستم بنانا میرے معاملہ میں سنگین ہو جاتا۔ خاکساروں کا پٹنا اور پٹوانا اس کے علاوہ برطانیہ کے یار وفادار تھے اور اس کی خاطر مسلمان مملکتوں سے لڑے تھے اُن کی موت سے واقعی برطانیہ کا ایک اہم ستون ٹوٹ گیا لیکن اُن کی موت سے پنجاب کو بھی نقصان پہنچا کانگریسوں کو اُن کی موت کا بہت قلق ہوا گوپی چند بھارگو دن بھر ملول رہے کافی دیر تک ان کی خبروں کا تذکرہ کیا ان کا خیال تھا کہ وہ ایک معتدل مزاج اور صاحب دل انسان تھے مرفضل مرحوم کی طرح انہوں نے بھی انگریزوں پر اپنی قابلیت کا سکھ بٹھا لیا تھا وہ انگریزوں کا اثر قبول ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر اپنا اثر بھی ڈالتے تھے میں نے جیل سے انہیں وہ خط لکھے اور دونوں سپرنٹنڈنٹ کی معرفت بھجوائے تھے میں خیال ہے کہ وہ خط اُن تک نہیں پہنچے جیل کے حکام نے رکھ لیے یا سی آئی ڈی عادیٹا ہضم کر گئی۔

تاہم میں نے یہ خط برینگ بھجوادیتے جن میں سے ایک خط رہائی کے بعد منہ و ارادا کار میں چھپوایا پہلا خط اُس وقت لکھا جب انکے نامور فرزند سردار شوکت حیات اٹلی کے ہتھے چڑھ کر قید ہو گئے سکندر اس وقت سخت غمگین تھے میں نے انہیں لکھا کہ بیٹے کی قید سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جن والدین کے بچے آپ نے استعمار کی خاطر قید کر رکھے ہیں ان کے دل پر اولاد کی حسد اتنی سے کیا گزر رہی ہوگی دوسرا خط اُن کی صاحبزادی کو لکھا انہوں نے بیوم اقبال پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا مسلمان عورت کو اقبال کا پیغام یہ ہے کہ فاطمۃ الزہرا کا اتباع کریں جو سیدالہدیٰ کی ماں ہیں یہ غالباً حضرت علامہ





بلاوجہ تامل کیا گیا پولیس نے اپنے طور پر ہتھیں گرفتار کیا یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مقدمہ میں شہادت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

مہارمی بی کلاس کے سیٹے میں نے کئی دفعہ سکندر حیات سے کہا وہ پہلے تو ماتے نہیں جبروں ہاں کرتے رہے۔ بیچ بہ تھا کہ سی آئی ڈی کے حکام مانع تھے حتیٰ کہ مہار سے لاہور لانے کے لئے دعوت تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے احرار سے اپنے تعلقات کی کتیدگی کے وجوہ بھی بیان کئے ڈاکٹر ستیہ پال کا ذکر ہونار پا جو فوج میں بھرتی ہو کر نیلے گئے تھے ڈاکٹر صاحب نے کہا میں سردار صاحب کو کیا کہتا ہوں وہ احرار کو اور احرار انہیں ختم کرنے کے درپے تھے میں نے ڈاکٹر صاحب کی باتوں پر کچھ کہتا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ایک تو بہ محل نہ تھا دوسرے گزشتہ آنجہ گزشتہ۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جو وہ ہسپتال مسلمانوں کو کبھی حسن ظن نہیں رہا صرف ڈاکٹر سیف الدین کچلو ان کے ساتھ رہے یا انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیا پنجاب میں ڈاکٹر کچلو جب کبھی صوبہ کانگریس کے صدر منتخب ہوتے تو انہی کی مدد سے احرار میں مولانا حبیب الرحمن بھی ان کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی بعض باتیں درست ہیں مثلاً وہ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کے نزدیک ہیں نو— وہ ظاہر ہے کہ ہندوان کے نزدیک ہیں بھر جب ان کی پارٹی کانگریس کو روپیہ دیتی اور اسکی اکثریت ہے تو کانگریس پر اسی کا قبضہ ہوگا۔

وہ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے کے نائب اور گاندھی جی کے اتنے ہی بھگت تھے جتنے پٹیل، وہ پٹیل کی طرح مضبوط تھے لیکن پٹیل کا عکس ضرور تھے وہ مسلمانوں کے لیے اچھے دل میں کوئی جگہ نہ رکھتے تھے انہوں نے صوبہ کانگریس کو اپنی داشتہ بنا کر رکھا۔

جس کانگریسی نے صوبہ میں اُن سے ٹکرائی تکت کھا گیا وہ فی الحقیقت ایک شاطر انسان تھے انہوں نے ڈاکٹر ستیہ پال جیے آزموہ کار اور جبری انسان کو کانگریس سے بھاگ جاتے پر مجبور کر دیا اور وہ فوج میں مقرر ہو کر چلے گئے جو شخص اُن کی مرضی کے خلاف صوبہ کا صدر منتخب ہوتا یا منتخب ہونے کے بعد ان کے ساتھ نہ چلتا زچ ہو کر نکل جاتا یا اُسے نکلنا پڑتا میاں افتخار الدین کو انہوں نے بھگا دیا گو اس میں میاں صاحب کی سببانی طبیعت کو بھی دخل تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُنہیں بدول کرنے میں برابر کا حصہ لیا مولانا داؤد غزنوی کی صدارت کو انہوں نے اپنے لئے چیلنج سمجھا لیکن جب مولانا لنگ میں شامل ہو گئے تو اسے اپنی فتح گردا، چونکہ ڈاکٹر سبغ الدین کچلو و مولانا ابوالکلام سے پر خاشش تھی اس لئے وہ انہیں فریب رکھنے یا ان کے قریب رہتے تھے مولانا آزاد کے دل دجان سے مخالف تھے مولانا بھی ایسے لوگوں کو معاف نہ کرتے مولانا نے جب چاہا انہیں کانگریس میں صفر کر دیا ان کی جگہ بھیم سین سچ کو پارٹی کالیدر اور صوبہ کا وزیر چاہا۔ صوبہ کانگریس مولانا داؤد غزنوی کے حوالے کر دی اور جسے چاہا ٹکٹ دیا اُن کو جو الزل کو آگے بڑھا یا جو سچے نیشنلسٹ یا سوشلسٹ تھے اور جن کا گوپی چند گروپ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد بھی مولانا تھے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو سینچنے نہ دیا جس طرح تاجیت کر ڈالا با تاتوی بوزیشن وی آخری دنوں میں سردار بٹیل سے مولانا کی جو بہ مزہ کی ہوئی گوپی چند بھارگو اس سے تڑپا کی دگی نئے — مولانا کے نزدیک — لوگ انسانی آہرڈوں کے پوپاری اور انسانی جانوں کے دلال تھے لیکن مولانا کبھی کوئی بات زمان سے نہ کہتے جو شخص جرم کا ارتکاب کرتا اس کے مطابق اُسے صحیح مقام پر لے جاتے اُن کے نزدیک ایسے اشخاص کی سزا کے لئے ہی کافی تھا — اس رنگارنگی کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں اعتدال تھا وہ نرم خوار نرم لہجہ ارم مزاج اور نرم طبیعت کے انسان تھے

اُن کی بدولت کانگریس کی صوبہ میں وہی پوزیشن رہی جو سردار سکندر حیات کے زمانہ میں صوبہ مسلم لیگ کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک چلبلا لڑکا ملک راج بھی قید میں تھا۔ نین نفش تیکھے ہنس لکھے گدازنگ شریتی آنکھیں لمبی ناک میانہ قد اہتسا کی بولتی چالنی تصویر معلوم ہوتا تھا ڈاکٹر صاحب کسی مندر سے کوئی مورقی اٹھالائے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کا باہر بھی سکڑی تھا اور اندر بھی۔ ہم اُسے بیک نیک کہہ کر چھڑا کرتے اس میں غصے یا ننگلی کا شائبہ تک نہ تھا جس سے مناخوش ہو کے ملتا اور دوج خوام یا رکی طرح گل کتر جانا تھا۔

### بے قابو حالات

باہر سے ہوتا تھا کوئی راز نہیں رہا تھا سب باتیں آشکار تھیں تمام اخبارات مل جاتے تھے کچھ جائز طریق سے کچھ پوری چھپے جنگ کا حال یہ تھا کہ ابھی تک اتحادی بیٹ رہے تھے جاپان ہندوستان کے دروازے تک آہنجا ہنجا برما میں اس کی فوجیں اتر چکی یا اتر رہی تھیں جنرل رو میل نے لیبیا کو گرما رکھا اور اتحادی پے در پے نکست کھا رہے تھے ہٹلر کی فوجیں روس کے میدانوں کو پامال کرنی ہوتی ماسکو کی طرف بڑھ رہی تھیں کانگریس ہائی کمانڈ فیڈ میں تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے؛ عرصہ بعد پتہ چلا کہ کانگریس ہائی کمانڈ کو احمد نگر کے فلع میں رکھا گیا اور مہاتما گاندھی کو آغا خان کے محل میں افواہ یہ تھی کہ انہیں ہندوستان سے باہر کسی نوآبادی میں لے گئے ہیں پورا ملک جیل خانہ بنا ہوا تھا خیریں آ آ کے نکل جاتی تھیں ہمیں دو قسم کی خبروں سے دلچسپی تھی — ایک کانگریس سے مرکا۔ کی صلح کب ہوگی اور ملک اس صلح کے بعد کیا

کروٹ لیتا ہے؟ دوسرے جنگ میں اتحادی کب ہارتے ہیں؟

ابک روز صبح دس بجے لالہ چھوٹو رام آنکے سنا تھا کہ زبان آور ہیں دیکھا تو جو ستا  
تھا وہی پایا چوکھی لڑنے میں کمال تھا جس نے آوازہ کسا اس نے آوازہ سا، پھبتی کا جواب  
پھبتی سے، طعن کا طعن سے، طنز کا طنز سے، ضلع جگت کا ضلع جگت سے، بلا کے  
عاصر جواب تھے انہیں اپنے سیاسی موقف پر رتی بھر شرمندگی نہ تھی۔ سنتے بھی تھے  
اور سناتے بھی سکندر حیات کے بعد وہی پارٹی کا دماغ سمجھے جاتے ملک خضر حیات  
وزیر اعلیٰ ضرور تھے لیکن یوپی نسٹ پارٹی کی تنظیمی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی میں نے کہا—  
”چودہری جی! آپ آگے شکر یہ لیکن ملک خضر حیات کہاں ہیں  
کبھی انہیں بھی تو بھیجئے؟“

”میاں وہ تو واجب علی شاہ ہیں جان عالم پیا کی طرح غسل خانے  
میں ہوں گے بازنا نے ہیں۔“

”اور آپ؟ ملک کندن لال نے“ لطف لینے کے لیے چٹکی لی۔  
”فی الحال قید خانے میں آپ کے پاس“ زناٹے کا فہمہ بلند ہوا  
اور چودہری صاحب پھریری لیتے ہوتے چلے گئے۔

### ساتھیوں کی رہائی

اپنی اپنی قید گزارنے کے بعد کچھ ساتھی رہا ہو گئے انکے چلے جانے سے کوئی چیز کھوسی  
کئی لیکن بعض ایسے ساتھی بھی رہا ہو رہے تھے جن سے ہماری دماغی رونقوں اور دلی  
مستوں میں اضافہ ہوا تھا یوسف مہر علی کی رہائی کا ذکر پہلے آچکا ہے ان کے بعد

گوند سہاے چلے گئے وہ لکھنؤ کے ایک تیز و طرار اور ذہین و فطین نوجوان تھے ایک زمانہ میں رفیع احمد قدوائی کے برائٹیویٹ سیکرٹری رہے تھے قدوائی نے ٹکٹا دلو کر صوبائی سبلی کا ممبر بنا دیا۔ وہاں اپنی قابلیت سے پہلے ان کے پارلیمنٹری سیکرٹری پھر چیف پارلیمنٹری سیکرٹری سونے بڑے تڑت پھرت نوجوان تھے۔ شکل و صورت واجبی، قد درمیانہ، چہرہ بے رونق، نقش گوارا لیکن بول چال میں قیامت، انگریزی اس طرح بولتے جیسے مادری زبان ہو کھتے اس طرح کہ آہٹ چل رہی ہے۔ ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کے مصنف تھے ان کی ایک کتاب 'اردو ترجمہ شہنشاہیت' کے نام سے مکتبہ برہان نے شائع کیا تھا دوسرا 'معلومات جنگ' کے نام سے مکتبہ زمزم نے پکے ویشنوا اور کٹرہندو تھے لیکن بڑے ہی خوشگوار آج کل یو پی کورمنٹ میں غالباً وزیر مالیات ہیں جیب سے آزادی آئی ہے لگاتار دیر چلے آ رہے ہیں۔ لے

پاکستان بنتے سے پہلے ایک دوست مجھے اُن کے ہاں لکھنؤ لے گئے اس زمانہ میں جیل خانوں کے وزیر یا پارلیمنٹری سیکرٹری تھے کانگریسی وزارتوں میں پارلیمنٹری سیکرٹری کو بھی انتظامیہ کے اختیارات حاصل تھے۔ اُن دوست کے کوئی عزیز یو۔ پی میں قید تھے اُس کی قید کا ایک ماہ ماقی تھا اور وہ اُسے عام معافی دلو کر رہا کرانا چاہتے تھے مگر سہانے سے کہا خوش دلی سے بلش آتے اور گھر بیٹھے بیٹھے انسپکشن کو رہائی کی ہدایات جاری کر دیں آتی، قعر اُن سے ایک اور ملاقات ہوئی اُن دنوں ہر جگہ وزارتی مشن کے پلان کا چیرچا تھا سہانے تقسیم کے حق میں اور سمجھوتہ کے خلاف تھے اُن کا

علا افسوس کہ اب اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔

خیال تھا پاکستان بن جائے تو ہندوستان ہندو مسلم مسئلہ سے خلاصی پائے گا اس کے بعد ہندو اکثریت کو ہر دائرے میں اپنے نظریات و خیالات کے مطابق نشوونما پانے کی آزادی ہوگی۔

”ان نصف کے لگ بھگ مسلمانوں کا کیا بنے گا جو تقسیم کی صورت

میں بھی وہاں رہ جائیں گے“ میں نے پوچھا

”کیا بنے گا؟“ گوردھبھائے ہنسا۔ ”تیسری طاقت کے چلے جانے اور

ہندوستان کے بٹ جانے سے یہ مسئلہ از خود ختم ہو جائے گا جن مسلمانوں

کے مفادات پاکستان میں ہیں وہ پاکستان چلے جائیں گے جو رہ جائیں گے

انہیں ہندوؤں میں واپس آنا ہوگا آخر ان میں تو سے فی صد ہندوؤں

ہی کی اولاد ہیں۔

”اچھا تو آپ انہیں شدھ کرنے کا سوچ رہے ہیں۔“

وہ اس طرح مسکرایا جیسے اس کی تائید کر رہا ہو۔

”بھئی کانگریس کے بعض نیتا پاگل ہیں وہ تقسیم قبول کر لیں تو ہمارے

ہاتھ سے جاتا کم آتا زیادہ ہے۔“

### لالہ برج کشن چاندی والا

یہ سنگین صورتحال میں کا یو۔ پی کے مسلمانوں کو آج مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اُن

لوگوں کے ذہن میں پہلے سے تھی صرف وقت کا انتظار تھا ایک شریف انسان لالہ برج

کرشن چاندی والا بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہلی کے متمول گھرانے سے تھے اُن کے بڑے

بھائی ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کے جنرل مینیجر یا مینجنگ ڈائریکٹر تھے وہ اپنے منصب

کی وجہ سے وائسرائے سے بلا واسطہ مل لیتے اور اس طرح بہت سی خبریں لے آتے تھے ان کی معرفت بہت سی تجویزیں کانگریس راہنماؤں کے پاس آئیں اور بہت سی حکومت کے ہاں جانی جھٹیں آپس میں ایک ذریعہ بنا ہوا تھا۔ برج کرشن السمان نہیں دہوتا تھے بڑے ہی نمکس المزاج تعصب اہتیں چھو ایک نہیں تھا گاندھی جی نے منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔ جھگڑوں بھگڑوں سے دوز ٹھٹھے مذاق سے نفور کم آئیں، احرار کی بے جگری کے بہت ماٹ تھے کہنے لگا پچھلے سال جب وہ گجرات جیل میں تھے تو احرار کے سالار سردار شفیق بھی وہیں تھے ایس دن کچھ ساٹھی سردار صاحب کے کمرے میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ سیرنٹنٹ کا اردلی آیا اور انہیں ایک تار دے کر چلا گیا۔ سردار صاحب نے وہ تار پڑھا اور جیب میں ڈال لیا پوچھا خیریت ہے؟ کہا الٹا کا شکر ہے بات آئی گئی ہو گئی شطرنج ٹیپی ہوا توئی دو گھنٹہ بعد محفل برخاست ہوئی تو سردار صاحب اٹھ کر اپنی چاریاتی برلٹ گئے دن کوز گیا نام ہوئی تو سپرنٹنڈنٹ اچانک آگئے اور ان سے افسوس کرنے لگے نب پتہ چلا کہ سردار صاحب کا پندرہ سولہ برس کا اکلوتا بچہ انتقال کر گیا ہے ہم نے سردار صاحب سے کہا آپ نے غضب کیا بتایا تک نہیں۔ سردار صاحب نے اسے ضبط کو سنبھالا دیتے ہوئے کہا الٹا کی رضا تھی پوری ہو گئی ہم ندرت کے سامنے بے بس ہیں میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آپ کو آرزو نہ کروں جو ہونا تھا ہو چکا آپ دعا کیجئے میں بھی دعا کر رہا ہوں۔“

برج کرشن نے بتایا کہ ہم نے ان سے سپرول پر چلے جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور یہاں تک کہا کہ ہم خود کو شش کرتے ہیں لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے صرف اتنا کہا کہ حکومت سے کسی رعایت کی درخواست کرنا مناسب نہیں، برج کرشن اس واقعہ کو پتے



ابنار اور کھری استقامت کا مثالی نمونہ کہتے اور سردار صاحب کی بسالت و شجاعت کے بے حد گرویدہ تھے مہاتما گاندھی کے ہارے میں عجیب و غریب باتیں بیان کرتے انہیں بہت بڑا رشتی سمجھتے اُن کا عقیدہ تھا کہ ایک ہزار برس سے ہندوستان میں اتنا بڑا انسان پیدا نہیں ہوا ہے۔

### اونکارنا تھ

دہلی کے ایک اور نوجوان لالہ اونکارنا تھ ہمارے ساتھ اسی وارڈ میں تھے بڑے ہی ہنس مکھ، متواضع، خوب وادعوش، خصلت امیر کا شعر ہے ۔

دلی کے ہتھیں کوچے اور اراق معنور ہیں  
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اونکار ہوبہو اس کا عکس تھے تعصب ان کے تصور میں سے بھی نہیں گذرا تھا۔ گنتی بند ہونے سے پہلے ہر ساقتی کے پاس جاتے خبر خیریت پوچھتے اور یہ زبانی کلامی ہی نہیں تھا بلکہ خدمت بھی کرتے تھے لوگوں کو کھلا کے خوش ہوتے دہلی سے ہفتہ میں دو بار اُٹھ کئے۔ مٹھانی آتی دوستوں کو باقاعدہ بھیجتے اور اس میں خوشی محسوس کرتے تھے جتنے دن رہتا چل پہل رہی تمام لوگ عقیدہ و خیال کی بوتلم، کے باوجود ان سے خوش تھے تیسرے ایک سے انسان ڈاکٹر سکھ بولال تھے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کڑا ریہ سماجی لیکن بڑے خوش مزاج بڑھاپے میں بھی باغ و بہار لیڈروں کے واقعات سنا کر خوش کیا کرتے تھے۔

تمام دن اسی طرح کٹ جاتا بعض لوگ تو بالکل کتابوں ہی کے ہو گئے تھے مثلاً ٹریسٹ میں پنڈت روپ چند کتابوں کے کپڑے تھے لیکن جو بڑھتے بیان نہیں کر سکتے تھے۔  
کندن لال ملک کتابوں کے دشمن تھے۔ ان کے ٹریسٹ ساتھی انہیں اُستاد پیڑو کی

تھے غصیل لیکن خلعت چودہ سال قید میں بہ روایت کشوری لال پنڈت انہوں نے بمشکل دوکتیں پڑھی ہوں گی اور وہ بھی جاسوسی ناول، کشوری لال ضابطہ سے پڑھتے اور ضابطہ سے رہتے تھے گلاب سنگھ مجلسی آدھی تھے انہیں پکانے اور دو سنوں کو کھلانے کا شوق تھا۔ عموماً پارٹیاں ترتیب دیتے تھے۔

### تلک راج چڑھا

تلک راج چڑھا اقتصادیات میں ایم۔ اے تھے کتابوں کے ریپادن بھر پڑھتے اور ساتھیوں کو پڑھاتے تھے میرے ساتھ ان کا دوستانہ تعلق وسیع ہو گیا یہ سفاک مرٹل کے ایما اور اپنے اخلاص سے مجھے سوشلزم پڑھانا شروع کیا۔ میں اُن کی مجلسی کا قائل ہو گیا مارکنزم اور سوشلزم پر اس انداز میں لیکچر دیتے اور نوٹ لکھواتے کہ ہر چیز دل پر نقش ہو گئی مدنیات کیا ہیں تاریخ میں معاشی قوتیں کیونکر کام کرتی ہیں سرمایہ محنت کی کشمکش کیا ہے؟ سرمایہ کسے کہتے ہیں محنت اور زائد محنت کیا ہیں؟ طبقاتی سماج کیونکر پروان چڑھتا ہے عدم طبقاتی سماج کیسے وجود میں آسکتا ہے؟ غرض اس موضوع اور مضمون کے چلنے مباحث تھے پروفیسر تلک راج کی رہبری سے حل ہو گئے اور میں نے طالب علم بن کر ان مسائل میں تجرباتی بصیرت پیدا کر لی مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ تلک راج چڑھا ان مضامین میں میرے استاد تھے ایک مثالی نوجوان جو عمر میں مجھ سے چھٹا تھا لیکن علم اور تجربہ میں بڑا، اسی سیرت کے نوجوانوں کی بدولت قدرت کے کارخانے میں شرافت اور دیانت کو قدریں مرتے نہیں پاتی ہیں ہم نے اخلاقِ عظیمیہ کے بہت سے تذکرے پڑھے ہیں تلک راج چڑھا اسی اخلاق کی ایک جلیقی جاگتی تصویر تھے اس وقت ۲۷ یا ۲۸ برس کی عمر کے پیٹھے میں ہوں گے

انہیں انگریزوں میں تکلیف تھی۔ وہ دیوبلی کیمپ سے گجرات جیل اور گجرات سے علاج کیلئے لاہور تھانہ  
 سیدنگ، چکھے نقش میاں قذو بلاجم، گھلاما تھا بدن پر گوشت تو پہلے ہی نہیں تھا اب پیداری  
 نے مشت استخوان بنا دیا تھا چھیننے ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا آٹھ برس کی عمر میں  
 ایک ہندو ملوانی کی دکان میں برتن مانجھنے پر نوکر ہو گئے صبح و شام گاہوں کے چھوٹے کٹورے  
 مانجھنا ان کا کام تھا رات کو دوکان ہی کے تھڑے پر سو رہتے سروبوں میں انگیٹھی کے پاس۔  
 گرمی میں فنٹ پاتھ پر، ایک دن اچانک لالہ گوگل چند بھسین ایڈووکیٹ کی نظر بن پر پڑی انہوں  
 نے محسوس کیا کہ کسی اچھے گھرانے کا بچہ ہے اور کوئی افتاد اس دوکان پر لے آئی ہے۔ حالات  
 معلوم کئے تو قیاس صحیح نکلا لالہ گوگل چند انہیں گھر لے گئے اس وقت ان کے ہاں اولاد  
 مزید نہ تھی بچیاں ہی بچیاں تھیں بیوی سے کہا اپنا سمجھ کر پالو قدرت نے لالہ جی کو اسی  
 سال بچہ دیا تلک راج نے بیڑھ لکھ کر اقتصادیات میں ایم اے کیا اور ڈی اے وی کالج راولپنڈی  
 میں استاد ہو گئے جتنی تنخواہ ملتی اپنے اخراجات کے لیے ایک چھوٹی سی رقم رکھ کر باقی دوستوں  
 میں تقسیم کر دیتے ان کا معمول تھا جس روز تنخواہ ملتی اسی دن ساتھی دوستوں کے گھر میں ماہانہ  
 بھوادیتے بالخصوص ان مسلمان ساتھیوں کے ہاں جو آتے دن قید و بند میں پڑے رہتے تھے۔  
 لالہ گوگل چند تلک کو اپنے مہٹوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہر طرح دلجوئی کرتے۔  
 تلک بھی ان کا باپ کی طرح ادب کرتا سامنے آتے ان کے پاؤں چھوتا اور ہاتھ پائیہ کر کھڑا رہتا  
 لالہ گوگل چند کا حقیقی بیٹا پریم بھسین بھی قید میں تھا وجہیہ و شکل ذہین و فطین پولیٹیکل سائنس میں  
 ایم اے، لیکن لالہ جی اور ان کی اہلیہ کے جتنے خط آتے سب تلک کے نام، لالہ جی تلک سے  
 اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن تلک نے احتجاج کرتے ہوئے کہا میں اس گھر  
 کا بیٹا ہوں آپ مجھے ہنوں سے کیونکر الگ کر سکتے ہیں؟ بہن اور بھائی میں میں بیوی کا ورثہ

سے ہو سکتا ہے؛ لالہ جی کے خاندان میں ایک اور گھر تھا اس کی بیٹی نے تلک کے ساتھ ایم لے  
 یا اس لڑکی نے ایک دن تلک سے کہا کہ آؤ شادی کر لیں تلک جھنجھلا گیا کہنے لگا ہم ایک  
 سیر کے بہن بھائی ہیں میں نے جس پر پوچھا میں پرورش پاتی ہے اس کا بیٹا اور بھائی  
 نہ کر رہنا چاہتا ہوں مجھے کوئی دوسری حیثیت منظور نہیں یہ واقعہ اس لڑکی کے بھائی نے  
 بے خود سنا باؤ سے قلع تھکا کہ یہ جواب پا کر اس کی اکلوتی بہن نے خودکشی کر لی اور ہمیشہ  
 کے لیے داغ جہانی دے گئی لیکن وہ تلک کی تعریف بھی کرتا تھا کہ ہمارے ملک میں اس  
 نام کے خوش سیرت نوجوان بھی ہیں۔

۱۹۴۶ء کے آخری انتخابات میں وہ راجن پٹی کے نہری حلقہ سے اسمبلی کا ممبر ہو گیا میں  
 نے جس نوجوان کے بارے میں بھی سوالات آراء سے عرض کیا اس کو ٹیٹ مل گیا اور وہ اپنے  
 مخالفوں کی نمائندگی ضبط کر کے ممبر ہو گیا تلک راج بھی اہلی نوجوانوں میں سے ایک  
 تھا ایک دن وہ بریڈ لائل۔ باہر ایک نازک سی حالتوں سے کھڑا باتیں کر رہا تھا میں نے  
 نظریں بچا کر لکھنا چاہا چڑھائے آواز دے کر بلا لبا شورشن ان سے ملو نہہاری بھابی ہیں  
 پروفیسر اجیت کور ایم اے رام صحیح یاد نہیں رہا میں کل ان سے شادی کر رہا ہوں صبح  
 دس بجے کورٹ میں چلے آنا۔ رات ایک مختصر سی دعوت بھی ہو گئی۔ اور اس طرح  
 اُس کی شادی ہو گئی۔

\_\_\_\_\_ تقسیم کے دنوں میں اُس کا مکان انارکلی میں تھا مجھے بلوایا اور کہا کہ  
 میں لاہور ہی میں رہنا چاہتا ہوں کوئی صورت ہو سکتی ہے صورت کیا ہوتی؟ فضا کے  
 خنجروں سے گھائل ہو کر مشرقی پنجاب چلا گیا وہاں صوبائی اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس  
 میں اعلان کیا کہ وہ لیٹن لوگوں کے۔ یہ میں بلٹینا چاہتا جن میں اکثریت اُن اشخاص

کی ہے جن کے ہاتھ انسانی خون سے رنگے ہوتے ہیں جنہوں نے مذہب کے اختلاف پر لوگوں کی بہو بھیاں اٹھائی اور اٹھوائی ہیں میں یہاں بیٹھے ہوئے بہت سے مکروہ چہروں کو جانتا ہوں۔ میرے لیے اس قائل اسمبلی میں بیٹھنا ضمیر پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے میں استعفیٰ دیتا ہوں یہ کہہ کر وہ اسمبلی ہال سے نکل گیا۔ آجکل مشرقی پنجاب کے کسی گورنمنٹ کالج میں پرنسپل ہے کبھی کبھار خوشگوار یادیں جاگ اُٹھتی ہیں تو ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل  
می بنیت عیاں و دعای فرست

### سحر گل اور کلبیہ سنگھ

سحر گل اور کلبیہ سنگھ یہ دونوں بھی علاج ہی کے لئے لاہور میں تھے جیل میں ہماری چار یاری کا چرچا تھا سحر گل کو ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ دفعہ مرگی نما دورہ پڑتا جس سے اس کا سارا بدن ہل جاتا اس کی بُری حالت ہوتی تمام بڑے بڑے ڈاکٹر یہ بتانے سے قاصر تھے کہ مرض کیا ہے؛ کلبیہ سنگھ کو بھی ایسا ہی کوئی مرض تھا قے آتی تو لگاتار ایک ایک گھنٹہ بے ہوش رہتا نہ غذا انہیں کچھتی نہ وہ غذا کو سچتے یہ دونوں اس وقت برائے نام جی رہے تھے کلبیہ سنگھ کو مطالعہ بہت شوق تھا اُس نے پنگون سیریز کی بہت سی کتابیں خرید رکھی تھیں لیکن اب اس قدر لاچار تھا کہ عرصہ سے پڑھنا پڑھنا ترک کر دیا تھا تمام دن خوش وقتی کے لیے گپ بازی ہوتی یا اخباری اطلاعات پر تبصرہ و تجزیہ میرا معمول تھا کہ ہر روز کسی نہ کسی کتاب کے سو صفحے پڑھتا جو مقامات سمجھ میں نہ آتے

ساتھیوں سے پوچھتا سیکھنے میں مجھے کوئی عار نہ تھا بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بھی پوچھتا اور جب تک الفاظ و مطالب سے پوری آشنائی نہ ہو جاتی مضطرب رہتا نقص یہ تھا کہ میرے معاملہ میں باتا عدگی نہ تھی جو سامنے آبا یا جو ملا پڑھ ڈالا۔ مذہب، تاریخ ادب، سیاست، فلسفہ، سائنس، معاش، شاعری، صورت ایک چیز ایسی تھی — کہ میرا دل کبھی نہیں لگا اور وہ ناول یا انصاف نے تھے مقررین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ناول انہیں زبان سکھاتا ہے جس سے اظہار کی طاقت بڑھتی ہے میرا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے میں نے زندگی بھر ناولوں کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ قدیم ادب میں سے اگر دو چار ناول پڑھے بھی تو زبان کی لذت اٹھانے کے لیے، میرا مشغلہ تھا کہ دن بھر دوستوں کے ساتھ محفل لگاتا۔ ڈیوڑھی کی سیر کر آنا جیل کا چکر کاٹا قیدیوں کی نفسیات معلوم کرتا پچاسی پانے والوں سے ملنا ان کے مقدمات پوچھتا اور دن تھے کہ بھاگے چلے جا رہے تھے رات کو بڑے آرام سے پڑھتا اور سہم کر کے پڑھتا۔ لکھنا تقریباً سو فون کر رکھا تھا طبیعت ہی اُدھر نہ آتی شاعری کا یہ سال تھا کہ جیسے اس سے کبھی کوئی سروکار نہیں تھا۔

### افسوسناک واقعہ

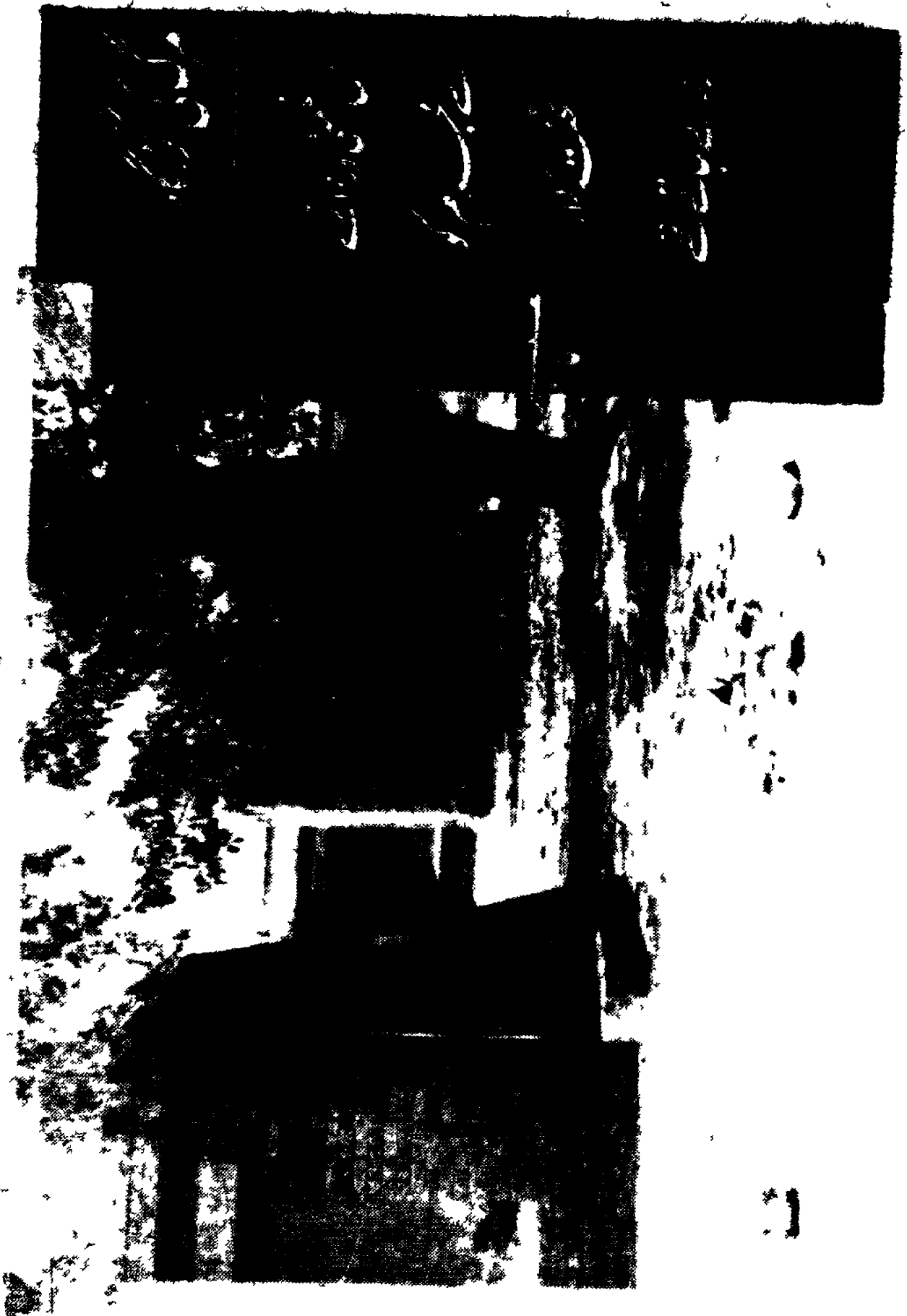
اچانک ایک عجیب حادثہ پیش آگیا امرتسر کا ایک رئیس زادہ غلام مصطفیٰ اعجازی کے ایک مقدمہ میں پانچ یا سات برس قید بھگت رہا تھا ایک روز بی کلاس میں ایک اور نوجوان آگیا اسے قتل میں دس سال قید سخت کی سزا ہوئی تھی — وہ چودہری چھوٹو رام وزیریال کا بھتیجا بوجھا تھا رنگ اس نوجوان کا یلح تھا نازک سا بدن، موٹی موٹی آنکھیں، بس یہ کہہ لیجئے کہ اسے دیکھ کر غزل ہو جاتی مصطفیٰ کی طبیعت میں کھوٹ آگیا دونوں بی کلاس

میں تھے مصطفیٰؐ کس طرح اُسے ٹیررسٹ وارڈ میں لے آیا ہانگ لائگ کے ایک سکومیدی سے  
 ٹپس لٹرائی دونو بدی پر تیار ہو گئے نوجوان نے مزاحمت کی مصطفیٰؐ نے کلا گھوٹا اور اس بُری طرز  
 اُس کے رخساروں اور ہونٹوں کو لانا کہ زخموں کے نشان پر گئے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے آئے  
 گئے بدن پر خراشوں سے دھاریاں پڑ گئیں تمام جیل میں شور مچ گیا سپرنٹنڈنٹ وڈرنا ہوا  
 آیا جیلر نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ ہم لوگ اپنے طور پر شرمندہ تھے کہ ہمارے وارڈ میں یہ واقعہ  
 ہوا ہے آخر یہ قضیہ اس طرح ختم ہوا کہ ہانگ لائگ کے خود ساختہ پولیٹیکل قیدی جو تقریباً سب  
 سکے تھے اے کلاس کی مراعات سے محروم کر کے ان علاقائی قیدیوں میں بھیج دیئے گئے شرکا  
 جرم نوجوان چکی میں ڈال دیا گیا مصطفیٰؐ کو تیس بیدوں کی سزا ملی ازاں بعد اُسے لاہور سنٹرل  
 جیل سے ملتان سنٹرل جیل بھیجا گیا۔

۳۲۸









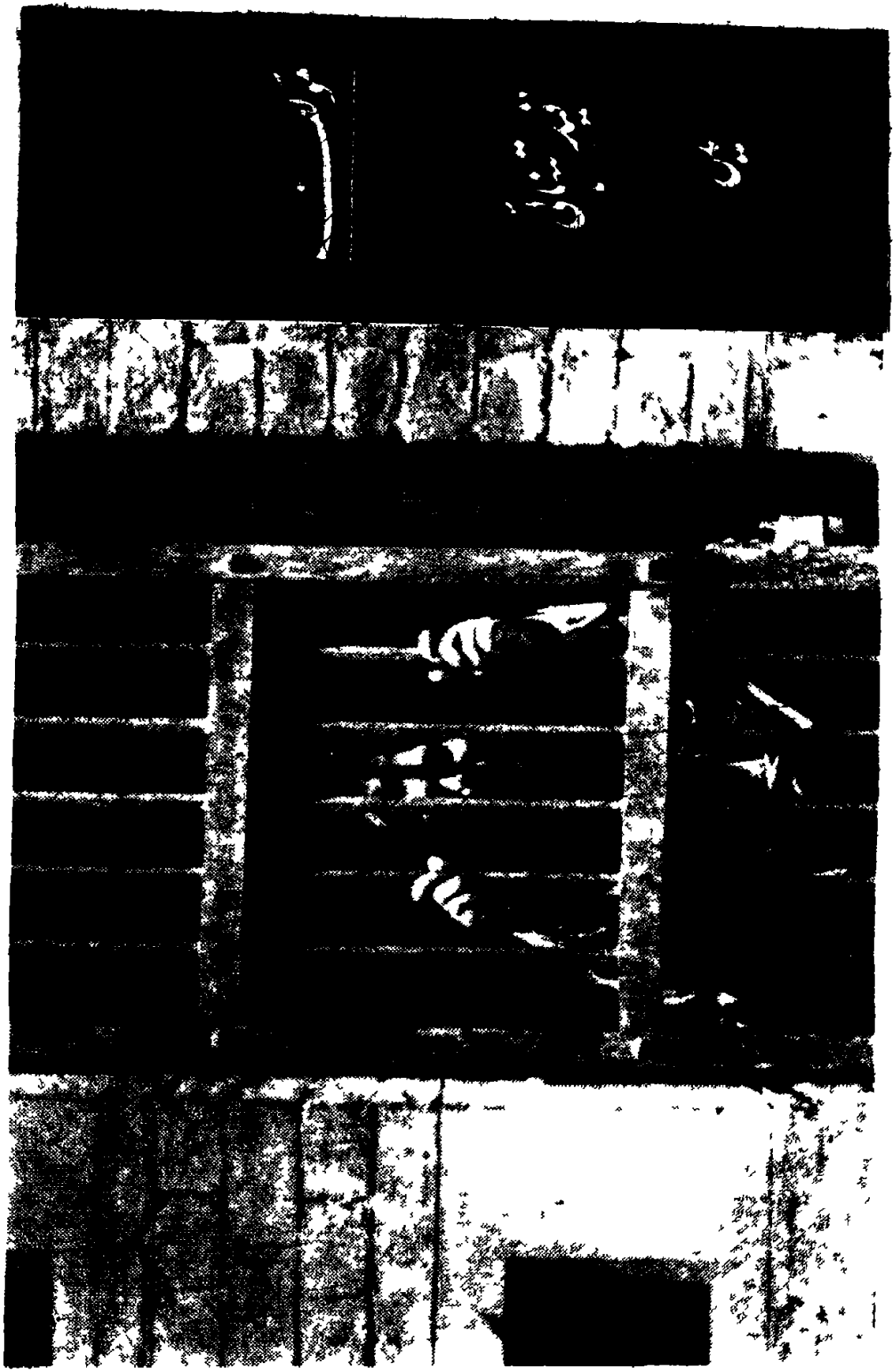
# کجسته وار

په پورټو ډرخت کېږي هېرانه پوسکا

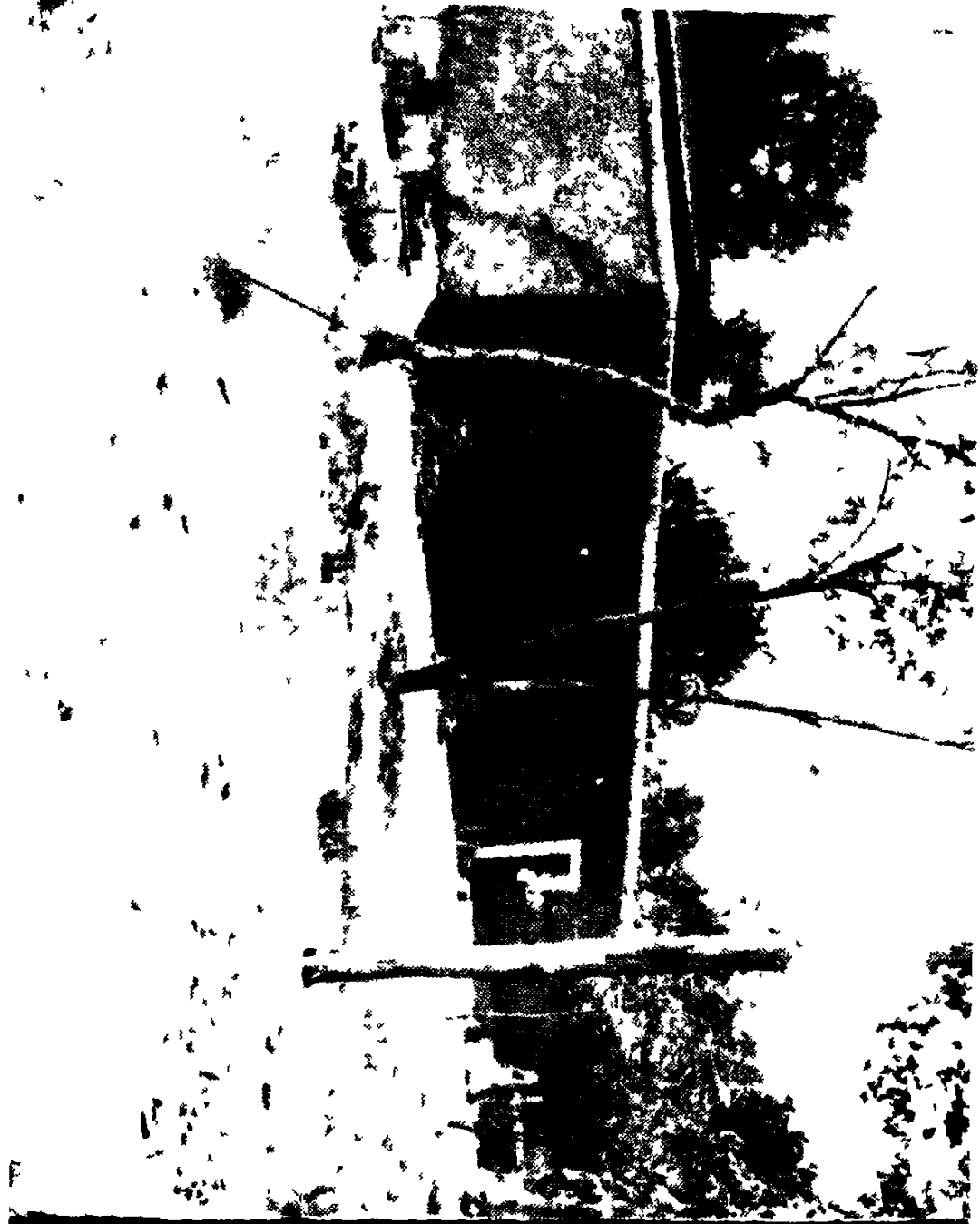


میرزا قاسم  
آهلی

۱۲۸۵







طہریہ سوسائٹی  
وارڈ



موت کے غم

پندرہ روزہ

جہاں پھانسی پلنے

وہاں قیامت ہے

کچھ جانتے ہیں

صاف و چالاک  
 پانوں کے فیروز تان  
 ملک اور وطن  
 کی جیتنے والی بی جہات  
 ہنگامہ سنبھالو اور اپنے  
 ساجھو دت کا قدمہ





ہندوستان میں برطانوی عملداری کو دو چیزوں نے مضبوط رکھا خارجی طور پر اس فوجی  
 سپاہی تے جو ملک معظم کی سلطنت کے لئے اس ملک میں عام تھا اور اعلیٰ طور پر سی آئی ڈی  
 کے کارخانے نے جو برطانوی سرکار کی بقاء کے لئے ریڑھ کی ہڈی تھا اس محکمہ میں وہ لوگ  
 شامل تھے جو انگریزوں سے زیادہ انگریزوں کے وفادار اور ایک جرم دریافت کرنے کے لیے خود  
 دس جرم کرتے تھے پچھلے صفوں میں یہ ذکر آچکا ہے کہ انہیں اپنی ترقی کی اس قدر چاٹ  
 لگی ہوتی تھی کہ جرم نہ ہو تو جرم بنا دیتے تھے ان کی بدولت بہت سے نوجوانوں کو تختہ دار پر  
 پھینچنا پڑا۔ ہزاروں پٹ گئے اور سینکڑوں جیل خانوں کی کال کو ٹھٹھوں میں گھٹ گھٹ کر مر  
 گئے انگریزوں نے ان دیسی صاحبوں کو اپنی قوم اور اپنے مذہب سے بیگانہ کر دیا تھا آخری  
 تین چار دہائیوں میں سب سے زیادہ فائدہ جس قوم کے افراد سے اٹھایا گیا وہ زیادہ تر مسلمان  
 تھے اور مسلمانوں میں بھی دو فرقوں کے افراد خاص طور پر پیش پیش رہے ہیں نہیں کہہ سکتا اس  
 کی وجہ کیا ہے اور وہ ہیں نے اس پر کبھی غور کیا ہے لیکن پنجاب میں اٹھارہویں صدی کے

برطانوی عملداری کے اس شعبہ کی بڑی خدمت کی ہے یہ کوئی تعریف نہیں بلکہ ایک طرح کا ثناء ہے کہ جن لوگوں کے سامنے حسین علیہ السلام کا اُسوہ ہوا اور جو ہر سال کربلا کی یاد میں اس شہکار ہوں ان کا سی آئی ڈی کے اہلکار کی حیثیت سے حریت و استقلال کے نام لیاؤں کی گردن بڑھ چھی بھیرنا اور سود فروشی کی حد تک انگریزوں کی حاشیہ برداری کرنا ہولناک سا سنا تھا قاریانِ جماعت کے ہیروؤں کی ذہنیت تو سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے پر واپنے سوا عام مسلمانوں کو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے ان کے لئے انگریزوں کی سلطنت آبرو حمت تھی وہ اگر عرب ملکوں میں جاسوسی کرتے یا برطانوی فوج کے اعضاء و جوارح تھے تو یہ کوئی عجوبہ نہ تھا ان کے عقیدہ کا جزو تھا جس نے جس زمانے میں قومی تحریکوں سے نسا سانی حاصل کی پنجاب سی آئی ڈی میں اکثریت اثناعشریوں کی تھی خال خال سنی بھی تھے لیکن ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہونے اس لوگوں نے انتہائی منطالم روا رکھے جو ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا ہو گیا ان کے نزدیک بولینیٹیکل نو جوانوں کو کچلنے اور من مانی کرنے کے لئے ہر حربہ جائز تھا قبر تک تعاقب کرتے اور ستم توڑتے ان کے ہاں ہر سیاسی کارکن کا ہسٹری ٹیٹ گھلا ہوا تھا جس میں تباہی کلمہ ہاتے خیر ہوتے۔ اپنے بارے میں ان کا خیال تھا کہ مامور من اللہ ہیں اور ان کی خاندانی وجاہتوں میں کوئی زخم نہیں ہے محکمہ کے مٹھی بھر افسروں نے اپنے ادنیٰ اہل کاروں کی معرفت بردور میں بہیت کا چولہا گرم رکھا جو کوئی نوجوان ان کے ہاتھوں قید ہوتا اس کا بیچا کرتے انتہائی ستم ڈھاتے اور یہ اپنے فرانس کا جزو سمجھتے تھے ان فرانس کو انہوں نے اپنی ترقیوں کا زمین بنا رکھا تھا۔ جسٹس یگ کے الفاظ میں پولیس کے فرانس شکار سی کتے کے نہیں بلکہ رکھوالے کتے کے تھے لیکن سی آئی ڈی نے شکار کرنے اور شکار پیدا کرنے ہی کو حس و خوبی سمجھا ایک دن میر حبیب اللہ شاہ نے کلبیر سنگھ سے کہا کہ تمہارے

متعلق سی آئی ڈی نے لکھا ہے کہ تم بڑے محظناک ہو اور حدشہ ظاہر کیا ہے کہ جیل سے  
 بھاگ جاؤ گے کلیرنگ نے کہا اُن کا خیال غلط نہیں ہے۔  
 ”تو کیا یہاں سے بھاگ جاؤ گے؟“  
 ”جی ہاں۔ جب داؤ لگا ضرور بھاگ جاؤں گا۔“  
 ”تو یہ گویا چیلنج ہے۔“  
 ”آپ کو ہمیں سی آئی ڈی کو۔“  
 ”تو پھر ہمیں انتظام کرنا چاہیے؟“  
 ”ضرور۔“

انتظام یہ کیا کہ کوٹھڑی کی پست پر وارڈروں کا پہرہ لگا دیا یہ تمام وارڈر سی آئی ڈی  
 کی معرفت بھرتی ہو کے آئے تھے قیاس تھا کہ پولیس کے باقاعدہ ملازم ہیں جب سحر گل  
 اور کلیرنگ کو یقین ہو گیا تو انہوں نے ازراہ مذاق لیکن سنجیدہ لہجہ میں ان وارڈروں کے  
 سامنے سی آئی ڈی کے بعض افسروں اور ڈی آئی جی کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا ایک دن  
 سحر گل نے سرگوشی کے انداز میں کلیرنگ سے کہا کل صبح تک ڈی آئی جی کو قتل ہو جانا چاہیے  
 بھوشن بہار سے اچکا ہے سرنگ مکمل ہو گئی تو صبح تک ہم بھی نکل جاتیں گے۔“  
 اسی وقت سی آئی ڈی کو رپورٹ ہو گئی آنا فانا جیل کا باوا آدم ہی بدلا ہوا تھا کبھی  
 سپرنٹنڈنٹ آ رہا ہے کبھی جیلر! وارڈر ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے اور اس کی فوج  
 لگاتی جا رہی تھی کہ سرنگ کہاں کھدی ہے باہر پولیس کھڑی تھی جلیز نے کہلا بھیجا لہ آج  
 رات سب کو بند کیا جائے گا معلوم ہوا کہ دفتر میں سی آئی ڈی کے افسر بیٹھے ہیں سحر حبیب اللہ  
 شاہ سخت پریشان تھے کلیرنگ نے جب دیکھا کہ پریشانی بہت بڑھ گئی ہے تو مسکرایا ان سے کہا

شاہ صاحب آپ مطمئن رہیے کچھ نہیں ہوگا نہ ڈی آئی، جی سی آئی ڈی قتل ہوں گے نہ کوئی مجھوشن، ہمارے آیا ہے نہ ہم نے مرگ کھدوائی ہے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ کر لیا ہے اب ان وارڈوں کی ضرورت نہیں رہی انہیں کہنے کہ واپس چلے جائیں کیا سی آئی ڈی کو آپ پر اعتماد نہیں؟ ہمیں آپ پر اعتماد ہے حکومت نے ہمارے متعلق جو اعتماد آپ پر کیا ہے وہ ہم کبھی ممانع نہ ہونے دیں گے۔“

مجر حبیب اللہ شاہ کو حیرت ہوئی اور تعجب بھی جہانگیرہ انسان تھے۔ زور کا قہقہہ لگایا اور ”چہ خوب کہہ کر لے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے واپس چلے گئے اگلے دن تینوں وارڈ غائب تھے کئی دن تک حبیب اللہ شاہ مذاق کی داد دیتے اور اعتماد کا شکر یہ ادا کرتے رہے یہ وہ زمانہ تھا جب جے پرکاش نارائن ہزاری باغ جیل سے بھاگ نکلے تھے اور ان کی گرفتاری کے لیے تمام ہندوستان کی صوبائی اور مرکزی پولیس کو جو کتنا کر دیا گیا تھا۔ جے پرکاش ان دنوں لاہور میں روپوش تھے ان کے پیغام آ جا رہے تھے پنجاب سے باہر رہتے تو شاید کبھی نہ پکڑے جاتے لیکن پنجاب نے ان کی گرفتاری کا سہرا اپنے سر باندھا لاہور کے شاہی قلعہ میں ان کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ غایت درجہ ظالمانہ تھا۔ قلعہ لاہور

(LAHORE FORT) کے نام سے انہوں نے ان دنوں کی آپ بیتی لکھی ہے۔ اس کتاب کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ سی آئی ڈی کے اہل کار اپنے خداوندانِ نعمت کے لیے کیا کچھ کرتے رہے اور انکی اطاعت اپنے اُد پر کیوں کر فرض کر لی تھی۔ مجھ سے خود اس زمانے کے ایک انسپکٹر پولیس نے بیان کیا کہ جے پرکاش سے پوچھ گچھ پر وہ مامور تھا۔ اسی کے الفاظ میں اس کراڑ کو اس نے بُری طرح سیدھا کیا۔ سردی نے دنوں میں برف کی سنوں پر لٹایا۔ پٹائی کی الٹی ہتھکڑیاں لگائیں۔ کئی رات سونے نہ دیا۔ غرض ذہنی و جسمانی اذیتوں سے الٹی بیلٹ کیا۔ مگر وہ دھن کا پکا تھا۔

کوئی سی بات نہ مانا۔۔۔۔۔ اس انسپکٹر کو اپنے اس کارنامے پر بے حد فخر تھا۔ اپنی قابلیت کے لیے اسے مندرگدانتا اور ایک کراڑ کی پٹائی کو داخل حسنا سمجھتا تھا۔ اور نا آصف علی "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک (۱۹۴۲ء) میں انڈیا گروپنگ میں لیکن پنجاب میں بھول کر بھی قدم نہ رکھا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ آخر وقت تک نہ پکڑی گئیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی گرفتاری کے لیے انعام کا مسلسل اعلان کرتا رہا لیکن وہ آل انڈیا ریڈیو ہی کے ڈائریکٹر جنرل احمد شاہ بخاری ریٹائر ہوئے کے ہاں نوکمرانی ہو کر رہی رہیں پطرس مرحوم اس راز سے واقف تھے بلکہ ان کا منصوبہ تھا۔

بسھاش چند ربوس ہندوستان چھوڑتے وقت لاہور میں ایک رات رہے اور اسی کمرے میں ٹھہرے جہاں آج کل چٹان کا دفتر ہے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اگلی صبح وہ بھیس بدل کر پشاور چلے گئے۔ وہاں سے پٹھانوں کے مخصوص لباس میں کابل چلے گئے۔ اس کے بعد جرمنی کے سفارت خانے کی معرفت برلن پہنچ گئے۔ لاہور میں ان کا قیام کہیں دو چار روز ہوتا یا معتمدوں میں مقامی لوگ شامل ہوتے تو عجب نہ تھا کہ ایک آدمی دن ہی میں پکڑے جاتے اور سی۔ آئی۔ ڈی کے ہتھے چڑھ کر لاہور کے تاریخی قلعے کی سیاحت کرتے۔ جے پرکاش کی طرح بہیمیت کا شکار ہوتے۔ راتوں کی نیندیں چھین لی جاتیں۔ سردیوں میں برف کی سلوں پر ننگے بدن لٹائے جاتے صبح و شام سی۔ آئی ڈی کے عشوہ گروں کی اداہائے محبوبی کا مزہ چکھتے اور نازنینان حکومت کو دعائیں دیتے کہ ان کی مٹی کتنی دلفریب واقع ہوئی ہے!

یہ امتیاز اس قلعہ ہی کو حاصل ہے کہ ہر دور میں استعمار دشمنوں اور عوام دوستوں کیلئے اس نے نہ صرف پٹائی اور کٹائی کی ساعتیں مہیا کی ہیں بلکہ پولیس کے بھروسہ کو ہمیشہ اپنی سنگی دیواروں کا غلاف چڑھایا ہے۔ اور نہ جانے کتنے نوجوان اس مرگھٹ



قلعہ والوں نے ان کے ساتھ ہی کیا جو ان کی فطرت بن چکا تھا پہلے زد و کوب کیا پھر ان کو لٹکایا  
 ٹھکیں باندھیں منہ میں پتیا ب ڈالاجی کہ بدکاری کی ان نوجوانوں نے جیسا کہ وہ کہہ رہے  
 تھے ہر دستہ انکار کیا ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم بے گناہ ہیں ہمارا کسی سیاسی تحریک سے  
 کوئی تعلق نہیں ہم گھر سے بھاگ کر آئے ہیں آخر جب پولیس انہیں مارتے مارتے تھک  
 آگئی تو ایک دن سی آئی ڈی کے انسپراج سبرٹمنڈنٹ ان کے پاس گئے پہلے دم دلاسا  
 دیتے رہے پھر پھیلانے لگے ان نوجوانوں کی روایت کے مطابق سر یہ قرآن اٹھا کر کہا  
 (مکن بے غلان میں کوئی اور کتاب ہو) تم میرے بیٹے ہو۔ یقین کر دو تمہیں کوئی نقصان نہیں  
 پہنچے گا ہمارے پاس سرکاری اطلاع ہے کہ تم نے سیاسی واردات کی ہے صرف میری  
 تسلی کے لیے بنا دو کہ اس میں صداقت کہاں تک ہے؟ وہ اس کی چکنی چیڑی باتوں  
 اور قرآن شریف پر قسموں کے فریب میں آگئے اور سب کچھ بتا دیا وہ اس روز سن سنا کر  
 چلا گیا اگلے دن آیا اور کہنے لگا فکر نہ کرو صبح تک چھوٹ جاؤ گے فی الحال جیل چلے جاؤ  
 کیونکہ رہائی صرف جیل ہی سے ہو سکتی ہے سرکار کو لکھ دیا ہے حکم آتے ہی رہا ہو جاؤ  
 گے ظاہر ہے کہ دو نو فریب کا شکار ہو گئے تھے لیکن ان بھولے بھالے برہمن نوجوانوں  
 کو اب بھی اپنے مسلمان باپ پر بھروسہ تھا ان کے ذہن میں یہ بات نقش تھی کہ مسلمان سبھی  
 کچھ کر سکتا ہے لیکن جھوٹا قرآن کبھی نہیں اٹھاتا وہ ہفتہ عشرہ میں رہائی کے منتظر تھے ہفتہ  
 بھی نہ گزرا تھا کہ انہیں رہائی کے نام پر دفتر میں بلا کر بیڑیاں پہنا دی گئیں وہ پختہ رہے  
 کہ ہمیں رہائی کے لیے بلایا گیا ہے اور ہم سے یہی وعدہ کیا گیا تھا لیکن سنا کون اور وعدہ  
 کس کا؟ دونوں یوپی پولیس کے حوالے کر دیئے گئے تاہم ان سے جاتی دفعہ یہی کہا گیا کہ  
 اپنے صوبہ میں رہا ہو جاؤ گے۔ پنجاب گورنمنٹ انہیں یہاں رکھنا نہیں چاہتی عرصہ تک

پتہ نہ چلا کہ انہیں کہاں پہنچا یا گیا اور ان پر کیا بیٹی ہے؛ ایک دن اچانک ان کا خط ملا۔

”بھائی شورش — ہم دونوں کل صبح پھانسی کے تختے پر جا رہے ہیں اس مسلمان باپ کو ہمارا اسلام کہنا جس نے قرآن شریف اٹھا کر ہندو بیٹوں کو بچانے کا یقین دلایا تھا لیکن ہم اس کی دغا کا شکار ہو گئے مسلمان باپ نے کافر بیٹوں کو دار پر لٹکوا دیا ہے۔“

یہ خط ہمیں اُس دن ملا جب انہیں پھانسی پاتے ہوئے مہنت ہو چکا تھا اور اگر ان کی کوئی جیتا جلاتی گئی تھی تو اس کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

اس سپرنٹنڈنٹ کے متعلق کلبر سنگھ نے بڑے دلوز بعد انکشاف کیا اور ہم سب شدرہ گئے کہ سیفی کا شمیری جس مقدمہ میں ماحوذ ہو کر مزا یاب ہوا ہے اس کا پلاٹ بھی اس سپرنٹنڈنٹ کے یہاں خانہ دماغ کی احتراع تھا اور مقصود یہ تھا کہ وہ سردار کشن سنگھ (کلبر سنگھ کے بیٹا جی) اور بعض دوسرے نوجوانوں کو پھانسی جاتا تھا اس کے پیش نظر ملازمت میں ترمیم کا سوال تھا اور اس غرض سے وہ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا ہی رہتا تھا اس مقدمہ کا نام اسمبلی بم کیس تھا الزام یہ تھا کہ سکندر حیات کے قتل کی سازش کی گئی ہے سیفی خود شکار ہوا یا ستار کیا گیا کچھ نہیں کہا جاسکتا ہو سکتا ہے اس کو سپرنٹنڈنٹ کے آلہ کاروں نے فریب دیا ہو اور سازش کئی رخ سے چلتی رہی ہو بہر حال جب سازش پروانہ چڑھی تو سیفی کو اپنی کئی دھڑے کا تمیازہ بھگتنا پڑا دوسرا معاملہ خاکساروں کے مالدار تبلیغ پرونیس عبدالعزیز کا تھا۔



## پروفیسر عبدالعزیز

عبدالعزیز تاریخ میں ایم۔ اے تھا اور غالباً کسی زنانہ کالج میں سہٹری کا استاد، انتہائی شبک انتہائی شریف اول و آخر مسلمان، صابر و شاکر، گوراچٹا، چال ڈھال میں عاجزی اللہ پر بے پناہ مہروسہ، اسلام سے انتہائی لگاؤ اس کی صورت سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ دھوکا کھا سکتا ہے دھوکا دے نہیں سکتا۔ اس کی باتیں بیدھی سا دھی اور کسی تیج و خم کے بغیر ہوتی تھیں وہ اس جرم میں دو سال قید کاٹ رہا تھا کہ اس سے ایک لپتوں نکلا تھا جو اس سپرنٹنڈنٹ کی روایت کے مطابق سکندر حیات کو قتل کرنے کے لئے اس کے قبضہ میں تھا اور حیا اسکو گرفتار کیا گیا تو وہ سکندر حیات کو قتل کرنے کے لیے ان کے بنگلہ پر جا رہا تھا۔

میں نے پروفیسر سے اصلیت پوچھی تو وہ ٹال گیا میں نے بھی امرار کرنا مناسب نہ سمجھا وہ اخلاقی قیدیوں ہی کے ساتھ بی کلاس میں تھا سید امیر شاہ نے اس کی بے گناہی کا احساس کر کے اُسے کھلا چھوڑ رکھا تھا مشقت اس کی مسلمان قیدیوں کو قرآن پڑھانا تھی مجھ سے شیخ الحدیث کی تفسیر لے کر مہینوں پڑھتا رہا پھر ہم اکٹھے پڑھنے لگے ایک دن میں نے دوبارہ پوچھا کہ واقعی تم نے سکندر حیات کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اسکی آنکھوں میں مٹی آگئی لیکن اس مٹی کو فوراً ہی پی گیا۔ میں نے بات ہی پھوڑ دی۔

یہ ہمارے فارڈ کے پہلو میں سیاست خانہ تھا تو بالکل وارڈ میں ایک کالا بھنگ، دیوہیکل دراز ریش قیدی رکھا گیا۔ اُس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بد معاش بھی ہے اور غنڈہ بھی دربانہت کہا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام عبدالستار ہے وہلی کاربنے والا ہے اور وہاں سے غنڈہ ایکٹ کے تحت نکالا گیا ہے اب نوٹ بنانے کے جرم میں گرفتار ہو کر حوالات میں

پٹنڈنٹ نے اس کی مخصوص شہرت کے باعث اسے سیاست خانہ کی بیرونی چکیوں میں ڈال دیا تھا میں عضی باغیچہ کی سیب سے لوٹتا تو وہ عموماً مجھے سلام کرتا ایک روز مجھے روک کر اپنا دکھڑا بیان کرنے لگا میں نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے خاکساروں کا دہلی میں سالار رہا ہوں۔ فلاں فلاں بند و کوفلاں فلاں فلاں فلاں کے اشارہ پر مروایا۔ شہر بھارت کے قتل ہاں سب اسی ہاتھ تھا دہلی پولیس نے مجھے غدا قرار دے کر نکال دیا پنجاب پولیس نے مجھے جعلی نوٹ سنانے کے مقدمہ میں پھانس لیا ہے میں نے جو کچھ کہا خاکساروں کی امانت کے لیے کیا ہے کسی بھی مسلمان کو میری تکلیف کا احساس نہیں وہ تسلیح ہاتھ میں لیے یہ باتیں کر رہا تھا کہ بر وفیسر عبدالعزیز مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے وہاں آنکے انہیں دیکھتے ہی عدالت کا رنگ فق ہو گیا فوراً اسی ہاتھ باندھ کر کہنے لگا جناب میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس نیک سرشت انسان کی بد دعا کا نتیجہ ہے میں نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا اب سزا بھگت رہا ہوں۔ میں حیران رہ گیا کہ معاملہ کیا ہے؟ بر وفیسر عبدالعزیز بازو سے پکڑ کر مجھے ساتھ لے گیا اور خود ہی مہر سکوت توڑی۔

”آپ بہت دنوں سے پوچھ رہے ہیں کہ میں واقعی سکندر حیات کو قتل کرنا چاہتا تھا تو یہ شخص تمام اصلیت بتا سکتا ہے میں اسی کا شکار ہوں“  
 بر وفیسر کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر قدر سے توقف کے بعد کہا۔

”یہ شخص بڑا بیدرد ہے اس نے سی آئی ڈی کے ایک سپرنٹنڈنٹ (دہلی سپرنٹنڈنٹ جس کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے) کی خواہش یا ایما پر مجھے جیل میں ڈلوا دیا ہے جو کچھ ہوا اس کی تویح ملازمت اور اس کی مجراہ فطرت کے باعث ہوا میرے پاس یہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ مجھے دہلی پولیس نے شہر بدر کر دیا ہے جرم میرا یہ ہے کہ میں نے دہلی میں خاکساروں کو مستلم کیا تھا

بیسویں سال شمار رہا۔ علامہ مشرقی اپنی گرفتاری سے قبل برسے ہاں ٹھہرے تھے یہاں میرا کوئی پرسان حال نہیں آبدیدہ ہو گیا تو میں نے ترس کھا کر اپنے ہاں ٹھہرا لیا ایک دن میرے یہاں پتولی رک گیا دوسرے دن مجھ سے کہنے لگا لائے پتول کہاں ہے میں نے پتول حوالہ کیا پھر کہنے لگا اب سے ایک مردی بات کرنی ہے اور میرے ساتھ چلے باتوں باتوں میں "گلڈ گرے" تک لے آباو ہاں پہنچ کر کہنے لگا میں ذرا اصلی اوٹ میں پشباب کر لوں تم یہ پتول رکھو دو دنٹ گلڈ گرے ہوں گے کہ پیچھے سے سپرنٹنڈنٹ نے لایا تھا ہے اس پتول ہے؟

عبدالستار غائب تھا اخباروں کے مطالعہ اور پولیس کی تفتیش کے دوران پتہ چلا کہ میرے خلاف سکندریات کو قتل کرنے کی سازش کا الزام ہے سفینوں سوچتا رہا آلہ العالمین کیا معاملہ ہے؟

آخر بات کھل گئی کہ یہ جو کچھ برسے ساتھ ہوا ہے عبدالستار کی مہربانی ہے۔

عبدالستار نے سپرنٹنڈنٹ کے آلہ کار کی حیثیت سے کام کیا اس کا کام دورِ رخ تھا ایک طرف وہ سی آئی ڈی کا مجر تھا دوسری طرف ان خدمات کی آڑ میں جرائم کرتا اور روپیہ بناتا تھا اب کئی برس سے نوٹ بنانے میں منہک تھا ناکساروں کی محبہ کی سلسلہ میں اس کا ہر جرم ڈھکا رہا اور نہ پولیس ہی کی نگاہ آدھر گئی لیکن اب قدرت اور قانون دونوں کے شکوے میں آ گیا تھا۔

پروفیسر عبدالعزیز نے اس سالخوردہ شخص کی فطرت کے مختلف گوشے بے نقاب کرتے ہوئے کہا — میں نے جب سردار دیوان سنگھ سے اس سارے واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ سارا قصہ ریاست میں لکھا اور میری بے گناہی کی نشاندہی کرتے ہوئے حقائق سے پردہ اٹھایا انہوں نے لکھا کہ عبدالستار دہلی کا پرانا بد معاش اور غنڈہ ہے اس شخص کا کیریکچر یہ ہے کہ اس نے پولیس کے ایما پر ہندو مسلم فساد کرایا یا اور حرام راستوں سے پیسہ کمایا دیوان سنگھ نے حکومت



تو مچنی چھری بتیں کرتے رہے پھر ذرا اہلانا مہسلانا شروع کیا مطلب یہ تھا کہ تمہارے گھر واسے سخت مالی پریشانی کا شکار ہیں روپیہ کا انتظام بھی ہو جائے گا رہائی بھی ہو سکتی ہے بس فدا بعض ساتھیوں کی خبریں مطلوب ہیں کہ وہ کہا کر رہے کیا چاہتے اور کیا سوچتے ہیں یا مین یہ سنتے ہی ناگ بھیسو کا ہو گیا لال پلایا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا سخت اشتعال کے عالم میں اُس نے کہا۔

”کیا یہ کہہ دینا کافی نہ ہو گا کہ آپ نثرین لے جائیں؟ یہ بات دوبارہ زبان پر لائی تو آپ کی خیر نہیں میں آپ کا گلا گھونٹ دوں گا اپنے ساتھیوں کی مخبری کرنا ایسا ہی ہے جیسا مردار بھائی کا گوشت کھانا۔“

یامین کا غصہ تیز ہو گیا وہی تباہی بکتا اندر آ گیا لحاف اوڑھا اور سو رہا۔ میں نے چھری چھپے یہ جھگڑا خود دیکھا تھا اگلے روز وارڈ میں جلیا آیا تو یامین اُس سے لڑنے لگا کہ ملاقات کرانی کیوں؟

وہ اختلاج کا مریض تھا لیکن آزدہ ہونا اسکی فطرت کے خلاف تھا خود بھی ہنستا دوسروں کو بھی ہنساتا سال بھر میں ایک دن اپنی بٹی کی برسی پر روزہ رکھتا اور چپ رہتا اپنی اس بیٹی سے اُسے بلا کا اُنس تھا وہ بھی ایک قابل اور بہادر لڑکی تھی اُس نے لدھیانہ میں یوہس کے قبضہ سے بھنڈا پھینا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر کی چھت پر گاڑا تھا۔

یامین کی بیماری لا علاج ہو گئی تو سی آئی ڈی نے پانچ سو روپیہ کے ذاتی مچلکے پر چھوڑنے کی پیشکش کی شرط یہ تھی کہ جب تک وہ بیمار ہے سیاسیات میں حصہ نہیں لے گا یا مین نے دو ٹوک انکار کر دیا وہ دُصن کا پکا قول کا سچا اور سیرت کا اُجلا انسان تھا اس کا مکان مدتوں نوآموز انقلابی نوجوانوں کی تربیت گاہ بنا رہا ان سب کے

کھانے پیچے کا انتظام کرنا اور اکثر بڑے بڑے انقلابی اُس کے ہاں آتے جاتے تھے۔

### فرار کا منصوبہ

اس واقعہ کے فوراً بعد سحر گل اور کلپیر سنگھ نے فیصلہ کیا کہ انہیں جیل سے بھاگ جانا چاہیے اس فیصلہ میں مجھے بھی شریک کرنا چاہتے تھے میں نے اختلاف کیا بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ اپنے حوصلہ سے زیادہ کے کام میں شامل ہونا میرے لیے مشکل ہے دوم میں خفیہ سیاسی سرگرمیوں کا قائل نہیں سو مجھے کھلا سیاسی کام زیادہ تر فیاض معلوم ہوتا ہے چہاں ہمیں عدم تشدد کا حامی ہوں میں سمجھتا ہوں کہ پولیٹیکل جدوجہد میں طاقتور حکومتوں کے مقابلہ میں اس سے بہتر کوئی اختیار نہیں، کوئی سیاسی جماعت اختیاروں سے نہیں لڑ سکتی تا آنکہ کوئی سیدہ وئی طاقت اس کی مددگار نہ ہو میرے نزدیک یہ ایک قسم کی غارتگری ہے عدم تشدد صابروں اور عاجزوں کا اختیار ہے تشدد میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ہمیشہ چھوٹے تشدد کو بڑا تشدد جیتتا ہے تشدد کرنے والا خود بچتا چاہتا اور عموماً بچ جاتا ہے تشدد کی خاصیت یہ ہے کہ اسکی بدولت بے گناہ مارے جاتے اور گنہگار بچ جاتے ہیں۔ تشدد جان و مال دونوں کا دشمن ہے بلکہ عزت و آبرو بھی اس کی چھری سے فروغ ہوتے ہیں۔ کلپیر سنگھ اور سحر گل ہمیشہ کوئی نہ کوئی معرکہ رچانے کی فکر میں رہتے ہیں چونکہ ڈیوڑھی میں آتا جاتا تھا لہذا میری یہ ڈیوڑھی لگی کہ سردار انگو دربان سے بات کروں کہ وہ انہیں بھاگ جانے میں مدد دے۔ میں پہلے تو بچر محسب کرتا رہا آخر میں نے جی کڑا کر کے سردار انگو دربان سے بات کی وہ کلپیر سنگھ کی وجہ سے مان گیا لیکن پھر جاتے اُسے کیا خیال آیا کہ منحرف ہو گیا اس نے گریز کیا تو میں بھی طرح

دے گیا۔۔۔۔۔ کلیرنگ امداد سحر گل دونوں بہادر تھے لیکن فرار ہونے کے بعد کچھ کر سکتے تھے اس میں شبہ تھا بھاگتے کے فوراً ہی بعد وہ پکڑے جاتے ہیں تو کچھ دنوں بعد گرفتار ہو جاتے لیکن مقام جیل پر مصیبت آجاتی ایک طویل عرصہ کے بعد سیاسی قیدیوں کو اس وقت جو آرام میسر تھا سلب ہو جانا منگمری جیل سے بدتر حالات پیدا ہوتے پنجاب سی آئی ڈی قیامت برپا کر دیتی بقول چودہری افضل حق پنجاب پولیس ہوا میں مجرم۔۔۔۔۔ سو نگہ لیتی ہے۔ سرانیکل اوڈوائز کو ایک سکھ نوجوان نے اس زمانے میں لندن جا کر مارا تو پنجاب سی آئی ڈی کے دیوتا کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ اس نوجوان نے اپنا نام سردار محمد یریم سنگھ لکھوایا اور عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں نے جلیانوالہ باغ کی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی راجگورو اور سکھ بھائی جیل میں پھانسی دیئے گئے تھے ہم نے اس دن اپنے وارڈ میں بھگت سنگھ ڈے منیا علی الصبح بہت سے ساتھی کلیرنگ کی معیت میں پھانسی گھر پہنچے تختہ پر پھول چڑھائے فوجی انداز میں سلوٹ کیا اور واپس آگئے جلسہ کی صدارت پنڈت کشوری لال نے کی جو بھگت سنگھ کے ساتھی تھے تمام دوستوں نے تقریریں کیں آخر میں مولانا تظفر علی خان کی اُن دو نظموں کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھے گئے جن میں بھگت سنگھ کی شہادت کو سراہا گیا۔ اپنی نظم کا مطلع تھا۔

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق کا جو ست لٹکے!  
تو اُس کے ذرہ ذرہ سے بھگت سنگھ اور دت لٹکے

دوسری نظم کے بعض اشعار یہ تھے ۔

تواناؤں کے بس میں ہے سرپائے حقارت سے  
 ہزاروں ناتوانوں کی متناؤں کو ٹھکرانا  
 ہسا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں  
 کسی کی لغش اٹک کے پار خاک و خون میں تڑپانا  
 زوال اس سلطنت کاٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے  
 بڑا ہو بس کو آب اپنی رسایا ہی سے ٹکراتا  
 الغرض ہم نے یہ دن ایک خاص جوش و غروش سے گزرا اور عہد کیا کہ جب تک  
 ملک آزاد نہیں ہو گا ہم برطانوی سامراج سے اسی طرح لڑتے رہیں گے ۔

### دوجیلر

عام قیدیوں سے انسانی سلوک کے بارے میں بہت کم غور کیا گیا ہے سیاسی قیدیوں  
 کو جو مراعات حاصل ہوئیں وہ نتیجہ بھتیں ملکی جدوجہد کے روز بروز طاقتور ہونے کا یا پھر بھگت  
 سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال نے سیاسی قیدیوں کو مراعات لے دی تھیں۔ اگرچہ  
 حکام نے ان مراعات کو بھی اپنی منتشا کے تابع رکھا لیکن بہمیت کا جو خوف جیل خانہ میں تھا وہ  
 ان نوجوانوں کی جاں نثاری کے باعث ٹوٹ گیا اخلاقی قیدیوں کے حالات بھی بہتر ہوتے  
 گئے باور ہے کہ اس سلسلہ میں عام سکھ قیدیوں نے بڑی جرات اور پامردی کا ثبوت دیا  
 بارہا ڈٹ کر مقابلہ کیا بید کھائے، قواعد توڑے لیکن قیدیوں کی خوراک و پوشاک میں اصلاحیں  
 کرا کے ہی دم لیا لاہور سنٹرل جیل کی بہمیت بہت تھی لیکن ظلم نہیں تھا اور یہی فرق آتے



دوسری جلیوں سے ممتاز کر رکھا۔

بہر حال ان مراعات اصلاحات یا اقدامات سے پہلے قیدیوں کو کبھی انسان ہی نہیں سمجھا گیا ہے۔ ہمیشہ ظالمانہ سلوک ہوتا رہا تھا اب ان کی جان لینا آسان نہیں رہا تھا عام سیاسی بیداری سے پہلے قیدیوں کا رہنا ایسا ہی جیسے کوئی چوہا یا بلی مر جائے بعض شفیق القلوب جلیروں کے قصبے جیل خانوں میں نوک زباں تھے مثلاً خیر دین داروہ کو عام قیدی بری شکر نوحہ کہتے اُس نے اصلاحی قیدیوں کے علاوہ سیاسی قیدیوں پر سخت سے سخت مظالم توڑے تھے چودہری افضل حق مرحوم جیل خانوں کی اصلاحاتی کمیٹی کے ممبر تھے بہت سی اصلاحات ان کی وجہ سے نافذ ہوئیں لیکن چودہری خیر الدین نے ان کے نکلان گورنر کو رپورٹ کر کے نکلوا دیا تھا کہ وہ قیدیوں کو قانون شکنی پر اگسانے میں۔۔۔۔۔ اسی قماش کا ایک حبشیہ گیبان چند پانچ سال قید ہو گیا اُس نے اولڈ سنٹرل جیل ملتان میں ایک بندی کو جان سے مروا دیا تھا۔ مہر صاحب اللہ شاہ اُس زمانے میں وہاں سپرنٹنڈنٹ تھے انہوں نے ہمت کر کے مقدمہ پولیس کے سوائے کر دیا ہائی کورٹ نے پانچ سال قید کر ڈالا وہ بہتر کلاس کے قیدی کی حیثیت سے لاہور منتقل ہو کر آتا تو مہر صاحب اللہ شاہ ہی سپرنٹنڈنٹ تھے ادھر گیبان چند کے زخم خوردہ بیسیوں قیدی لاہور میں پڑے تھے وہ اُس پر آوازے کھینچنے اور گالیاں دیتے اُس نے مہر صاحب اللہ شاہ سے تنکائیت کی کہ تمام قیدی مجھے آنے جاتے کابیاں دیتے ہیں میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے مہر صاحب نے کہا میں کیا کر سکتا ہوں کبھی تم قیدیوں کو گالی دیتے اور پٹیتے تھے اب خود کھا رہے ہو یہ دارالکفایت ہے جو بویا کاٹو، گیبان چند اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔ ایک دن بعض مدیوں نے اس پر ہل بول دیا اور اکتھ ہو کر خوب پٹا سپرنٹنڈنٹ نے بی کلاس بارک سے اٹھا کر حکمتوں میں بھیج دیا۔ قید تھائی اس کے لئے اور بھی عذاب ہو گئی۔۔۔۔۔ سپرنٹنڈنٹ سے کہا مجھے یہاں سردی لگتی ہے

ایک کھیل اُردو بجئے۔ میجر حبیب اللہ شاہ نے جواب دیا جتنے کھیل ایک قیدی کو ملنے چاہئیں وہ تمہارے پاس ہیں گیان چند اپنا سامنہ لیکر رہ گیا دن بھر کھیل میں منہ لپیٹے پڑا رہا جب عبرت کا درق ہو گیا تو قیدیوں ہی نے اس پر رحم کیا یعنی طعن و دشنام سے ہاتھ اٹھا لیا پولیس اور جیل دانوں کے خلاف قیدیوں میں انتقام کا جذبہ فوی اور قدرتی ہوتا ہے۔ اس قبیلہ میں سے کوئی ظالم پکڑا جائے تو قیدی اُس سے بہت بُرا سلوک کرتے ہیں انہی دنوں ایک ہندو نوجوان سب انسپکٹر کسی زیر تفتیش قیدی کو جان سے مار دینے کے جرم میں قید ہو کر آگیا اس کا بھائی لاہور میں پراسیکیوٹنگ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا قیدیوں نے گھیر لیا ایک نے گلے سے پکڑا دوسرے نے بازو دباتے تیسرے نے ملہانچے مارے چوتھے نے تیغے سے ٹھڈا مار کر زمین پر گرا دیا اور منہ پر پیشاب کی دھار چھوڑ کر اپنی بارکوں میں بھاگ گئے میجر حبیب اللہ شاہ سے شکایت ہوتی تو انہوں نے ہنسی میں نال دیا اس کی اکثر کلامہ حال تھا کہ اپیل میں اس کی ضمانت ہو گئی تو رعونت سے وائس بائیں گھورتا چلا جا رہا تھا قیدیوں نے آواز بن دیں۔

”رسی جل گئی مل باقی ہیں؟ ابھی تک اکثر نہیں گئی ہے؟ یاد رکھ پھر پٹیں گے“ لیکن وہ خود کو اب بھی محتسب رہا ہی سمجھ رہا تھا بے ستم شاہینے لگا قیدی بھی جوش میں آگئے انہوں نے یکجا ہو کر وہ مغلظات کہیں کہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل گیا۔

مرافعہ خارج ہو گیا لیکن ورنٹرل جیل واپس نہ آیا اس نے استدعا کی تھی کہ اُسے جان کا خطرہ ہے کہیں اور بھیج دیا جائے اور یہ رعایت اُسے مل گئی۔

### پولیس کے مخبر

پولیس کے مخبروں کا انجام اکثر عبرت آموز ہوتا ہے جو لوگ زندگی بھر اُن کے مخبر

رہے یا مددگار کام نکل جانے کے بعد پولیس نے اُن سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیریں اور سب کوئی ان کا مجربا بد دگار بوڑھا ہو گیا تو پھر اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک بے سہارا لاش سے گورکن کرتے ہیں جو لوگ عام کارکنوں میں مجرب ہوتے انہیں ایک کنیشن کی تنخواہ کے برابر برابر ماہانہ ملتا تھا اور جو اس نذامی مجربا بد دگار ہوتے وہ ایس پی کے سرٹیفکیٹ پر خوش ہو جاتے بلکہ ان کے لئے کو تو ال شہر کا مصافحہ ہی کافی و شافی ہوتا پولیس نے ان مجربوں کی کبھی عزت نہیں کی ایک پولیس افسر نے بتایا کہ وہ ان مجربوں سے کام ضرور لیتے ہیں لیکن ان کی عزت نہیں کرتے اُن کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی بے غیرت اپنی ہمیشہ کو شب باسشی کے لیے فروخت کرتا ہو۔

ہدایت شاہ حسین نے میرے خلاف لاہور کے ایک مقدمہ میں گورنر گرج کے شہادت دہی تھی اس بری طرح خوار ہوا اور اس ذلت کے ساتھ مرا کہ بورت منہ تکنتے رہ گئی لوگوں نے کفن کے لیے چندہ کیا پولیس نے ابک کوڑی تک نہ دی حالانکہ وہ ایک مکمل مجرب اور مددگار رہ چکا تھا جن لوگوں نے اس فن شریفیہ سے وابستہ ہو کر پرواز کی وہ بالابلند ہو کر غضب کا شکار ہو گئے اس سلسلہ کے لوگ ہمیشہ نامراد ہی کا شکار ہوئے بہت سوں کو پولیس کے ہاتھوں بیٹے دیکھا پیسہ اخبار میں محمد شفیع نام کا ایک بد خصلت نوجوان ہو نل کرنا تھا اسکی عادتیں اتنی گندی تھیں کہ اُس کے پاس بیٹھتے اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے عار آتی تھی چونکہ پولیس کا مددگار تھا اس لئے جس شریفیہ کی عزت جاہتا ٹھو کر وہیں اُڑاتا۔

جائے ایک دن کیا درست حال پیش آئی کہ سپہ اخبار کے تھانیدار نے اُسے اُلٹا لٹا کر ننگے چوڑوں پر اتنے جوتے لگوائے کہ سارا علاقہ خبردار ہو گیا آخر اس مارہی کی شدت سے رحلت کر گیا۔



پر ٹھنڈٹ نے پوچھا۔

”کے سال سے باہر نہیں گئے ہو؟“

”یہ سوچتا سال ہے۔“

”تو پھر باہر کی سیر کا انتظام ہونا چاہیے؟“

”جو آپ کی مرضی ہو“

”منہ کھولو؟ تو ہاں! تمہارے دانت خراب ہیں اور نزلہ بھی رہتا ہے میں

آج ہی حکومت کو لکھتا ہوں اس بہانہ سیر ہو جائے گی۔“

— کوئی سبقت عشرہ بعد دانتوں کے لیے ڈنٹیل ہسپتال اور نزلہ کے لیے میو ہسپتال کی

اجازت آگئی۔ ڈنٹیل ہسپتال سنٹرل جیل کے دوسرے سرے پر واقع ہے تاہی مسجد کے پاس بندھے دریا

سے قریب! میو ہسپتال شہر کے وسط میں ہے تقریباً پندرہ دفعہ ڈنٹیل ہسپتال جانا پڑا دانت صحت

کرائے کھوڑوں میں جاندی بھروائی میو ہسپتال میں ڈاکٹر بشیر کے زیر علاج رہا انہوں نے ناک میں

فصد لگایا نتیجہ گندہ خون اور پیپ بہہ گئی یہ تھا علاج یا لاہور کی سیر و سیاحت کا ایک ذریعہ۔ گو

سی آئی ڈی کا ملازم سایہ کی طرح ساتھ رہا لیکن یہ موقع ضرور ملا کہ لاہور کے گمشدہ راستے اور

ادھل گلیاں ایک دفعہ پھر نظروں کے سامنے آگئیں معلوم ہوتا تھا گویا صدیوں کے بعد لاہور

کے کوچہ و بازار اور درو دیوار سے معائنہ ہو رہا ہے۔

### نقشہ نامے رنگارنگ

بازاروں کارنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا ہر طرف دولت کی ریل پیل تھی جنگ نے شہر

کے حسن کی نقابیں الٹ دی تھیں۔ چار سال میں جس چیز نے سب سے زیادہ ترقی کی وہ ترکیورڈ

معاذ شیزامی ہر نیوں کی طرح اُٹھی پھرتی تھیں انہیں دیکھ کر یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ جیسے دودھ شہد اور مکھن کا یہ آمینتہ امیر خسرو کی کہہ مکنیاں ہیں۔ لارنس باغ سے گزرتا تو کتنی ہی صبحیں لکتی ہی شامیں اور کتنی ہی راتیں یاد آجا میں کیا دن تھے ہم لوگ سیاسی وحشت ہی سے ناراض تھے ایسے دن اپنی راتیں اب ان کہانیوں کو حوالہ قلم کرتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔ حجاب اس لیے کہ بڑے انسانوں کی کمزوریاں اُن کا آسٹہ ہوتی ہیں اور غلطیاں تجربہ بھوٹے انسانوں کی کمزوریاں ان کے خلاف فرد جرم بنتی ہیں اور غلطیاں رسوائی کے پھینٹے۔ اردو کے نامور ادیب رشید احمد صدیقی نے اپنی کسی تحریر میں لکھا ہے کمزوروں کو اپنی کمزوریوں کا انکشاف نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ پولیس کی دست اندازی اور ملاؤں کی زبان دلازی سے بچ نہیں سکتی ہیں۔ سیاست میں کیوں کمر قدم رکھا، اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے جس طرح شاخ سے کوئی کونپل ٹوٹ جائے بس اسی طرح مجھے ادبیات سے سیاسی صحرائیں آنا پڑا۔ طعناً میں ایکہ رومانی شاعر تھا مجھے ادبیات میں انہماک کا موقع نہیں ملا ورنہ اس وادی میں ریاض کرتا تو لازماً قدرت میرے قلم کو بہت سی ادائیں بخشی۔ میں سمجھتا ہوں اور یہ کسی آنا کا حصہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بڑا ذہنی سرمایہ بخشا ہے۔ یار لوگ کوچہ جاناں کی طرف نکل گئے اور میں سیاسی بیابان میں چلا آیا۔ کوچہ جاناں میں رہتا تو ادب میرا راہوار ہوتا شاعری مرکب حسن و عشق کے معاملات جس طرح چاہتا اُچھالتا۔ لاہور میرا ادبی گھر تھا۔ راوی کی سیر میں مبرے دل ہر آج تک نقش ہیں بہت سے لوگ راوی کو اس لیے یاد کرتے ہیں کہ اس کے دامن میں آل انڈیا کانگریس نے پہلی دفعہ مکمل آزادی کارپوریشن پاس کیا تھا اور تمام ہندوستان کی سیاسی روح اس کے ذخیروں میں کھچ آئی تھی یا پھر ہمارے انقلابی نوجوان اس کے ڈھکے چھپے کناروں پر ہم بنانے کے تجربے کرتے رہے میرے لیے

راوی ہیں کشش کے اور پہلو بھی تھے انہیں بے نقاب کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اختر شیرانی نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ —

عشق اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے — شاعروں کو دسنائی جانے

اب تو راوی بوڑھا ہو گیا ہے اور یہ احساس خاصا پریشان کن ہے کہ اس کی رگوں میں جوانی نہیں رہی اس کے شاداب کناروں کی رونق مچکی ہے اس کی موجیں جس خرام کی عادی تھیں وہ خرام ہی نہیں رہا۔ آہو چوکڑی بھول گئے ہیں کاران کی بارہ دری منجھمار میں آکر کھنڈر ہو گئی ہے باتیں رنج پر ایک چبوترہ لالاقوں کی چوپال تھا لیکن نہ جانے کہاں ڈوب گیا کشتیوں میں وہ حسن نہیں رہا اب نہ کوئی کنٹیا کسی سے پریم کی ڈوری باندھتی ہے نہ کسی دوشیزہ کو پیمانِ شوق کا احساس ہوتا ہے — ”یارانِ سرپل“ کی ترکیب اردو میں ابھی تک مستعمل ہے حالانکہ اس کو اب تک متروک ہو جانا چاہئے تھا۔ نہ پل رہا نہ یار رہے۔ رہے نام اللہ کا

سنہنٹے دے مجھے اے نوٹسیدی کیا قیامت ہے

کہ دامنِ خیال یار چھوٹا جانے سے مجھ سے

میں نے برسوں راوی کی میر کی ہے اکیلے بھی اور دوستوں کے ساتھ بھی۔ جوانی الٹ ہوئی ہے انسان اس میں سبھی کچھ کر گزرتا ہے ہم نے کوچہٴ معصیت میں تو قدم نہ رکھا بلکہ اللہ کا احسان ہی رہا لیکن اس کے علاوہ جوانی میں جو کچھ ہوتا ہے کر گزرے جوانی کے دن بھی کہاں تھے؛ لڑکپن تھا جوانی سے ہمقدم یا متعانت — لالٹ باغ ہمساری آوارہ گردوں کا دوسرا مرکز تھا بہت سی چاندنی راتیں اس کی آغوش میں گزریں ہمیشہ اس کی شاخیں پکارتی رہیں اس کی مصنوعی مہاڑیوں کے پیچ و خم اشارے کرتے رہے اس

کی پگڈنٹیاں اُن گئے دنوں کی یاد دلاتی تھیں جب مہنریں گیسوؤں کے سائے ان پر مہراں تھے جب زلفوں کے خم کھول کر ہم منزل کو ساز دیا کرتے تھے انہی تمانوں کے سائے میں مٹلے اور مقلے موزوں ہوتے تھے۔

غرض لارنس کی تمام رونقیں اُن خوبصورت یادوں کا عکس تھیں جن یادوں کی فعلیں اس کی روشنیوں پر سرسبز ہوتی تھیں کتنی ہی مسکراہٹیں ان شانوں میں جذب ہیں اور کتنے ہی قہقہے درختوں کی اس قد آوری پر طعن کرتے ہوئے نکل چکے ہیں لارنس گا رڈن جو اب باغ جناح ہو چکا ہے مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے راجکمار یوں کا گوارہ تھا و جدان آج بھی محسوس کرتا ہے کہ یہ دلکشا باغ و لغزب صبحوں سہانی شاموں اور چاندنی راتوں کے خمیر سے تیار ہوا اور ہر لحظہ ترنازہ ہے۔ منگمری ہال اس کے چھٹی رخساروں پر ایک سنگین طمانچہ ہے۔ ہمارے سفید فام حکمرانوں اور اُن کے سیاہ فام گماشتوں نے اپنی شبیہ خلوتوں کے لیے اسے تعمیر کیا تھا وہ ہر رات اس کے شرابی ماحول میں قہقہوں کے غبارے چھوڑا کرتے تھے۔ بریڈلا ہال مٹ گیا لیکن یہ ہال زندہ ہے۔ اُس ہال کے وارث نہیں رہے اس ہال کے وارث باقی ہیں۔ یہ ہال گناہ کی افسرانہ تمکنت کا اظہار ہے۔

ایک دن میوہ ہسپتال سے نکلتے ہوئے میں نے پولیس گارڈ کے اسپنارچ سے کہا۔ ذرا انارکلی بازار سے ہوتے چلو وہ راضی ہو گیا لیکن سی آئی ڈی کے حملہ نرکانہ سے ڈرتا رہا انارکلی کو میں اس طرح تک رہا تھا جیسے کوئی جاں بلب دم واپس درو دیوا پر ٹنگرنگرنگاہ ڈالتا ہو ہمیشہ کی طرح انارکلی میں خاصی رونق تھی اور یہ رونق انارکلی کا طغرائے امتیہ ہے اس روز کچھ اس لیے بھی رونق تھی کہ انیتواں روزہ تھا اور اگلی صبح عید ہو جانے



کا اسکان تھا۔ میں دن ہی میں ہلال دیکھتا چلا جا رہا تھا مگرے سامنے سے بیسیوں ہلال نکل گئے۔ — — —

اب چاہے یا نہ ہو عید ہو گئی

ادھر ادھر عیدیں اڑی پھر رہی تھیں معاشرہ اول ایک آزدہ سوچ میں ڈوب گیا لوگ اپنے لیے عید کا سامان خرید رہے تھے اور میں اُن گلابی تھیروں کی ایک مسکراہٹ بھی ساتھ نہ لے جا سکتا تھا جو ہمیں ویسا سے نکلتے جا رہے تھے یہ مسکراہٹیں ان سیاہ پھانگوں کی متعل ہی نہ ہو سکتی تھیں جو سالہا سال سے ہماری امیری کا سرمایہ ہو چکے تھے کچھ تانیروں کے لیے بیس لکھو سا گیا۔۔۔ سال میں دو عیدیں ہوتی ہیں۔ ۲۵ سے لیکر ۴۵ تک گیارہ برس میں ۲۲ عیدیں چلی ہی میں آئی تھیں۔ مجھے عیدین کا احساس ضرور تھا لیکن یہ احساس بس اسی طرح کا احساس تھا جس طرح پہلو سے دل اڑ جائے تو کنگرہ جاتی ہے پھر وہی کنگرہ کے ٹخنوں میں سما کر غزل ہو جاتی ہے۔

دانت بنوانے کا بہانہ منیدرہاجن راستوں کو بھول چکا تھا وہ سامنے آگئے لوہاری دروازہ سے لے کر موری دروازے تک ہیٹ ہی بدلی ہوئی تھی۔ موری دروازہ کی میونسپل لائبریری کا حلقہ یاراں اُجڑ چکا تھا لہذا موری دروازے سے لے کر بھائی دروازے تک کا باغ ویران تھا۔ کنڈن شاہ کا مزار سالخو وہ بزرگوں کی مختلف منڈلیوں کا مرجح تھا لیکن اب وہاں سناٹا تھا ادھر سامنے باغ میں کانگریس کے بڑے بڑے جلسے ہوتے اور بڑے بڑے لیڈر خطاب کرتے تھے ادھر عقب میں چرسی بھنگی اور اونیونی جمع ہوتے تھے جنہیں صلحہ کاکش، بھنگ کا کاسنہ اور اونیونی کی چپکی دنیا و ما فیہا سے غافل رکھتی بائیں طرف مسجد کی سمت کھاتے بیٹے گھراؤں کے ادھر بڑے اکٹھے ہوتے جہاں نصف ”ن“ طلسم ہو شرباً

اور نصف دن ہیوارٹ شاہ سنی اور پڑھی جاتی تھی۔ اس مجلس کا خاصہ یہ تھا کہ اس میں طرح طرح کے حقے گردش کرتے کبھی کبھار ہم بھی کھڑے ہی کھڑے اس مجلس کو مس آتے تھے۔ کندن شاہ کے مزار سے لے کر نگار سینما تک ایک بڑا ہی خوبصورت باغ تھا جہاں گرمیوں کے دنوں میں مسلمان طلبہ امتحان کی تیاری کرتے غرض بھائی دروازے سے ٹکسانی تک پہلو دریا دوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔

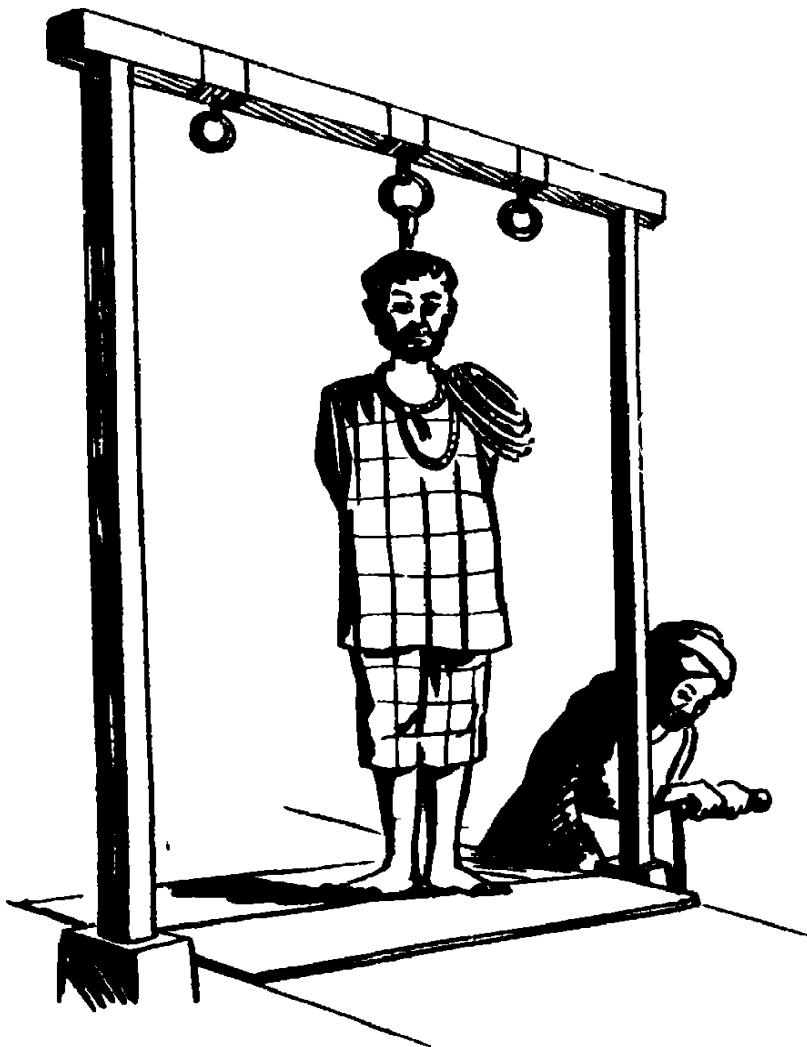
پنجابی کے مشہور شاعر استاد مہدم، استاد عشق لہر، استاد شرم، استاد شرن، استاد کرم، اور ڈاکٹر فقیر محمد انہی باغوں میں مشاعرے رچاتے۔ کبھی یکساں کبھی علیحدہ، ان لوگوں کی شاعری یہیں جوان ہوتی۔ استاد شرم اور استاد کرم امرتسر سے آتے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر گوہر انوالہ سے باقی شعراء لاہور ہی کے تھے کندن شاہ کے مزار سے ملحق رستم زماں گاماں پہلوان کا اکھاڑہ تھا جہاں دونوں بھائی گاماں اور امام بخش اپنے بیٹوں بھتیجیوں اور شاگردوں کے ساتھ ہر روز کسرت کرتے یہ ان کی جوانی اور ناموری کے عروج کا زمانہ تھا ہم انہیں محشر شوق اور مسرت سے دیکھا کرتے تھے۔

ڈنٹیل اور میوہسپتال کی سیر و سیاحت کا ایک ماہ ختم ہو گیا  
تو یہ تصویریں جو ابھر ابھر کر سامنے آ رہی تھیں ایک ایک کی مرحوم یادوں  
کی خواہ گاہ میں چلی گئیں۔

انسان مجرموں میں رہ کر خود مجرم ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے تو محفوظ رکھا لیکن یہ احساس آخر تک چٹکی لیتا رہا کہ ہم لوگوں پر جیسے مسرت کا دور ہی نہیں آیا لڑکپن اسکول میں گذرا اور جوان ہوئے جوان بھی کہاں؟ بس جوانی کی سرحد کو تاکتا

شروع کیا تھا کہ جیل کا پھانگ ٹھل گیا تقریباً ساڑھے دس سال اس فرات کا پانی پیتے رہے  
 نتیجہً لڑکپن نے اپنی عنان بڑھاپے کو سونپ دی۔ جوانی بیچ میں سے اس طرح  
 چھٹ گئی جس طرح کوئی نازنین پہلو جھیرا کر نکل جائے اور آتشکدہ خیال میں حسرتوں کی  
 چنگ رہاں رہ جائیں۔

---



### لدھارام سرکاری رپورٹر

یہ ذکر آچکا ہے کہ جنگ عظیم چھڑنے سے چند روز پہلے سکندر وزارت نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو زیر دفعہ ۱۲۱۔ الف و ۱۲۳۔ الف و ۱۵۳۔ الف اور ۳۰۲/۱۱۷ (تعزیرات ہند) گرفتار کر لیا دفعات بڑی سنگین تھیں ان میں سزائے موت بھی ہو سکتی تھی اور کم سے کم عمر قید اس مقدمہ کا بنیادی گواہ لدھارام پولیس رپورٹر تھا۔ شاہ جی عدالت میں پیش ہوئے تو لدھارام گواہی سے منحرف ہو گیا اس نے کہا میرے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا ہے جس کو اس حالت میں دیکھ کر — میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں اس کے خلاف جھوٹی شہادت دوں۔ میں نے جو تقریریں قلمبند کی ہیں وہ حکومت کے ایما پر تیار کی ہیں مجھے اجازت دی جائے کہ اصل حقیقت کا اظہار کروں — اس بیان نے حیرت پیدا کر دیا۔ تمام صوبہ میں کھلبلی مچ گئی وزارت کے لیے اخلاقی طور پر کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ مقدمہ لاہور ہائیکورٹ

میں منتقل ہو گیا سر ڈگلس بیگ چیف جج جسے خود سماعت کی رہنمائی میں اس کے ساتھ جسٹس دیوان رام لال بیٹھے تھے شاہ صاحب کی طرف سے میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا اور دیوان چمن لال پیش ہوئے میاں صاحب نے لدھارام کی شہادت کو اس طریق سے قلمبند کرایا کہ سکندر وزارت کے لیے جانے رفتن نہ پاسے ماندن کا معاملہ ہو گیا لدھارام کا بیان تھا کہ شاہ صاحب کو بچانے کے لیے گجرات کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے وزارت کے ایما پر اسے یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ شاہ صاحب کی تفریر میں اس قسم کے کلمات شامل کر دیئے جائیں جو ان دفعات کی زد میں آتے ہوں وزارت کے معتمد اولیوں کا بیان تھا کہ لدھارام کو آلہ کار بنا کر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بلیک میل کیا ہے اس کے خلاف سون ستانی کے بعض مقدمات زیر تفتیش تھے اور اسے معطل

کیا جا چکا تھا۔ جب دیکھا چھٹکارا محال ہو گیا اور گلو خلاصی ناممکن ہو گئی ہے تو اس نے یہ لطائف الخیل لدھارام کو ساتھ ملا کر یہ کھراگ رچا لیسے۔ ایک دوسری روایت یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ نے وزیر اعظم کی مہینہ چھٹی اپنے قبضہ میں لیکر لدھارام کو میدان میں لا کھرا کہا ممکن تھا لدھارام راضی نہ ہوتا لیکن سپرنٹنڈنٹ نے جب اس سے کہا کہ رشوت کے ان مقدمات میں وہ بھی مانور ہو رہا ہے تو اس کا زامہ کو انجام دینے کے لیے نیا ہو گیا نتیجہ یہ نکلا کہ برار (سپرنٹنڈنٹ پولیس) حکومت سے معاملہ کر کے پنج رہا لدھارام پھنس گیا اس کو انحراف شہادت کے جرم میں تین سال قید سخت کی سزا ہو گئی اور شاہ صاحب بے گناہی کے باعث رہا کر دیئے گئے۔ لدھارام مختلف جیلوں سے پھرتا پھرتا لاہور آ گیا تو سید امیر شاہ نے شاہ صاحب کے صدمہ میں اس کی مشقت جیل پریس میں لگادی جو ایک اخلاقی قیدی کے لیے سب سے بڑا آرام تھا۔

میں نے لدھارام کو پہلی دفعہ یہیں دیکھا اور یہیں ملا وہ پہلے احاطہ کی دوسری جیا

تیسری بارک میں رہتا تھا گرجوشتی سے نسل گیر ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت کھلنے لگی اس میں برطانوی عہد کے ایک روایتی کانسیٹبل کی تمام خصوصیتیں موجود تھیں چالاک، عیار، خائن، بد معاشر، جھوٹا اور بے اعتبار، سب کو یقین دلا رکھا تھا کہ اُنہی کا ہم خیال ہے۔ ہمیشہ دُور کی لیتا اور گپ مارنے میں آندھی تھا۔ شاہ جی کا نام بیچ کر پیسے کھرے کرنا اور ٹکے کمانا اُس کا شعار ہو چکا تھا۔ بیہادیر شاہ راجپوت، اس کے ہر حیب سے چشم پوشی کرتے۔ بلکہ شاہ جی کی وجہ سے اتنی مراعات دے رکھی تھیں کہ قیدی ہو کر بھی آزاد تھا۔ لیکن اس آزادی کو نہ صرف وہ اپنا حق سمجھتا بلکہ کھلے بندوں اُڑا پھرتا اور اٹھکھیلباں کرتا تھا۔

اُس کے عادات سے بعض ساتھیوں نے مجھے شروع ہی میں آگاہ کیا اور بتادیا تھا کہ وہ ابھی تک کنسیٹبل ہی ہے اس کی عادتیں پختہ ہو کر اس کی فطرت بن گئی تھیں۔ سچ بولنے سے طبعاً محروم لیکن جھوٹ بولنا اُس کا روزمرہ ہو چکا تھا۔ یہ باتیں سُنیں تو مجھے تعجب ہوا بلکہ افسوس کہ ایسا شخص جو اتنا نام پیدا کر چکا ہے اور جس نے اپنے آپ کو ایک دُرولیش پر قربان کر دیا ہے، یہاں تک گرا ہوا ہے کہ اسے مطلقاً احساس ہی نہیں کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچا اور اب کس مقام سے گزر رہا ہے! یہ تمام باتیں افسوسناک ہی نہیں، دردناک تھیں۔ اور کوئی سا شخص جس کے سامنے شاہ جی کے مقدمے میں اس کا حوصلہ و ایثار تھا، یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ عناصرِ راجہ کے اس پیکر میں ایک ایسا شخص بس رہا ہے! ان روایتوں اور حکایتوں کو تجربہ و مشاہدہ کی نرازد میں تو لا تو ٹھیک ٹھیک اس کا وزن وہی نکلا جو دوست بیان کرتے تو یقین نہ آتا تھا۔ حیرت ہوتی کہ آدمی اس حد تک ساقط الاخلاق اور ساقط الاعتبار ہو سکتا ہے!

لندھارام یہاں بھی اڑتی چڑیا کے پرگنتا۔ بتھیلی پر برسوں جاتا۔ آسمان میں تھمکی لگاتا اور ہوا کو مٹھی میں تھامتا۔ اس کا ایک ہی شغل تھا کہ ٹھکانے کرے چغلی کھائے ادھر لگائے ادھر سجھائے۔ اس کی ان حرکتوں سے تقریباً تمام دوست اور ساتھی میزار تھے ایک روز — اُس نے مجھ سے شکایت کی کہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگوچودہری کرشن گوپال دت اور ان کے ساتھی اس سے نفرت کرتے ہیں سبب یہ بتایا کہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگوچودہری کرشن گوپال دت اثنائے مقدمہ میں اُس کے پاس آئے تھے کہنے لگے ایک مسلمان کے لیے اپنی زندگی برباد نہ کرو میں نے انکار کیا تب سے مخالف ہو گئے ہیں میں نے ڈاکٹر صاحب سے بوجھائو انہوں نے کہا بہ شخص جھوٹا ہے۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا اُس نے جو کام کیا ہے وہ سید عطاء اللہ شاہ کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی اور سرٹنڈنٹ کی حفاظت کے لئے کیا ہے چودہری کرشن گوپال دت سے چونکہ میں نے بولتا بند کر رکھا تھا لہذا اُن سے وریانت تو نہ کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے بارے میں بھی اس نے جھوٹ بولا ہے شاہ صاحب نے لندھارام کی بے حد مدد کی اپنے مریدوں اور معتقدوں سے اتنا روپیہ دلویا کہ عمر بھر کے لیے کافی تھا لیکن اس کو اُس نے اب کاروبار بنا لیا سارا روپیہ لہو و لعب میں لٹاتا رہا وہ عیبوں کا مرتع تھا جب اس نے لوگوں کو خود ٹھگنا شروع کیا تو شاہ جی نے ہاتھ اٹھالیا آخر کار وہ ایک ٹھگ ہو گیا اُسے یاد نہ رہا کہ وہ کس بلندی پر پہنچا تھا اور اب کس تیزی سے گر رہا ہے۔

دہلی کے مسلمانوں نے ہاتھی پر اُس کا جلوس نکالا ہزاروں روپے اکٹھا کر کے دیئے لیکن وہ ہر چیز بھول گیا اس کی ٹھگی کا یہ حال تھا کہ عادی مجرم ہو گیا۔ عام رضا کاروں سے آٹھ آٹھ آنے لے جاتا اب دن مولانا منظر علی انہر سے ان کی لوٹی مانگ کر لے گیا ان



سے کہا میری اہلیہ بیمار ہے مجھے گاؤں جانا ہے میرے پاس گرم کپڑا نہیں کل ہی واپس کر دوں گا  
 لوتی بازار میں مندر وخت کر دی اور جو رقم ملی جوئے میں ہار دی بہاولپور کے راشن ڈیپارٹمنٹ  
 کو فروغ دیا جعلی کاغذات تیار کئے لیکن بروقت پکڑا گیا آخر شاہ صاحب کی سفارش  
 پر۔ ماہ ہو گیا۔ غرض یہ اُس کا ہر روز کا دھندا تھا۔ جیل میں اُس نے کمیونسٹوں سے دوستی  
 گانتھی اور نظریہ ظاہر اسنی کا ہو رہا۔ سید امیر شاہ (جلیل) نے شاہ صاحب کی وجہ سے اُسے  
 پریس میں لگا دیا تھا لیکن اُس نے وہاں بھی کرب دکھانا شروع کئے پریس کے گودام  
 سے کاغذ کے ریم چراتار ہا ہر روز ایک دو ریم چوری کر کے کمیونسٹوں کو دیتا وہ اس سے  
 کاپیاں بناتے اور استعمال میں لاتے تھے کاغذ زیادہ ہوتا تو باہر پارٹی کے دفتر میں بھجوا  
 دیتے۔ ایک دن اُس نے نہایت اعلیٰ کاغذ کے بہت سے ریم چوری کیے پریس کی  
 دیوار سے کوٹ موٹ کی طرف پھسکے وہاں سے اشتراکی دوست اٹھا لائے یا مین کو پتہ چلا  
 تو اُس نے شور مچا دیا کہ سارا مال کمیونسٹ ہی کھائے جا رہے ہیں میں ابھی سپرنٹنڈنٹ کو  
 اطلاع کرتا ہوں کمیونسٹوں نے ہاتھ جوڑنے شروع کیے خود لدھا رام بھاگ بھاگ آیا۔  
 ہاتھ باندھے الغرض مال غنیمت سب میں تقسیم ہوا۔

چوری کا یہ کاغذ لال ڈھنڈورہ میں بھی لگتا رہا پنجاب سی۔ آئی۔ ڈی کو اپنی ذہانت  
 فطانت پر بڑا ناز تھا اُس نے سر توڑ کوشش کی کہ سائیکلو سٹائل مشین پکڑے یا اس امر  
 کا سراغ لگائے کہ لال ڈھنڈورہ آتا کہاں سے ہے؛ مگر آخر وقت تک ناکام رہی۔  
 لال ڈھنڈورہ ایک عرصہ تک ٹیرسٹ وارڈ میں سائیکلو سٹائل ہوتا رہا۔

پھر جیب کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں میں جنتا کی جنگ کے مسئلہ پر کھلا تقادم و اختلاف  
 ہو گیا تو یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑا کیوں کہ اب اُس کے انشا۔ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یہ کہنا

مشکل ہے کہ سپرنٹنڈنٹ یا جلیہ اس سے آگاہ تھے یا نہیں؟

جب بہت سا کاغذ نکل گیا اور بڑھیا کاغذ گودام میں نہ رہا تو لدھارام نے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ ورکس مینجیر کو شبہ ہو رہا ہے اور چکنگ پر مصیبت پڑنے کا امکان ہے آگ کا ایک توڑا کاغذوں کے ڈھیر میں رکھ دیا یہ توڑا ابتداء سے شام سے آدھی رات تک سلگتا رہا جب رات تباہ کرا پہنچی تو گودام کو آگ لگ گئی یکایک ستور سے شعلے نکلے اور پھیل گئے تمام جبل میں گھڑیاں کھڑکنے لگے قیدیوں کی نمیدیں ہوا ہو گئیں لاہور سنٹرل جیل کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ نصف شب کو اس کے دونوں پھاٹک بیک وقت کھلے اور آگ بجھانے والا اجن اپنے ستور وغل کی طغیانوں کے ساتھ اندر داخل ہوا لدھارام یہاں بھی بچ نکلا اس نے دفتر کے اہلکاروں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور بیان دیتے ہوئے کہا کہ فلاں فلاں آفسیر نے کاغذ کی چوری چھپانے کے لیے آگ لگوانی ہے اس سے اندازہ کر لیجئے کہ لدھارام کیا بنے تھا!

### روپ اور بروپ

گاندھی جی کی تحریک میں ایک خوبی تھی کہ کھدر نے ایک طرح کی یکسانی پیدا کی لباس سے بھی انسانی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے اس سے گو باطن نہ بدلا لیکن ظاہر میں یک رنگی سی پیدا ہو گئی اس یک رنگی نے عام کارکنوں کے احساس کہتری کو بھی دبا دیا بعض لوگ کھدر کی تحریک کا مذاق اڑاتے رہے اسے دیہاتی گنواروں کا لباس کہا لیکن کھدر پہنوں کی تحریک نے بڑا کام کیا۔ مثلاً

۱) انگلستان کی بلوں سے جو کپڑا آتا تھا ہندوستان میں اس کی مانگ اور کھپت

کم ہو گئی تو انگلستان میں ہندوستان کی قومی تحریک کے لیے توجہ پیدا ہوئی  
 مانچسٹر اور لنکا سٹار کی بلوں کی آمدنی گھٹنے سے کارخانہ داروں میں اضطراب پیدا ہوا  
 مزدوروں کی اُخبرتوں میں کمی ہونے لگی بیکاری کا دروازہ کھلا نتیجتاً تاجروں اور  
 آجروں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ ہندوستان کی سیاسی تحریک سے سمجھوتہ کرے۔  
 (۲) ہندوستان کے لاکھوں کچھڑا بننے والوں کو روزگار ملا جو لابیوں کی مانگ  
 بڑھ گئی۔

(۳) لباس کی یکسانی سے ہر شخص میں برابری کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔  
 لیکن طبقاتی امتیاز معاشری زندگی کے دو سنگین نام دواتر میں باقی رہا جن لوگوں  
 کے پاس دھن دولت تھی وہ ننگوں میں اسی ٹھاٹھ سے رہتے جس ٹھاٹھ کے خلاف  
 احتجاج کیا جاتا تھا سر پہ دوپٹی، نیچے دس سے چالیس ہزار روپے کا موٹر، کوٹھیوں میں  
 نوکر جا کر دسترخوانوں پر شاہانہ بھوجن عرض ان کے ہاں اسراف و نذیر کا پورا جلوہ  
 پایا جاتا تھا یہی نظارہ جیل میں تھا۔ غریب کارکن چکیاں پیتے، بان بٹتے، کولہو چلاتے،  
 نراسر میں جیتتے، مہینوں قید تنہائی میں رہتے اور انتظار کرتے کہ ان کی خوشی کا  
 درج کب طلوع ہوگا؛ لیکن امراء کے لیے جیل میں بھی عیش تھا، ہر عوان کا عیش،  
 دباؤ، ان چین لال سینل جیل گجرات میں تھے نوہر بعد ان کا نوکر لاہور سے ان کے بے مٹی  
 کے گھرے میں پانی لے جاتا تھا۔ یہاں افتخار الدین پونڈروں کے رئیس تھے ایک  
 نو انہیں ہر جگہ پارٹی بنانے میں مزہ آتا دوسرے دولت کا اظہار ان کی عادات متمزہ میں  
 داخل تھا انہوں نے کمیونسٹ کارکنوں کو جیل میں خوب نوازا دوسرے نمبر سے روز دعوت  
 کرتے اور گھر سے طرح طرح کے کھانے منگواتے اس سے ان کی شاہانہ فیاضیوں

کا اظہار ہوتا تھا اپنی دولت کو وہ قومی خدمت کے بجائے سیاسی رشوت کے لیے استعمال کرنے  
تھے وہ سمجھتے تھے کہ سبھی کچھ روپیہ ہے اور اس کے بل پر وہ ہر چیز خرید سکتے ہیں حتیٰ کہ  
لیڈری بھی ان کی لیڈری روپے کی نمود و نمائش سے پر دان چڑھی اور اسی کے بل پر کیش  
ہو گئی لیکن اسی کے ہاتھوں وہ رحلت کر گئے ان سے سیاسیات میں ایک رونق ضرور تھی۔  
ان کے گھر سے اتنا پھل آنا کہ بہت سا بچ رہتا اور غلاظت خانہ میں پھینکنا پڑتا۔ یہی حال  
سیٹھ سردار بن کا تھا جو لوہے کی چور باراری کے تاجر تھے اور لاکھوں روپیہ کے مالک تھے  
ان کے ہاں سے ہر روز مٹھائی آتی اور دوستوں میں تقسیم ہوتی لیکن سی کلاس کے بعض نوجوان  
جو کانگریس ہی کی تحریک میں نظر بند ہو کر آتے تھے اس طبقاتی گھاؤ پر چڑھتے تھے سردار بن  
میں غصہ بانگل نہیں تھا انہماں نرم گفتار تھے وہ کسی لیڈر کے نائب ہو سکتے تھے لیکن  
خود لیڈر نہیں بن سکتے تھے وہ ایک سیٹھ تھے ان کی بھی کمزوریاں تقسیم ملک کے بعد ان کی  
سیاسی چپا کا نوشتہ بن گئیں اور وہ ہمیشہ کے لیے اس وادی پر خار سے نکل گئے۔  
مہاشہ ویریندر مہاشہ کرشن کے بڑے بیٹے تھے وجہیہ نندرست نیز و طرار ان  
کے پنا انگریزوں کے مقابلہ میں پکے میٹلسٹ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پکے ہندو تھے یوں  
کہتے کہ وہ ہندو احساری تھے یعنی انگریزوں کے مقابلہ میں میٹلسٹ اور ہندوؤں کے مقابلہ  
میں مسلمان لیکن ویریندر میٹلسٹ اور کمیونزم کا حد اوسط تھا۔ اس میں باپ کی سی قابلیت  
اور ذہانت نہ تھی اور نہ انا تحمل و ضبط ہی تھا لیکن وہ باپ کی طرح مغرور بھی تھا مزاج میں  
اگر کسی قدر ترستی یا لمخنی تھی تو طبیعت کے اعتبار سے باغ و بہار تھا اس کا خیال تھا کہ اس کے  
نیشنلزم پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ مہاشہ کرشن  
کا بیٹا ہے کانگریس کے پنجابی نیا اس کو پنجاب کا نہو کہتے لیکن اس کو یہ احساس بھی

تھا کہ وہ موٹی لال کا بیٹا نہیں عدتہ اس کی نشت پر کوئی گاندھی ہے۔۔۔ اس کا مد مقابل پر بودہ تھا دونوں میں اختلاف تھا ویرینڈ کو پیچہ کھاتہ اور پر بودہ ستیہ پال گروپ میں تھے پر بودہ کو اس کے احباب پنجاب کا سبھا ش بوس کہتے بظاہر یہ ایک مذاق تھا لیکن دوستوں میں چل لکلا لطف کی بات یہ ہے کہ ویرینڈ ہنر و نہ بن سکا صرف اخبار نویس ہو کر رہ گیا لیکن پر بودہ کو سباسیات میں ہنر و کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لیے انہی کا ہو گیا۔

### غذا اور دوا

کاگرس کے تمام بڑے بڑے لیڈر گجرات سپیشل جیل میں تھے بلکہ جتنے اسے اور بی کلاس کے کاگرسی لیڈر تھے انہیں وہاں رکھا گیا ڈاکٹر گوپی چند بھارگو بیماری کے نام پر گجرات سے لاہور آگئے تو پھر یہیں ٹک گئے بیماری انہیں کوئی ضرور تھی لیکن کیا تھی؟ یہ کہنا مشکل ہے! وہ آتے تو ان کے ساتھی بھی گجرات سے آگئے حتیٰ کہ لاہور سنٹرل جیل غیر مشخص بیماریوں کے تندرست مریموں کا ہسپتال بن گیا ایک کے بعد دوسرا چلا آ رہا تھا بیشتر لاہور اگر لاہور ہی کے ہو جاتے ان کے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا لیکن بعض بے سہارا لوگ جو واقعی بیمار تھے لاہور آتے۔ کچھ دن ٹھہرتے اور واپس چلے جاتے۔ ان بیماروں ہی میں یامین ڈار کے بھانجے مولوی عبدالغنی لدھیانوی بھی تھے جو ہفتہ کے اندر اندر لوٹا دیتے گئے خطا یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کے سخت مخالف تھے ان صحت مند بیماروں کو ہر روز جو خوراک ملتی وہ بلا مبالغہ سولہ اور بیس روپے کے درمیان ہوتی۔۔۔ بیش قیمت دوائیں مہیا کی جاتیں۔

میں کوئی نین سو ایتن سال منٹگری نٹرل جیل میں رہا وہاں ایسی خوراک ملتی رہی کہ  
صحت کی دہواریں ہی چھٹے لیں بدن سوکھ کر کانٹا سو گیا بھوک ہڑال نے تندرستی کی تمام  
عالمیوں کو مجروح کر دیا تھا ہاں سپرٹنڈنٹ نے میرے لیے جو خوراک مقرر کی اسی سے  
اندازہ کر لیجئے کہ ان بڑے رہنماؤں کو کیا ملتا ہوگا۔

ایک	_____	چوزہ برائے شورما
آدھ سیر	_____	گونسٹ برائے بچنی
ایک	_____	ڈبل روٹی
آدھ سیر	_____	چاول
ایک پاؤ	_____	آما
دوسر	_____	دودھ
آدھ سیر	_____	دہی
تین پاؤ	_____	انگور
ایک درجن	_____	میٹھے
چار عدد	_____	لبین
ایک درجن	_____	سوڈا
دو چھٹانک	_____	کھن
دو چھٹانک	_____	گھی
فی ہفتہ ایک ڈبہ	_____	گلوکوز
فی ہفتہ ایک ڈبہ	_____	دلیہ

جال

ہر روز ایک پکیٹ

موسم کے مطابق پاؤ بھر خوبانی آدھ سیر آم اور آدھ سیر آلو بخارہ بھی ملتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ چارٹ میرے معدہ کی برداشت سے باہر تھا میں خوراک کا جگوڑا ہوں ایک دن کی خوراک ہفتہ بھر کی خوراک سے بھی زیادہ تھی تمام راشن مشترکہ کمپن میں جاتا تھا اور وہاں سے مجھے بھی وہی خوراک ملتی جو سبھی ساتھی کھاتے تھے میں کھانے پینے کا زیادہ توفیق نہیں سوکھا پھیکا جو ملا جب ملا کھالیا بندانے اس معاملہ میں مجھے قناعت بخشی ہے جو چیزیں لوگوں کو مرغوب ہوتی ہیں مجھے ان سے کوئی رغبت نہیں انسان غذا کا غلام ہو کر گھاٹے میں رہتا ہے میرے لیے بادشاہ کا دسترخوان اور قیدی کی روکھی بھکی روٹی یکساں ہیں۔

### طبقاتی احساس

طبقاتی احساسات مجلسی و معاشی تفاوت کے ان سنگین تجربات کا نتیجہ ہیں جو انسان کو روزمرہ کی جدوجہد میں حاصل ہوتے ہیں مارکسزم عملاً کوئی مشکل فلسفہ نہیں ممکن ہے منظر آ مشکل ہو بہر حال عملی زندگی میں یہ بہت جلد سمجھ میں آتا ہے سرمایہ دار سوسائٹی کی مخصوص عادات ہیں وہ ان عادات کو ایک لحظہ کے لیے بھی ترک نہیں کر سکتی چونکہ اس فلسفہ کے حسن و قبح پر بحث کا یہ عمل نہیں اس لیے یہاں اس کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لانا عیب ہے مروجہ جو دہری افضل حق کہا کرتے تھے ایشیا ریٹہ سرمایہ دار رجعت پسند سرمایہ دار سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ تجربہ نے یہی ثابت کیا اور اپنی آنکھوں سے اس کے برگ و بار دیکھے سرمایہ دار کسی طبقہ کسی فرقے کسی جماعت کسی گروہ اور کسی مذہب کا ہوزہ پرائیوں ہی سے نہیں اپنوں سے بھی نفرت کرتا ہے وہ غریبوں سے الگ رہنے ہی میں

عافیت دیکھتا ہے غریب کے مقابلہ میں اس کو یہ خصوصیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا کلچر رکھتا ہے جس میں قول کی نرمی ہوتی ہے لیکن عمل کے لحاظ سے وہ ایک ظالم قسم کا انسان ہے۔

### میاں افتخار الدین

مثلاً میاں افتخار الدین سیاسیات میں پہلو دار انسان تھے جہاں تک خود اعتمادی کا تعلق ہے وہ ان میں سرے سے محی ہی نہیں وہ اپنے ساتھیوں پر بھی شبہ کرتے تھے۔ جس بت کو تخلیق کرتے خود ہی نوڑ دیتے اپنے ہر فعل کو انہوں نے اپنی دولت کے زور پر جائز ٹھہرایا تھا انہیں کبھی اس کی پروا نہیں رہی کہ وہ کیا کرتے ہیں یا لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں وہ یہی سمجھتے تھے کہ میری دولت اور ترقی پسندی کا نعرہ یہ دونوں میری شخصیت کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہیں وہ غریبوں سے ہمدردی کا لاگ بڑی اونچی سر میں چھڑتے تھے لیکن ان کا درواں میں بالکل مفقود تھا۔

اُن میں یہ کمال تھا کہ انسانی فطرت کے ہر پہلو سے فائدہ اُٹھاتے۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمن کو الراجی برادری کے نام پر متاثر کر رکھا تھا جو ان کو ترقی پسندی کے روپ میں دکانگرس کے ہر گروپ سے سمجھوتہ کرتے اور توڑتے رہے مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں اُٹھایا اور بہت دور لے گئے جو ابرلال نے انہیں اپنا بازو بنا لیا لیکن ان کی سیاسی فطرت کو تہہ ر ہی نہ تھا انہیں بھی چکھ دے گئے وہ ایک ہی رات میں سب کچھ بن جانا چاہتے تھے ان میں جاگیر دار طبقے کی وہ ساری خوبیاں اور برائیاں موجود تھیں جو انہیں قومی سیاست کے اس مقام پر نہ لے جا سکیں جس مقام پر وہ جانا چاہتے تھے۔



اصل میں جو کچھ تھے اس میں اُن کی اپنی کوئی خطا نہ تھی وہ گرد و پیش کی بوائے بھیروں کا رد عمل تھے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور اکلوتا ہی رہنا چاہتے تھے وہ ممبر منتخب ہونے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے اور دوڑوں کی خرید و فروخت جائز سمجھتے تھے وہ پارٹی کی طاقت اور اپنی شخصیت سے نہیں اپنی دولت کے زور پر منتخب ہوتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جس طرح چاہتے اور جو چاہتے مگر گذرتے نتیجتاً انہوں نے اپنے گرد و پیش دولت اور نظریے کی اساس پر ایک حلقہ پاراں پیدا کر لیا تھا اور دونوں ہی ایک دوسرے کے غمگین تھے۔

میاں صاحب کو ستائش کاروں کی ضرورت تھی اور ستائش کاروں کو میاں صاحب کی وہ خلقی طرد پر ایک بڑے زمیندار تھے۔ آنکھیں کھولیں تو مولوی دیدار علی کی مشیخت کے ہتھے چڑھ گئے مولوی صاحب لاہور کی بریلوی جماعت کے سردار تھے میاں صاحب نے لمبی سی داڑھی رکھ لی تب فرض ہی نہیں تہجد بھی پڑھتے اور میلاد کی مٹھلیں بچاتے تھے چونکہ مذہب کی جس دکان پر گئے تھے اس کا مال خالص نہ تھا اس لیے رد عمل ہوا اور میاں صاحب کیونٹ ہو گئے پہلے ان کی خدا پرستی کا یہ حال تھا کہ اپنے مرشد کی ذات میں خدا کا جلوہ دیکھتے تھے اب ان کی بغاوت کا یہ عالم تھا کہ خدا کو خدا ہی نہیں مانتے تھے وہ عملاً تو نہیں لیکن ذہناً کیونٹ ضرور تھے اور ایک کیونٹ کی اساس یہ ہے کہ وہ مادی ہو اور مادی ہونے کے لیے دہریہ ہو یا ضروی ہے جو کیونٹ یہ کتاب ہے کہ وہ مارکسزم کو بھی مانتا ہے اور خدا کو بھی وہ جھوٹا ہے باوہ کیونٹزم میں کاملاً دستگاہ نہیں رکھتا پھر اپنے نفس کے علاوہ مخلوق خدا کو فریب دیتا ہے کیونٹزم کا ایک ہی نعرہ ہے زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔ یہ الگ بات ہے کہ میاں صاحب خود ایک سرمایہ دار تھے اور آسمان سے خدا کو نکالنا اُن کے لبس میں

نہ تھا۔ ان میں بلاشبہ بعض خوبیاں بھی تھیں مثلاً وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اُس طبقہ کی عالم آسٹکار برائیوں سے اونچے تھے وہ ایک عیاش انسان بالکل نہیں تھے اُن کا عیش یہ تھا کہ وہ چوپال پر سبڑاٹانے کے بجائے سیاست میں چونچیں لڑایا کرنے اور چلیں دکھاتے تھے وہ مجموعہ امداد تھے مسلمان بھی تھے اور دہریہ بھی۔ کمیونسٹ بھی تھے اور لیگی بھی۔ سرکار کے درست بھی اور دشمن بھی۔ اپوزیشن کے لیڈر بھی اور حزب اقتدار کے خوشہ چیں بھی، کہا جاتا ہے انہوں نے اپوزیشن کو تقویت بہم پہنچائی لیکن حقیقت اُس کے الٹ ہے انہوں نے اپوزیشن کو اپنی ذات میں مرتکز کیا نئی قیادت کو ابھرنے سے نہ دیا بلکہ کپل ڈالا مولانا حبیب الرحمن دھیانوی نے چودہری افضل حق کو بارہا زور دیا کہ وہ میاں افتخار الدین کو احرار میں لے لیں۔ چودہری صاحب نے ہمیشہ انکار کیا۔ جب مولانا حبیب الرحمن کا اصرار بڑھا تو چودہری صاحب نے فرمایا۔

”مولانا! معاف کیجئے یہ سرمایہ دار خزیوں کی جماعت میں کھڑا ہونے کی جگہ بنا لیں تو غریب احساس کمتری کے باعث بیٹھنے کی جگہ خود خالی کر دیتے ہیں اور جب بیٹھنے کی جگہ مل جائے تو صدارت خود آگے بڑھ کر ان کے پاؤں چوم لیتی ہے افتخار الدین کا صحیح مقام کانگریس ہی ہے کیونکہ وہاں اس قسم کے لاڈلے بچوں کے لیے بڑی گنجائش ہے۔“

میاں صاحب نے احرار سے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ انتقام لیا ان کے نزدیک احرار کنگلوں کا ایک گروہ تھا وہ کانگریس ہائی کمانڈ سے کہتے رہے کہ احراز اسلام کا نام لے کر پنجاب میں قومی تحریک کو پیدا نہیں ہونے دیتے اس کے راستہ میں مزاحم ہیں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمن کو پیش کش کی کہ احرار کانگریس میں آجائیں تو وہ انہیں صوبہ

کا گرس حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ میاں افتخار الدین نے سنا تو ڈائٹری گروپی چند کی معرفت سردار پٹیل سے رسم درواہ پیدا کر لی اور اس ہوشیاری سے پیچ لڑا یا کہ جو ابرہلال کی بیل ہی منڈی نہ چڑھی۔ چودہری افضل حق گذشتہ پتھر بوں کی بناء پر ویسے ہی اس چیکسٹن کے غلام تھے عزیز یہ تجویز مولانا حبیب الرحمن تک رہ گئی سب میاں صاحب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو وہاں بھی احسار ہی کو ہدف غلام بنا یا پاکستان بن جانے کے بعد کوڑا کرکٹ جمع کر کے اپوزیشن کو اپنی ذات کا محور بنایا لیکن یہ محور ہی غلط تھا اپوزیشن کیا بنتی؛ میاں صاحب نے یہاں بھی احسار کو — اندر خانہ — تباہ کرنا چاہا وہ بظاہر تھی کہ احسار زعماء اتنے قد اور اور عظیم تھے کہ میاں صاحب کا سیاسی چراغ ان کے مقابلہ میں روشنی ہی نہ دے سکتا تھا وہ ان کی صف میں شریک ہو کر یا انہیں اپنی صف میں لا کر عوامی مقبولیت کے لحاظ سے دوسرے درجے میں رہ جاتے تھے۔

میاں صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ ایک ہی جماعت کے ارکان کو آپس میں بدگمان کر دیتے ان کا یہ کمال جبل میں بھی اُنکے ساتھ رہا جن لوگوں میں سیاسی قیدی ہونا وحدت کا سب سے بڑا نشان تھا اور وہ اس اصل کی بنیاد پر اکٹھے تھے میاں صاحب نے اپنی دوغلی باتوں سے اس وحدت کو توڑ ڈالا دولت کی نمائندگی کی آخر کار ایک اختلافی خط کھینچ کر چلے گئے نتیجتاً ایک ہی کشتی کے اُن سواروں سے اخلاص رخصت ہو گیا اور وہ بکھرے ہوئے دالوں کی طرح ہو گئے عزیز میاں صاحب اس فن کے ماہر اس میں اتار د اور چابکدست تھے۔

### سرمایہ داری کی سوج

یہ ایک المیہ ہے کہ جن غریب اور مخلص نوجوانوں نے قومی تحریکوں میں حصہ لیا وہ برطانوی

حکومت کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہے اس وقت نے بے شک ان نوجوانوں میں سیاسی غلامی کے خلاف نبرد آزمانی کا جذبہ پیدا کیا اور وہ جذبہ ایک تحریک بن گیا لیکن طبقاتی شعور ان سرمایہ داروں کی روش نے پیدا کیا جو ان تحریکوں میں آگھے تھے یہ ایک حادثہ ہے کہ بیسیوں نوجوان اس تفاوت کے ہاتھوں پیٹ گئے بعض جاں ہار ہو گئے بعض بددل ہو کر کنارہ کر گئے مسلمان سرمایہ داروں کی بہ نسبت ہندو سرمایہ داروں میں ایک قومی روح پیدا ہو چکی تھی وہ اپنے طبقاتی منہ کے پیش نظر مجبور تھے کہ کانگریس کا ساتھ دیں کیونکہ جو انقلاب آ رہا تھا اس میں اسی طبقے کا مفاد مضمر تھا اس کے برعکس مسلمان سرمایہ دار سرمایہ دار کیا جاگیر دار (الاشاہ اللہ) ابھی تک اٹھارویں اور انیسویں صدی میں رہ رہے اور اپنے حزب مفاد کے غلام تھے یہی مفاد اسلام کے ضعف اور مسلمانوں کے انحطاط کا باعث ہوا۔ غرض اسلام کی حقیقی روح سرمایہ داری کے ہاتھوں پامال ہو گئی یہی پامالی نوجوانوں کی مذہب سے برگشتگی کا باعث بنی اور حقیقی مذہب کی جگہ رسوم و رواج کا مذہب آ گیا مسلمان اُمراء نے مسلمان عسربار کو سیاسی زندگی میں ابھرنے ہی نہ دیا جن مسلمانوں نے انگریزی حکومت کے خلاف لگاتار جدوجہد کی جب تک انگریز رہا وہ ان سیاسی اُمراء کی سزاؤں کا شکار رہے انگریز چلا گیا تو اسکے جانشینوں نے چننے ہی نہ دیا بلکہ ان کی عزت و آبرو کے دشمن ہو گئے۔

ہندوستان کو آزادی یونہی نہیں ملی لاکھوں نوجوانوں نے قیمت ادا کی ہے گاندھی جی ایک عظیم المرتبت لیڈر تھے انہوں نے ستیہ اور اہنسا کی طاقت سے برطانوی حکومت کو ہلا ڈالا یہ ان کا اعجاز تھا کہ سلیکٹوں نوجوان ملک پر قربان ہو گئے خون دینا، پھانسی پر چڑھنا، گولی کھانا، دولت لٹانا اور قید ہونا کھیل نہیں یہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں قدرت نے عرصہ اود یعتین دیا ہو۔ ایک دفعہ کچھ مسلمان نوجوانوں نے مولانا آزاد سے پوچھا "ہندو نوجوان اور

ہندو لڑکیاں گولی کیونکر چلا تیں اور ہم کیسے پھینکتی ہیں؟ مولانا نے ہنس کر فرمایا میرے بھائی یا ایمان دل کی حمیہ ہے کسی دوکان سے مل سکتا تو ضرور بتاتا۔“

### آزادی اور مسلمان

مسلمان نوجوانوں نے قربانی و استقامت میں کمی نہیں کی لیکن انہیں ارادۂ ختم کیا گیا ۱۸۵۷ء کی تحریک کے تنازعے فی صد جانناز مسلمان تھے اس کے بعد علماء کی مختلف تحریکیں اور مجاہدین سرحد کی جہڑ میں کچھ کم دلولہ انگیزہ تھیں جہاں نثاری کا اعلیٰ نمونہ تھیں تحریک خلافت میں مسلمانوں نے کس دلیری سے حصہ لیا کیا کچھ نہیں لیا یہی حال ہو پلا تحریک کا تھا سرحد کے سرخپوش اور پنجاب کے احرار کتنے جگہ دار تھے کتنے ہی مسلمانوں نے جلیانوالہ باغ میں جانیں دیں خاکسار نکلے قہید سنج کا ہنگامہ اٹھا ختم نبوت کے پروانے آئے ذرا سوچیے جن لوگوں نے ان تحریکوں میں حصہ لیا اور فنا ہو گئے وہ کیا ہو گئے؟ افسوس انہیں تاریخ نے اس لیے گم کر دیا اور اپنے تذکروں میں جگہ نہ دی کہ ان کشتگانِ حریت و ایثار کا ایک ہی جرم تھا کہ مسلمان تھے اور جن کے ہاتھ میں قلم ہے وہ ان کا ذکر اس لیے نہیں کرتے کہ انہیں اپنے ماضی کے سوا ہونے کا اندیشہ ہے سنگدلی کے ایک ہجوم نے ایثار پیشہ مسلمانوں کو تباہ کر دیا تفصیلات بڑی ہی لرزہ خیز ہیں لیکن ان کے اظہار کا یہ عمل نہیں بھگت سنگھ ہندوستان کا ایک نامور فرزند تھا اس نے جان لیکر اور جان دیکر ملک کی سیاسی زندگی کو رونق بخشی لیکن جس قوم کا فرزند تھا اُس نے دیدہ و دل میں جگہ دی۔ مسلمان ہوتا تو آج اشفاق اللہ کی طرح کسی کو یاد ہی نہ ہوتا؟ کسے یاد ہے کہ لارڈ میو کا جان لیوا شیر علی تھا۔ حبیب نوز کے ساتھ پشاور میں کیا بتی؟ یہ حبیب نوز ہی تھا جس نے قلعہ خوانی بازار میں بے گناہوں پر گولی چلوانے والے انگریز کرنل کو اس کی کوٹھی میں جا کر

گولی کا نشانہ بنایا وہیں پکڑا گیا اسی دن مقدمہ چلا اور شام کو چوڑے کی ایک بھٹی میں گرم پانی ڈال کر مجسم کر دیا گیا۔ ایک سرخپوش سالار کے خُصّے نکال دیئے گئے اترسر کے چاچا محمدی کو جلیا نوالہ کی باداش میں عمر قید ہوئی۔ بیس سال گزار کے رہے تھے ابھی حال ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب نہیں سینکڑوں گننام مجاہد میں جنہیں وقت چبارہا ہے اور جو کسی کتاب میں تو کیا کسی زبان پر بھی نہیں ہیں اور شاید انہیں خال خال افراد کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں ہے احرار کے بے شمار کارکن ایشار کے بعد افلاس کا شکار ہو گئے اور اس بری طرح خوار ہوئے کہ بل و نہال کے اس تماشا پر حیرت ہوتی ہے بعض لیڈروں کی اولاد تعلیم و تربیت سے محروم ہو گئی اب وہ زندگی نہیں گزار رہے بلکہ زندگی انہیں گزار رہی ہے کتنا اندوہ گیس حادثہ ہے کہ جن بزرگان ایشار کے خلاف ٹکے ٹکے کی زبانیں چلتی رہیں اُنکی اولاد کو پیٹ کی مارنے قبروں کے کتے بنا دیا ہے۔

بیسی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

پر بوجھ چندر نے ٹھیک کہا تھا کہ قربانی مسلمانوں کی ہے جن کے سامنے کوئی معاوضہ نہیں مسلمان ناراض ہندو متعصب، انگریز مخالف اس کے برعکس ہندوؤں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے ایام قیدان کا بیگ بیلنس ہیں جب چاہیں اپنا چیک کیش کرا سکتے ہیں جن مسلمانوں نے استخلاص وطن کی تحریک میں حصہ لیا وہ اپنا سب کچھ گنوا چکے ہیں ان کی مثال اُس عورت کی سی ہے جو نوجوانی ہی میں بیوہ ہو جائے عمر بھر روتی دھوتی رہے بچہ جنے تو مردہ ہو۔

آخری شخص — اسیروں کے اس قافلہ میں پر بودھ تھا ہر نئے ساتھی کی آمد کا ایک آدھ روز پہلے علم ہو جانا پھر جس سے جتنا تعلق ہوتا اُس کے آنے کی اتنی ہی خوشی ہوتی لیکن پر بودھ ہی آمد پر کسی حلقہ میں کوئی خوشی یا جوش نہ تھا جو کانگریسی یہاں تھے وہ تقریباً سب گوبی چند بھارگو کی پارٹی کے تھے پر بودھ ستیہ پال گروپ میں تھا یہ دونوں گروپ ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے مولانا داؤد غزنوی پر بودھ سے واقف نہ تھے لہذا ان کی منفی یا مثبت رائے کا سوال ہی نہ تھا ان کانگریسی لیڈروں نے پر بودھ کی آمد کا ٹوٹا ہی نہ لیا سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں میں ایک مدت سے چل رہی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی جان کے بیری تھے لیکن پر بودھ کے معاملہ میں دونوں ہر رائے سوشلسٹ انہیں اس لیے پسند نہ کرتے کہ وہ ان کے مقابلہ میں کانگریسی تھا

---

وہ گئے کمیونسٹ تو ان کے لیے اہم کا نام خجڑ براں تھا

جو کمیونسٹ یہاں تھے ان میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں رہا تھا اور شاید اس سے

پہلے اُس کے صورت شناس بھی نہ تھے لیکن انہوں نے پر بودہ کی آمد سے ایک دن پہلے اس قسم کی باتیں اڑائیں کہ پر بودہ کے خلقت عام فضا میں ناخوشگوار تاثر پیدا ہو گیا ہم لوگ جو اس کے کبھی دوست نہیں رہے تھے ظاہر ہے کہ ساتھیوں کا تاثر ہی قبول کر سکتے تھے وہ پہنچا تو ہم نے اُس کا مطلقاً خیر مقدم نہ کیا اس طرح آیا جیسے کوئی اجنبی چلا آتا ہے کسی گوشہ میں کوئی سی خوشی نہ تھی۔ اس نے بھی یہ محسوس کیا کہ اس کے ساتھ یہ بے توجہی برتی جا رہی ہے؛ جب سمجھی متفق تھے کہ یہ شخص کسی توجہ یا توجہ کا مستحق نہیں تو پھر عام جذبات اس سے کیا مختلف ہو سکتے تھے لیکن پر بودہ نے ایک دو روز ہی میں اپنی جگہ پیدا کر لی محسوس ہونے لگا کہ وہ اس پر وپیگنڈے سے مختلف انسان ہے سوشلسٹوں کی ناراضی کا سبب یہ تھا کہ وہ سٹوڈنٹس یونین میں اُن کا مد مقابل رہا اور جماعت سے زیادہ اس میں انفرادیت کا احساس تھا۔ یہ کوئی تحرابی نہ تھی۔ معاشرت میں اس قسم کے اختلافات ہوتے لیکن کمیونسٹوں کی برہمی کے اسباب واضح تھے۔ مثلاً وہ ان کا سخت دشمن تھا اور جہاں کہیں اس کا بس چلنا انہیں زچ کرنا۔ وہ ان کے ہتھکنڈوں کو ہر محفل اور ہر مجلس میں بے نقاب کرتا۔ اُس نے پیپلز وار کے نظریے کو بُری طرح رسوا کیا وہ علی الاعلان کہتا اور یہاں بھی اس نے پہلے ہی دن اکر اعلان کیا کہ وہ کمیونسٹوں کے سوا ہر شخص کا دوست ہے اس کا عقیدہ تھا کہ یہ لوگ مطلب نکال لینے کے بعد کسی سے غلص نہیں ہوتے انہیں کمیونزم یا کمیونسٹ پارٹی کے سوا کسی شخص یا جماعت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یہ پارٹی کی ہدایت پر انسانی قدروں کو برباد کر دینے پر تل جاتے ہیں عرض وہ کمیونسٹوں کی تحریک کا سب سے بڑا دشمن تھا ان کے مقابلہ میں وہ نہ صرف نوجوانوں کی تنظیمیں بناتا بلکہ بڑے بڑے لیڈروں کو بلا کر کانفرنسیں کرتا اور جہاں جہاں وہ موقع ملتا کمیونسٹوں کو اڑنگے پر لا کر پٹختی دینے کی کوشش کرتا۔



وہ جسے ہی جی گرشے کا دھان پان آدمی تھا دہلا پتلا، نازک اندام، گورا چٹا سرخ و سپید ستواں  
 ٹنگ، میانہ قد، متحرک اور روشن آنکھیں، طبیعت میں علم، کم گفتار، آنکھیں جیسا سے عکس رتیں۔  
 پگھل میں تناؤ پیدا ہو تو یہ اس کا غصہ تھا کمیونسٹوں نے اس کے خلاف نہ صرف ساتھیوں  
 میں برہمی پیدا کی بلکہ اس کو پٹینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سمجھتے تھے انہوں نے سیاسی طور  
 پر اس کو نہتہ کر دیا ہے لیکن جب پر بودھ نے اپنا نقش جمالیا اور ہم لوگ دو ایک روز میں صورتحال  
 کے متناسا ہو گئے تو کمیونسٹوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔

پر بودھ نے بتایا کہ بعض لوگ اس سے صرف اس لیے برہم ہیں کہ اُس نے  
 اپنی زندگی خود بنائی اور عمر کی دشوار گھاٹیوں سے ہو کے نکلا ہے جب وہ جدوجہد کے  
 راستہ پر تھا کسی نے اس کا ہاتھ نہ پکڑا بلکہ کوشاں رہے کہ وہ ڈوبتا کیوں نہیں؟ اب زندگی  
 حاصل کی ہے تو وہی لوگ حسد کرتے ہیں نہ تب جلتے دیتے تھے اب جینے دیتے ہیں۔  
 پر بودھ کے پیاجی صوبہ کے بعض اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ گھر میں کوئی تنگی نہ تھی  
 کھانا پتیا گھرانہ تھا باپ کا پیار اور ماں کی مامتا دونوں حاصل تھے ملک میں سیاسی جدوجہد  
 کا شباب تھا بالخصوص ٹیرسٹ نوجوانوں نے سارے ملک کو ہلا کر رکھا تھا ہر جگہ انقلابی  
 دہشت پسندوں کا شہرہ تھا ان میں لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی شامل تھیں کلکتہ سے لے کر  
 پینادرنگ ہر روز کہیں نہ کہیں کوئی معرکہ ہوتا۔ بنگال اور پنجاب خاص طور پر ان کے مرکز تھے  
 عدالتوں میں گولیاں چلائی جاتیں۔ گاڑیاں روک کر خزانہ لوٹ لیا جاتا بم پھٹنا روزمرہ ہو چکا  
 تھا اُسے دن کسی نہ کسی شہر میں بم پھٹتا۔ بسا اوقات مختلف شہروں میں ایک ہی وقت میں  
 ایک ہی طرز کے بم پھٹتے انقلابی نوجوانوں نے نوکر شاہی کو آگے لگالیا تھا وائسرائے اور گورنر  
 آسانی سے آجا بھی نہ سکتے تھے پولیس بالخصوص سی۔ آئی۔ ڈی کا خوب و خوار حرام تھا

دسمبر ۱۹۶۹ء میں لارڈ اردن کی سپیشل ٹرین پر نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر بم پھٹا۔ اس واقعہ نے نوجوانوں کو اور بھی تیز کر دیا۔ ہر نوجوان میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ وہ کیونکر انقلابی بن سکتا ہے۔

پرو بودھ دسویں جماعت میں تھاجب اس خبر نے تمام ملک کو چونکا دیا کہ پنجاب کے سات شہروں امرنسر، لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لاہور، جہلم اور راولپنڈی میں بیک وقت بم پھٹے۔ نے بھی انقلابیوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ عام لوگوں نے انقلابیوں کی اس ٹھیکہ کا نام بھگت سنگھ پارٹی رکھ دیا۔ کچھ عرصہ تو وہ پارٹی کی تلاش میں رہا فرسٹ ایئر میں داخل ہوا تو کامریڈ احسان الہی کی نگاہ میں آگیا ان دنوں پارٹی کے اخراجات اسی طرح چلتے تھے کہ نو وارد انقلابی گھر سے زیور چُر لاتے ڈاکہ ڈالا جاتا یا بڑے بڑے سیٹھوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے روپیہ ہتھایا جاتا تھا پرو بودھ نے انقلابی بننے کے شوق میں ماں کا زیور چرایا اور لاہور آگیا یہاں نوجوان بھارت سبھا کے راہنماؤں سے رابطہ پیدا کیا زیور پارٹی کے حوالے کیا بھگوتی چرن کی موت سے پارٹی کا شیرازہ منقسم ہو گیا تو پرو بودھ لدھیانہ میں یاہن ڈار کے ہاں تربیت لینے لگا اس نے اپنی کہانی سناتے ہوئے بیان کیا کہ

”میں ان دنوں ویشنو تھا یا مین گوشت خور وہ سالن میں سے بوٹیاں نکال کر سبزی بھجوادیتا اور میں کھالیتا تھا اس طرح گویا میرے ویشنو ہونے کا فریب قائم رہا مگر کیا نہ کرتا انقلابی بننے کا ستون سب کچھ کر دیا تھا پارٹی منتشر ہو گئی تو سال مہربے ٹھکانہ رہا گھر کیسے جاؤں؟ ماں کا زیور چرایا تھا فاتحوں نے آکھیرا ایک ایک سیاسی دروازہ ہر دستک دی لیکن کسی نے ہاتھ نہ پکڑا

کھلے دروازے بھی بند ہو گئے۔ بند دروازوں کو کھولنا تو اور بھی مشکل تھا۔ یہ عشق ٹھنڈا ہوا تو تحصیل علم کا شوق عموماً آجائے گا ہے کہ میں آوارہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جن نوجوانوں کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے وہ کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ میں نے حصول تعلیم کے شوق میں دوڑ دھوپ شروع کی — ناگہاں میری ماں کا انتقال ہو گیا (پر پودھ ماں کے لفظ پر ڈھائیں مارا کے رونے لگا اور دیر تک روتا رہا) اب کوئی شخص ماں کہتا ہے تو میرا دل اندر سے ہل جاتا ہے میری ماں میرے فراق میں بک بک کر مر گئی۔ پتا کے نزدیک میرا ہی جرم شدید تھا کہ میں گھر چھوڑ کر بھاگ آیا تھا ایک مدرس کے بچے کا یہ سب سے بڑا حیرت تھا اُن کا خیال تھا کہ جس اُستاد کا اپنا بچہ اس طرح بھاگ جائے وہ دھڑا کے بچوں کو کیا بڑھا اور لکھا سکتا ہے میں ماں کی چتا بھی نہ دیکھ سکا پر پودھ کا چہرہ دوبارہ اشکبار ہو گیا اُس نے اپنی یہ کہانی سکون پیدا ہونے تک ملتوی کر دی —

تھوڑی دیر بعد اُس نے بیان کرنا شروع کیا جب فاقوں سے نڈھال ہو گیا اور لاہور کے بڑے بڑے دلکش بھگتوں کے دل مقفل پائے تو میں نے اخبار بیچنے شروع کیے شاہی محلہ میں سکھوں کا ایک لنگر تھا وہاں سے روٹی کھاتا رہا پھر اپنے ایک مسلمان دوست کی معیت میں جو آجکل بلوچستان میں ایک بڑے عہدہ پر ہیں مسجد کا درویش بنا۔ ہم دونوں ہر روز مختلف گھر سے روٹی مانگ کر لاتے اور کھاتے اور اکثر منتظر رہتے کہ کب کسی کے ہاں موت ہو اور چالیس دن روٹی ملتی رہے۔ مذہباً میں ہندو تھا۔ پیٹ کی خاطر میں نے اذان سیکھی مؤذن بنا رہا جب میرا ساتھی مجھے چھوڑ گیا تو میں گرتا پڑتا ڈاکٹر ستیہ پال کے ہاں پہنچا۔ انہیں اپنی پتا سنائی وہ بے حد

متاثر ہوئے۔ لالہ پنڈی داس ان کے بزرگ ساتھی تھے ان کے ہاں کوئی اولاد -  
 نرینہ زنتھی چار بیٹیاں تھیں اور چاروں قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں  
 لالہ جی نے ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر مجھے اپنی فرزندگی میں لے لیا اور اس طرح  
 کئی برس کے مصائب کا خاتمہ ہو گیا۔

میں ایک نہایت ذہین طالب علم تھا اس ذہانت نے استادوں کو مجھ پر  
 مہربان کر دیا میں نے انگریزی میں ایم اے کیا جب لالہ پنڈی داس نے اپنی  
 بیٹی آدرش بالا مجھ سے بیاہ دی تو میرے لیے زندگی کے بہت سے راستے صاف  
 ہو گئے میری شادی نتیجہ تھی میرے اور آدرش کے ماہین آدرش کی یکسانی اور  
 مذاق کی ہم آہنگی کا۔ لالہ جی کی چاروں بیٹیاں ملکی تحریک میں سرفروشاہ حصہ  
 لے رہی تھیں انہوں نے لاکھیاں کھائیں، جیل گئیں، مصائب سہے حتیٰ کہ ماں کی  
 بازی لگا دی۔ سودیش کو انہی مصائب کی بدولت تپدق ہو گئی صا۔

پنجاب کے بعض مہاشاؤں کو میری شادی سے اتنا تعلق ہوا کہ وہ لالہ جی کے  
 مخالف ہو گئے ان زرداروں کے نزدیک میرا ایک ہی جرم تھا کہ میں آگے نکل رہا  
 تھا میں بھوکا تھا مجھے روٹی نہ دی بلکہ دھتکارا میں لاچار تھا میری مدد نہ کی انہیں  
 احساس ہی نہ تھا کہ ایک نوجوان برباد ہو رہا ہے اب میں ان کے ساتھ کاڑھا  
 ملا کر چلتا ہوں تو انہیں صدمہ ہوتا ہے کہ کل کا بھوکا آج ان سے آنکھیں مل رہا ہے

---

صا۔۱۔ برسوں اس مرض کے خلاف اُس نے جدوجہد کی بالآخر اُسے

سپرانداز ہونا پڑا اور فنا ہو کر چتا ہو گئی۔

گویا ان لوگوں کے نزدیک ترقی اور اس کی نعمتیں ہانہی لوگوں کا حصہ ہیں باقی مخلوق خدا صرت چاکری کے لیے ہے۔"

پر بوردھ میں درد دل کوٹ کوٹ کوٹا کر بھرتا میں نے اس جیسا صاحب دل نوجوان نہیں دیکھا آمدنی قلیل لیکن شاہ خرچ اس کی شاہ خرچہ اپنی لیے نہیں تھی اپنے معاملہ میں وہ ہمیشہ ہی درویش رہا اپنا کچھ نہ بنایا لیکن دوستوں ساتھیوں اور غریبوں کے لیے اس کا دل ہمیشہ ہی دھڑکتا رہا وہ کسی کا دکھ نہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کو اپنے دکھ یاد آجاتے تھے وہ قرص لے کر بھی غریبوں کی مدد کرتا یہاں تک کہ اپنے پہننے کے تمام کپڑے اٹھا کر انہیں دے دیتا کل کی فکر خدا پر اٹھا رکھتا۔ ایک پولیس پکڑ کر کلکتہ لے گئی تھی اس پر سمعش چندر بوس کی اعانت کا شبہ تھا وہاں اس سے پوچھ گچھ کی گئی جب کچھ ہاتھ آیا تو واپس ملتان بھیج دیا وہاں بیمار ہوا تو لاہور آگیا سارے خاندان پر اچھا خاصا ظلم ہوتا رہا لالہ پنڈی داس میاںوالی جیل میں نظر بند کیے گئے سو دلش مسوری میں بیمار پڑی تھی ساس کا دماغی توازن بگڑ گیا پیچھے لڑکیاں ہی لڑکیاں رہ گئی تھیں جو حالات سے عمدہ برآر نہ ہو سکتی تھیں۔ آمدنی کا ذریعہ ویرا ہوٹل تھا جس کے ایک حصہ میں پورا کنبہ رہتا ایک بیوی دو سالیاں دو کمسن بیٹیاں اور ایک نومولود بچہ پون کماڑ جو ان کی استارت کے دنوں میں پیدا ہوا اور ان کی وزارت کے دنوں میں جواں مرگ ہو گیا آہ! ع

کھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکا

لالہ جی نے اپنی گرفتاری کا اندازہ گڑے کے ویرا ہوٹل ایک مسلمان کو ٹھیکہ پرے دیا تھا ٹھیکیدار عذاب ہو گیا اس نے کوڑی بھی ادا نہ کی بلکہ جنگی حالات میں ہوٹل ہی کو چھل بنا دیا یہ دوہرا عذاب اور عجیب کڑا وقت تھا ان مخدوش حالات میں بھی آدرش پر بوردھ

کی ضرورتوں کا خیال رکھتی جو چیز منگواتے بھیج دیتی تھی۔

ایک دن قمیصوں، پاجاموں، کرتوں، دھوتیوں اور چادروں کا ڈھیر آگیا۔ جن سے کلاس سیاسی قیدیوں کی ملاقات نہ ہوتی تھی یا جن کا کوئی پرسان حال ہی نہ تھا پر بودھ نے ان سب میں پہ کپڑے بانٹ دیئے وہ اپنے ماضی کی بنا پر جانتا تھا کہ غریبوں کا کیا دکھ ہوتا ہے اور جو بے آسرا نوجوان تحریک استخلاص وطن میں حصہ لیتے ہیں ان کی احتیاج کیا ہوتی ہے اس کو حوادث کی مختلف منزلوں نے قدرے خود سر بنا دیا تھا اس میں آنا کا جذبہ بھی تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ آنا نہ ہو تو انسان ہی انسان نہیں رہتا کوڑا کرکٹ ہو جاتا ہے۔ بہت کم لیڈر تھے جن پر اُسے اعتماد تھا یا جنہیں وہ اپنی راہنمائی کے قابل سمجھتا وہ روپیہ جمع کرنا روپیہ کمانے کی توہین سمجھتا تھا اس نے جلد ہی ٹیرسٹ وارڈ میں اپنی ایک ملاقت پیدا کر لی جس سے کمیونسٹ بدکنے لگے لیکن ان شدید اختلافات کے باوجود ان لوگوں میں ایک خوبی تھی کہ کبھی ایک دوسرے پر ذاتی حملے نہیں کرتے تھے جب آسنے سامنے ہوتے تو اس طرح کا تھ باندھ کے ملتے جیسے دل میں کوئی میل ہی نہیں ہے حکومت کے مقابلہ میں سب ایک تھے۔

ساور کر ہندو مہاسبھا کے صدر اور کانگریس کے حریف تھے یہ ذکر پچھلے صفحوں میں بھی آچکا ہے کہ وہ ایک دفعہ بھاگل پور میں بکڑے گئے تو مہاتما گاندھی نے حکومت کو ڈانٹا تھا کہ اُس نے انہیں گرفتار کر کے شہری آزادی کا گلا گھونٹا ہے پنڈت جواہر لال نہرو کو انفرادی ستیہ گرہ میں چار سال قید ہوتی تو ساور کرنے حکومت کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے جو سیاست کے نزدیک پھٹکتے بھی نہ تھے ایک بیان میں کہا تھا کہ جو حکومت جواہر لال کو جیل میں ڈالتی ہے وہ کیونکر ہند

## کہا سکتی ہے؟

جے پرکاش نارائن اور دوسرے سیکرٹریوں نے نوجوانوں نے دیوبند کیپ میں بھوک ہڑتال کی تو گاندھی جی نے بیان دیتے ہوئے کہا حکومت ہند کو ان کے مطالبات تسلیم کر لینے چاہئیں وہ ان نوجوانوں کے دل میں منہ پیدا کر رہی ہے اگر ان میں تشدد کا میلان پیدا ہو گیا اور ملک نے ان کی سپردوں کی تو وہ اس تحریک کو روک نہیں سکیں گے یہ سب نوجوان قوم و ملک کا قیمتی سرمایہ ہیں۔“

ادھر عام مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے نوجوانوں کو جو انگریزی حکومت سے ٹکر لیتے قابل توجہ ہی نہ سمجھتے تھے رہ گئے خواص تو وہ انہیں مطعون کرتے ہوئے نہ تھکتے تھے باقی صوبوں کا حال خدا بہتر جانتا ہے پنجاب کا حال تو یہی تھا۔

پر بودھ ستیہ وادی بھی تھا اور اہلسنا وادی بھی اور یہ دونوں خوبیاں اُس نے اپنی ذات میں یکمال و تمام جمع کر لی تھیں اس نے اپنے کمرے (cell) میں رہنا تاکہ ٹیگور کی دستخطی تصویر لٹکار رکھی تھی۔ اس کے سیاسی خیالات وہی تھے جو گاندھی جی اور جواہر لال کے تھے۔ مولانا آزاد کا وہ شہیدانی تھا مولانا ہی نے اسے پہلی دفعہ اسمبلی کا ٹکٹ دیا تھا جبکہ اسے ٹکٹ ملا تو بریڈلا ہال کے دروازہ پر ٹریبیون کے ابنائش چندر بالی سے اُس کی ملاقات ہوئی بالی جی گوپنی چند گروپ میں تھے اور سخت ہندو، انہیں ملال تھا کہ انہیں یا دیریند کو مولانا نے ٹکٹ دیا بلکہ پر بودھ اور تلک کو ٹکٹ دیا ہے پر بودھ نے بالی جی سے رسماً آتشیراد حاصل کرنی چاہی لیکن بالی جی نے دو ٹوک جواب دیا کہ ٹکٹ غلط ملا ہے تم ٹکٹ کے حقدار نہ تھے پر بودھ اپنا سامنے لے کر رہ گیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے خلاف یہ حسد صرف اس لیے ہے کہ وہ ذاتی محنت سے اُبھرا ہے۔

دوست پہلے جلتے پھر بنائے جاتے ہیں پر بودھ ایک ہیرا تھا اس کی ذاتی خوبیاں بے پیمانہ تھیں وہ دینے والا انسان نہیں تھا اس کی دشمنی اور دوستی عظیم تھی وہ سرتاپا مہر و وفا تھا اس کے اغت میں فریب و دغا کے الفاظ ہی نہ تھے۔ شاعروں نے دوستوں کا بڑا ماتم کیا ہے کہ اس دنیا میں کوئی دوست نہیں دشمن عام ہیں لیکن پر بودھ فی نفسہ ایسے تمام مفروضوں کی نفی تھا وہ سچا سونا تھا اس کو مل کر انسان محسوس کرتا تھا۔ عجز

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

قدرت نے مجھے اکل کھڑا طبیعت دی ہے میں نے زندگی میں کم ہی لوگوں کے احسان اٹھائے ہوں گے تاہم انسان کو ایک دوسرے کے تعلقات کی معاونت پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا ہے جس زمانہ میں میں نے سیاسی زندگی شروع کی کچھٹے سالوں میں تھا فاقوں پر نفاق آتے رہے لیکن کبھی سوال نہ کیا جو شخص زبان کو سوال سے داغدار کرتا یا اپنے پیٹ سے کبڑا اٹھاتا یا ہاتھ کو کشکول کی صورت دیتا ہے وہ نہ صرف عزت نفس کھوتا بلکہ خود سوال ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس ساری زندگی میں پر بودھ ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے برا اور اہل تعلق کو اتنا محکم کیا کہ ہم دونوں ہم واحد ہو گئے اُس نے میری دامنے درمے قدمے اور سختے مدد کی آج ہم دو مختلف مملکتوں کے شہری ہیں لیکن یہ اعتراف کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی آبرو مندانہ راہوں میں میرا معیار رہا ہے وہ انسان کے لباس میں دیتا ہے اس نے میری زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے میں اس کو اپنا دوست اور اپنا بھائی سمجھتا رہا میں نے اس کے خاندان سے اور اس نے میرے خاندان سے اتنی محبت کی ہے کہ جیسے ہم ایک ہی شاخ کے پھول ہیں ہم میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا اور نہ ہم نے کبھی آزادی کے بعد کسی بھی سیاسی موضوع پر گفت گو کی ہے اس کو ہندوستان



## عروج ہے بے پاکستان —

دیوالی کی رات جتنے بندو سامتی تھے انہوں نے اپنی کوٹھڑیوں پر دیپ مالا کی رات کو جو اکیلا بچہ بالو نے (جس کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے) پھونکیں مار مار کر سبھی چراغ اور موسم بتیاں گل کر دیں کچھ ساتھیوں نے بُرا مانا اور احتجاج کیا لیکن اُس سے کچھ کہنا سننا مشکل تھا وہ خود بھی بندو تھا اُس نے للکار کر جواب دیا یہاں دیپ مالا غلط ہے ہمیں راون نے قید کر رکھا ہے قید میں چراغاں کرنے کا مطلب ہے کہ ہم اس سے خوش ہیں پہلے راون کو مار دو پھر چراغاں کرو رام قید ہو تو دیپ مالا کا مطلب ہے — یہ بدشگونی ہے — ان چراغوں کو بجھا دو —

بربودھ میں ایک ہی کمزوری تھی کہ بیوی بچوں کے خطوط کا بے چینی سے انتظار کرتا جیل میں خطوط دیر سے ملتے تھے مقامی خط ہی ہفتہ عشرہ میں ملتا خط آنا اگلے روز ہی آئی ڈی کے دفتر میں سنسر کیلئے چلا جاتا وہ چوتھے پانچویں روز واپس کرتے۔ یہ لائحہ عمل بربودھ کے لیے صبر آزما تھا میں نے اس کا علاج نکالا جب سپرنٹنڈنٹ اور جیلر دوپہر کے وقت گھروں کو چلے جاتے تو میں ڈیوڑھی میں جا کر پولیٹیکل قیدیوں کی ڈاک کا کبس کھولتا اور جو خط بربودھ کے نام ہوتا اڑاتا۔ یہ ایک ایسی نکتہ تھی جس کو میں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ نتیجتاً بربودھ کا اضطراب رفع ہو گیا۔

پنجاب میں دو خاندان تھے جو فرقہ پرستی کی ہر آلائش سے پاک رہے ایک سردار کلبیسر سنگھ کا خاندان جو سردار بھگت سنگھ کا خاندان کہلاتا تھا دوسرا لالہ پنڈی داس کا خاندان جہاں بربودھ خانہ داماد تھے۔

اس ساری قید میں دو ہی نوجوان میری کمائی تھے۔ ایک تلک راج چڈھا

دوسرا پر بودہ چندر لیکن دونوں ایک دوسرے سے نزدیک ہو کر بھی دور تھے وہ  
کی شاہراہیں ہی مختلف تھیں۔

---





(اندرونی زاویہ)

سکول جیل لاہور

کیونکہ اس تمام سے گزرتے ہیں کتنے کارواں



ہم نے اس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا  
 بس سیاست کا صلہ آپنی زنجیریں تھیں

رہائی کا سال تو ۱۹۴۷ء ہی تھا کیونکہ پانچ سال پورے ہو رہے تھے لیکن یہ معلوم  
 نہیں کونسا مہینہ اور کونسا دن تھا میرا حافظہ جو معاملہ میں سچو کس رہا ہے لیکن سال و تاریخ مجھے  
 اکثر و بیشتر یاد نہیں رہتے بہر حال رہائی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی دو ماہ باقی تھے کہ دوستوں  
 نے دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا میں روکتا رہا وہ مصر رہے یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں  
 قحط پڑا تھا قحط پڑا نہیں بلکہ ڈالا گیا تھا۔ آزاد ہند فوج برما تک آپہنچی تھی انگریزوں نے  
 تھے مبادا بنگال ہاتھ سے نکل جائے انہیں بنگال کے نوجوانوں کی جرات و غیرت کا تجربہ  
 بھی تھا اور اندازہ بھی ٹیرسٹ موومنٹ کا آغاز بھی ہیں سے ہوا تھا اس بے قابو تحریک  
 کو روکنے کے لیے سکاٹ لینڈ یارڈ سے آفسیر منگوائے گئے سجاش بالو کا بنگال پر بے پناہ  
 اثر تھا وہی آزاد ہند فوج کے نیتا تھے اس خطرہ نے حکومت کو بدحواس کر رکھا تھا۔

آزاد ہند فوج بنگال کے دروازے پر کھڑی تھی ظاہر ہے کہ یہ فوج بنگال میں آجاتی اور نتیجی ساتھ ہوتے تو سارا ہندوستان باغی ہو جاتا انگریزوں کے لیے بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ کا ہی نہ رہتا دہلی تک تو ہندوستان آن واحد میں انگریزی عملداری سے محروم ہو جاتا۔ لازماً سرحد میں بھی سبھی حالات پیدا ہوتے البتہ پنجاب کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت کس طرف ہوتا جنگ کا پانسہ اس تیزی سے پلٹا کہ نقشہ ہی بدل گیا لیکن بنگال کو کٹری سزا ملی وہ کسی بغاوت کی تیاری کرنے کے بجائے بھوک مٹانے میں لگ گیا جن کو گولی سے مرنا چاہیے تھا وہ بھوک سے مرنے لگے اور مر گئے کیونسٹوں کو معلوم تھا کہ آزاد ہند فوج رنگون تک آپہنچی ہے اور بنگال کا ذہن باغی ہے انہوں نے قحط میں امداد کو تخریک بنالیا حکومت نے ریلیف فنڈ قائم کیا کیونسٹوں نے بھی اور مہا سبھا کے لیڈر شیام پرشاد مکر جی نے بھی۔ احرار نے بھی امداد کا سبڑہ اٹھایا اور بنگال پہنچ گئے سائیکھوں میں جلنے کس کو یہ خیال سوچا کہ آپس میں چندہ کرنا چاہیے مگر جیل میں روپیہ کہاں؟ بہر حال ایک معقول رقم جمع ہو گئی میرے پاس کل سچاس روپے تھے فنڈ میں دیدیے اب سوال یہ تھا کہ جو رقم جمع ہوئی ہے کہاں بھجی جائے؟ بیشتر کا خیال تھا کہ حکومت کو بھجی جاتے کیونسٹ اپنی پارٹی کو بھجوانا چاہتے تھے کانگرس کے راہنما شیام پرشاد مکر جی کو، لیکن کسی ایک پر اتفاق نہ ہوا قحط کی ذمہ دار حکومت تھی شیام پرشاد ہندو مہا سبھائی تھے کیونسٹوں کو عام سا تھی پیپلز وار کانفرہ لگانے کی وجہ سے مجرم گردانتے تھے جب اتفاق سونا نظر نہ آیا تو میں نے حرار کا نام پیش کیا لیکن سب ناک بھوں چڑھا کر رہ گئے کسی نے کہا احرار اور ہندو مہا سبھائی کیا فرق ہے؟ دونوں فرقہ دار جماعتیں ہیں اب صحیح یاد نہیں آ رہا کہ روپیہ کہاں گیا؟ لیکن میرا خیال ہے کہ روپیہ شیام پرشاد مکر جی ہی کو بھجیا گیا کیونکہ جن لوگوں نے کشیدہ رقمیں

دی تھیں۔ ان کا ذہنی جھکاؤ اسی طرف تھا اور وہ باطناً اپنی کے حق میں تھے۔

میری دو اعلیٰ دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے ساتھیوں پر زور دیا کہ رقم اکٹھی کر کے بنگال ریلیف فنڈ میں دے دیں کوئی نہ مانا ہر کوئی دعوت میں ٹنگ گیا رگھونندن سنگھ نے تجویز کی کہ رہائی پر روپوں ایک تھیلی نذر کی جائے خود پانچ ہزار روپے کی پیشکش کی پر بودھ تو پہلے ہی پیش پیش تھا دس ہزار روپے جمع ہونے کا امکان تھا میرے علم میں بات آئی تو میں نے سختی سے روک دیا۔ معاف کیجئے! میں قید کی قیمت وصول کرنے نہیں آیا کسی اور ساتھی پر یہ طبع آزمائی کیجئے۔

رگھونندن جی میری اسی قلندری سے خوش تھے اور خوب جانتے تھے کہ اب جو نہ ہوئی ہے تو ہاں نہیں ہوگی۔

سب سے پہلے خاکساروں نے دعوت دی اکبر اور یوسف دونوں میزبان تھے تمام ساتھی عیش عیش کراٹھے دوسری دعوت مولانا داؤد عنز لوی نے کی ان کے گھر سے کھانا پک کے آیا۔ تیسری دعوت سردار گلاب سنگھ نے چوتھی یامین ڈار نے پانچویں کلبیر سنگھ نے چھٹی رگھونندن سرن نے ساتویں دیوان چمن لال نے آٹھویں چودھری عبدالہستار نے اور آخری دعوت پر بودھ نے یہ تمام منیافتیں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے تھیں انفرادی سلسلہ ختم ہو گیا تو اجتماعی دعوتوں کا دور چلا۔ کانگریس گروپ نے دعوت کی سوشلسٹ گروپ نے مدعو کیا کمیونسٹ گروپ نے پنخ دیا ٹریسٹ گروپ نے ڈنزا در آخر میں ہانگ کانگ کے قیدیوں نے یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جو رکت ہی نہ تھا پر بودھ نے سب کو مات کر دیا اس نے شاہی دسترخوان بچایا سب سے آخری دعوت جو میری رہائی کے دن ہوئی وہ تمام لپٹیکل قیدیوں کا ڈنزا تھا اگلے دن میں۔

رہا ہو گیا۔ پر بودھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا —

” شورش ایک بہادر دوست اور بہادر دشمن ہے۔“

اوردوستوں نے بھی اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا مولانا داؤد غزنوی نے تقریر کرتے ہوئے کہا —

” قربانی و ایثار کے ان شدائد میں ہندو و مسلمان کی تفریق غلط ہے لیکن اس غلط خیال کو باطل کرنے کے لیے کہ مسلمانوں میں جگر دار نوجوان نہیں ہیں، میں شورش کا نام فخر سے پیش کر سکتا ہوں شورش نے پانچ سال قید و لیسرانہ روایات کے ساتھ گزار کے نہ صرف اپنے موقف کی لاج رکھی ہے بلکہ ہمارا سر بھی اوسچپ کر دیا ہے۔“

یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ میرے بزرگوں اور ساتھیوں نے مجھے اس تعریف کا مستحق سمجھا۔

رہا ہونے والے قیدی کی نفسیات آخری ہفتہ عشرہ میں عجیب و غریب ہوتی ہیں کئی قسم کے خیالات دماغ میں آتے اور چلے جاتے ہیں محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے یہ گھڑیاں طویل ہو گئی ہیں جانے کل کیا واقعہ پیش آ رہا ہے، تعین کے باوجود رہائی کا یقین نہیں ہوتا۔ انسان خیالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا سوچتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ خواب تو نہیں ایک ایک گھڑی پہاڑ ہو جاتی ہے۔

پانچ سال بہر حال کٹ گئے منگمری میں قیامت کے دن تھے معلوم ہوتا تھا کہ زندگی چند روز کی محال ہے کسی وقت سناؤنی آسکتی ہے لاہور میں دماغ کا علیش مستیر آ گیا لیکن



انسان ہر حال میں مشرخیال ہے اضطراب ساتھ ساتھ رہا جب تک بے چینی اور بے قراری نہ ہو دل ٹھہرتا ہی نہیں ہجر جا چکا اور وصال کے لمحے بالکل ہی قریب بلکہ سامنے کھڑے تھے اب جس گھڑی کا انتظار تھا اس میں صرف ایک رات حائل تھی لیکن وہ رات پانچ سال کی راتوں کا خلا ہوئی۔ دل کے معاملات کا حال یہ تھا جیسے رہائی کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ جس محبوب کا انتظار ہے وہ ایشیائی ہے اور ایشیائی محبوب کے وعدے عموماً پورے نہیں ہوتے وصال کے لمحات قریب ہوں تو فراق کی راتیں اور بھی طویل ہو جاتی ہیں۔ رہائی اور اضطراب دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے میں اپنے ساتھیوں کا سرخیل تھا وہ محسوس کر رہے تھے کہ جیسے کسی خلا کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ ایک قدرتی بات تھی پانچ سال کا عرصہ ایک لمبی مدت ہے قید ہوا تو دوستوں کا دل ڈوبا جا رہا تھا کب رہائی ہوگی؟ دوبارہ ملیں گے بھی یا نہیں؟ ان حالات میں دوسو سے عام ہوتے ہیں۔ میرے دوست بھی آخر انسان ہی تھے انسان بڑا با اختیار ہے انسان بڑا بے بس ہے جن عزیزوں کو یہ فکر تھا کہ اب شاید ہی ملاقات ہو آج وہی استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔

آخر وہ صبح آہی گئی کہ جس صبح کو رہا ہونا تھا سب سے پہلے خاکساروں نے ٹیرسٹ وارڈ کے دروازہ پر آکر سلامی دی۔ اکبر اور یوسف دونوں ابیدہ ہو گئے اکبر اس طرح رو رہا تھا جیسے کوئی بچہ بلک بلک کے روتا ہوا خلائی قیدیوں کا ایک انبوہ ہو گیا جب کبھی انہیں کوئی مشکل پیش آتی میں ان کے کام آتا اکثر خوش تھے کہ میں رہا ہو رہا ہوں اگر مغموم تھے کہ وہ ایک دوست یا سرپرست سے محروم ہو رہے ہیں یہ ان کے تعلق خاطر کا احساس تھا میں نے ایک ایک سے معاف کیا ہر شخص اُداس بھی تھا اور خوش بھی۔ اداس اس لیے کہ ان کی محفل سے ایک ایسا سا تھی جا رہا ہے جو ان کی آرزو کیوں اور خوشیوں کا ساتھی تھا اور

خوش اس لیے کہ بہر حال ایک ساتھی کی رہائی ہو رہی تھی جس رہائی کے وہ خود بھی منتظر تھے۔  
 کئی ایک کے انہماکوں میں خود ڈیوڑھی تک اٹکبار رہا پٹ کر ٹرسٹ وارڈ پر نگاہ  
 ڈالی اور ساتھیوں کو بھرپور سلام کہا پھر وارڈ کی دیواروں کو نگاہوں سے بوسہ دیا پہلا سیاہ پھانگ  
 کھلا اور بند ہو گیا جن دیوسیکل کا لے پھانگوں نے وصول کیا تھا وہی بہ اغذرت سب واپس کر رہے تھے  
 ان سیاہ پھانگوں کے آہنی تختوں پر ان گنت حسرتوں کا اظہار تھا سید امیر شاہ جاچکے تھے ان کی  
 جگہ کوئی اور صاحب جیلر تھے انہوں نے مبارک باد می میجر حبیب اللہ شاہ سے مل کر باہر  
 نکلا تو سلاخوں کے باہر دوستوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا ہر ایک نے ہاتھ ہلا ہلا کر خوشی کا اظہار  
 کیا۔ رہائی کے کاغذات مکمل ہو گئے تو سی آئی ڈی کے ایک سب انسپکٹر سید اعجاز حسین شاہ اپنے  
 ایک اسٹنٹ شیخ نذیر احمد کے ہمراہ نمودار ہو گئے انہوں نے ہوم سیکریٹری کی طرف سے  
 ایک حکمنامہ دیا جس میں درج تھا کہ گورنر پنجاب مفاد عامہ کے پیش نظر محسوس کرتے ہیں کہ  
 ”شورش کا ٹیمبری کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت پسیہ اخبار پولیس اسٹیشن کی حدود میں  
 تاحکم ثانی نظر بند رکھا جائے اس دوران میں نہ وہ ان حدود سے باہر جاسکتے ہیں نہ پانچ سے  
 زائد آدمیوں میں بیٹھ سکتے ہیں نہ کسی سیاسی گفتگو میں حصہ لے سکتے ہیں تحریر و تقریر  
 دونوں ممنوع ———

یہ گویا دوسری قید کا آغاز تھا لیکن اس کا اطلاق اور آغاز چوبیس گھنٹے بعد ہوتا  
 تھا اس نظر بندی کا ذلیل پہلو یہ تھا کہ ہر اہلیت دار کو پرانی انارکلی کے محفل میں  
 حاضر ہو کر رپورٹ لکھوانے کا حکم دیا گیا تھا بہر حال ———

وادی عشق میں ایسے بھی مقام آتے ہیں

میں بہ آرڈر لے کر باہر نکلا تو احباب نے ہاروں سے لا دیا۔ اندر اور باہر کی فضا

ایک لحظہ کے لیے زندہ باد سے گونج اٹھی دوستوں کا حال یہ تھا کہ رخساروں پر موتی ڈھلک رہے تھے اور ہر خاکسار چھوٹ چھوٹ کر رونے لگے پر بودہ ابدیدہ ہو گیا چودہری عبدالستار کی ہچکی بند گئی ان ساتھیوں کو چھوڑتے وقت میرے دل میں ایک کسک ضرور تھی لیکن زندگی طلوع و غروب کے انہی سلسلوں کا نام ہے۔ میں نے ایک لحظہ کے لیے جیل کے سیاہ پھاٹکوں کو مڑ کے دیکھا تو وہ بند ہو چکے تھے لیکن ان پھاٹکوں کی ڈراؤنی آنکھیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تعاقب سے ان کا منشا کیا تھا لیکن محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں بھی میری پانچ سالہ جوانی کے کھا جانے کا قلق ہے وہ شمار ہی ہیں۔

### رہائی کے بعد نظر بندی

جیل سے نکلنے ہی احباب کے ساتھ سیدھا چودہری افضل حق کے مزار پر پہنچا فاتحہ پڑھی دیر تک ان کی یاد میں ابدیدہ رہا وہاں سے ہمتیرہ کے ہاں گیا معلوم ہوا مستری شمس دین نے میرے لیے پسیہ اخبار کے نگر پر ایک بیٹیک کرایہ پر لی ہے۔ جو بٹرسٹ وارڈ کے دڑلوں (cells) کی طرح ہے اس میں بمشکل ایک چار پائی اور دو کرسیاں بچھ سکتی تھیں سامان ہی کیا تھا دو صندوق چند کتا میں کھانے پینے کے دو چار برتن، بخیر تھوڑی ہی دیر ہمتیرہ کے ہاں ٹھہرا۔ پھر مولانا ظفر علی خاں سے ملنے دفتر زمیندار چلا گیا بڑے تپاک سے ملے معالفا فرمایا دعائیں دیتے رہے ان کا سیاسی راستہ میرے سیاسی راستے سے مختلف تھا اور اب تو وہ ایک مدت سے سیاسیات ہی چھوڑ چکے تھے لیکن اس کے باوجود ایک تحریک اور ایک ادارہ تھے۔ انہیں امرتسری، اختر علی خاں حاجی لائق اور حسن التفیق سے مولانا عبدالحمید سالک بھی وہاں فروکش تھے ان سے مشفقانہ

الفاظ میں ذکر کرتے رہے ان کے لیے شعر کہنا مشکل نہ تھا ہم لوگ اتنی محنت سے بات نہیں  
 کر یا تے جتنی جلدی وہ شعر کہہ لیتے تھے حقہ کی نئے منہ میں انگوٹھے پرائنگلی دائرہ سا بنا اور  
 گھٹ سے شعر ہو گیا اب جو ابک شعر ہوا تو دوسرا متعاقب تھا فرمایا کیسے کئی؟ عرض کیا  
 "تین برس منگمری سنٹرل جیل میں اسی جگہ رہا ہوں جہاں آپ نے پانچ سال کاٹے تھے" ایجا کی  
 کسی خیال میں کھو گئے پھر سکوت توڑتے ہوئے کہا تو ہاں! ذرا لکھو۔

لائی ہے خبر حلقہ یاراں میں صبا آج  
 شورش ہوا زندانِ حکومت سے رہا آج  
 اُڑنے لگا احرار کی حبرآت کا پھر پیرا  
 آنے لگی آزادی کامل کی عدا آج  
 طائر میں وارنچِ خطابت کے چمن میں  
 الفاظ و مطالب کو بنا رنگ ملا آج  
 لگتا ہے کنارے پہ دعاؤں کا سینہ  
 پہنچی ہے سر عرش برین آہ رسا آج  
 اب ایسی حکومت سے کوئی شخص کہے خاک  
 زنداں سے نکالا تو نظر بند کیا آج

یہی حوصلہ افزائیاں تھیں جس سے دل باغ باغ ہوتا تھا مولانا سے مل کر میں سیدھا  
 دفتر احرار پہنچا وہاں بہت سے احباب جمع تھے دو چار گھنٹے وہاں رہا پھر اپنے ماں چلا آیا  
 رات بھر دوستوں کا مجمع رہا صبح نو بجے چومیس گھنٹے ختم ہو گئے نظر بندی شروع ہوئی  
 سی آئی ڈی کانگریس کے سٹیبل سامنے مشرقی ہوٹل میں بیٹھا رہتا کبھی کبھی پیسہ اخبار پولیس اسٹیشن

کا تھا نیدر بھی آجاتا جو شخص ملے آتا اس کا اور دو مہینے اور پتہ پوچھا جاتا پتہ چل گیا تو ٹھیکہ  
 ورنہ حلیمہ ہی ہی کئی ماہ ہی معمول رہا نہ جانے کتنے کا غذایا ہو گئے پھر یہ ڈیوٹی سپر اینڈ  
 کے معززین نے سنبھال لی ان کے فٹنی مینڈی جس کسی کو آتا جاتا دیکھتے رپورٹ کر دیتے  
 مگر ان صبح و شام پھرا ڈال جاتا سید اعجاز حسین شاہ اُس زمانے میں سی آئی ڈی میں مسلم سیکشن  
 کے انسپراج سب انیکڑ تھے۔ اب اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ عام پولیس آفیروں سے مختلف  
 تھے ان میں ایک انسان بسا ہوا تھا صوبہ کا ہر پولیٹیکل قیدی جس کا ان سے واسطہ پڑا اُن کا مداح  
 ہو گیا جب ان کا انتقال ہوا تو سرکاری حلقوں کے علاوہ مقامی سیاسی حلقوں میں بھی اُن کی  
 موت کو محسوس کیا گیا وہ ایک بااخلاق اور شریفانہ خوبو کے انسان تھے ذرائع اور اخلاق  
 دونوں کو ہاتھ میں رکھتے اور کبھی کسی کی دل آزاری کا باعث نہ ہوتے وہ اپنے ساتھیوں  
 کی طرح نہ تھے جو لاہور کے شاہی قلعہ میں پولیٹیکل قیدیوں کی کھال کھینچنا کئی کئی نفلوں کا  
 لڈا ب سمجھتے تھے شاہ صاحب کا معمول تھا کہ گاہے ماہے میرے ہاں چلے آتے اصلاً  
 وہ مولانا مظہر علی اظہر کے دوست تھے انہی کی معرفت میرے شناسا ہوئے اور  
 شناسائی کا رشتہ مرتے دم تک مجروح نہ ہونے دیا بڑے خوش گذار تھے جب کوئی  
 غلط سلط رپورٹ آتی خود ہی تصحیح کر دیتے یا کسی حوالہ کے ضمن میں کوئی افسر کچھ پوچھتا تو  
 ماتحتوں پر بھروسہ نہ کرتے بلکہ ڈائریکٹ دریافت کر لیتے وہ اعزازی مجزوں کی رپورٹوں  
 کے بالکل قائل نہ تھے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا تھا  
 شورش کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟ میں نے کہا احباب مدد کرتے ہوں گے؟ کہنے لگا  
 ان کے نام معلوم ہونے چاہئیں۔ کہا جماعت احرار مدد کرتی ہے رپورٹ لی گئی تو پتہ  
 چلا کہ مجلس احرار کے تنخواہ داروں کی فہرست میں شورش کا نام ہی نہیں ہے اور نہ

وہ اس سے کوئی مشاہرہ یا الاؤنس لیتے ہیں۔

سپرٹنڈنٹ مسرعقا کہ ان لوگوں کا پتہ لگانا چاہیئے جو امداد کرتے ہیں

\_\_\_\_\_ تو پھر آپ نے کیا لکھا شاہ صاحب ہا میں نے پوچھا

”مغفول سوال تھا لکھ آیا ہوں کہ کرنال شاپ انارکلی کے مالک شیخ عبدالملک امداد کرتے ہیں۔“ مجھے بے اختیار ہنسی آئی اور غصہ بھی کہ سی آئی ڈی کا محکمہ ہے کیا، کیا اس کی گذر بسر جھوٹی رپورٹوں اور خود ساختہ جوبالوں پر ہوتی ہے عجیب محکمہ ہے کہ انسان کے رزق پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔

شیخ عبدالملک اور ان کے بھائی شیخ عبدالواحد میرے ذاتی دوست ضرور تھے لیکن وہ میری امداد کرتے یا میں ان سے امداد کا خواہاں ہوتا دونوں غلط تھے نہ انہیں یہ حوصلہ ہو سکتا تھا نہ میں یہ گوارا کر سکتا تھا یہ ضرور ہے کہ بعض دوستوں نے اس اثنا میں میری مدد کی لیکن وہ احرار کے معاون یا ہمدرد تھے اور میرے ساتھ ان کے اخلاص کا ایک طبعی رشتہ تھا مثلاً مستری شمس الدین تھے جو ہر ماہ بیٹھک کا کرایہ ادا کرتے تھے ملک محمد حیات تھے جنہوں نے دو چار دفعہ میری ضرورتوں کا احترام کیا۔ چائٹ مارٹ انارکلی لاہور کے مالک عبدالقادر چشتی تھے آپ نے ایک اُدھ مشکل میں میرا ہاتھ بٹایا۔ یا پھر ان میں سرفہرست اچھرہ لاہور کے رئیس میاں قمر الدین (علیہ الرحمۃ) تھے جو گاہے گاہے میری امداد کرتے رہے میں کسی موڑ پر کسی شخص سے اعانت کا خواہاں نہ تھا یہ لوگ اپنے طور پر میرا ہاتھ بٹاتے رہے ایک بے بسی تھی سال بھر رہی اور ختم ہو گئی کھانا ہمیشہ کے ہاں سے آجاتا کچھ لکھنا پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا اس سے کچھ روپے مل جاتے جو عام ضرورتوں کے کام آتے یہ مختصر نظر بندی کے سفر کا آغاز۔

## جانگداز المیہ

پہلا صدمہ جس سے دوچار ہونا پڑا وہ خورشید کا انتقال تھا اس کا قاتل میں ہی تھا وہ کہی  
دمرتی لیکن مجھ پر تہ بان ہو گئی رہائی تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مر چکی ہے۔ مسعود نے جیل  
کے دروازہ پر صرف، اتنا کہا کہ وہ لاچار ہو کر گجرات چلی گئی تھی۔ وہیں زیر علاج ہے کل  
ہی اس کی والدہ کا خط آیا تھا کہ صبح لاہور آجائے گی۔ دوسرے دن مسعود نے  
بتایا کہ خورشید کو فوت ہوئے سال ہو چکا ہے تپرق کی ماہ کھا کر ہمیشہ کے لیے رخصت  
ہو گئی ہے اس کی چھوٹی بہن ثریا نے بتایا کہ وہ مرتے دم تک آپکو یاد کرتی رہی اُس نے  
مسعود بھائی سے بار بار تعامن کیا کہ ایک دن کے لیے آغا جی کو لے آؤ۔ میں اللہ کے ہاں  
جارہی ہوں وہ پیروں پر نہیں آسکتے۔ لیکن اس پگلی کے علم میں نہ تھا کہ پیروں ہر کہ دمہ  
کے لیے نہیں اعلیٰ خاندانوں کے لیے تھا اس سے شورش نہیں گونپی چند یا افتخار الدین  
متمتع ہو سکتے تھے۔ میرادل آزرده ہو گیا میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلے۔ دیر  
تک ملول رہا جی ذرا ہلکا ہوا تو میں نے مسعود سے کہا آؤ اس کی قبر پر چلیں یونیورسٹی گراؤنڈ  
کے نزدیک نگران کانسٹیبل نے روکا آپ کے مدد یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ اس  
سے آگے مزگ کے تھانے کا علاقہ ہے۔

”تو کیا میں اس کے آگے نہیں جا سکتا؟“

”جی نہیں۔ انارکلی تھانہ کی حدیں یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔“

”اور اگر میں جانا چاہوں؟“

”آپ کی مرضی ہے لیکن قانون شکنی ہو جائے گی۔“

”کسی عزیز یا عزیزہ کی قبر پر بھی نہیں جاسکتا؟“

”نظر بندی کی حدیں یہاں تک ہیں۔“

ثریا مسعود اور میں کھڑے کھڑے دیر تک سوچتے رہے ثریا نے کہا۔۔۔

”بھائی جان۔ نظر بندی توڑنے کا مطلب ہے آپ دوبارہ جیل چلے جائیں۔ اس سے فائدہ؟ ایسے واپس چلتے ہیں۔“

”اچھا تم جاؤ اور یہ پھول اس جاں ہار کی تربت پر چڑھاؤ۔ میں نے ثریا سے

کہا اور ہاں مسعود تم میری طرف سے فاتحہ پڑھنا اور کہنا۔ تم نے ہت جلدی کی۔

تم لوگ جب تک واپس نہیں آتے میں یہیں کھڑا ہوں۔“

ثریا اور مسعود چلے گئے میں جین مندر کے پاس کھڑا سوچتا رہا محبت مد بیان سے

ماورلی۔ ہے اُس وقت اور بھی اندوگہیں ہو جاتی ہے جب ادھوری رہ جائے اس کا

قلق اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب حسن قضا کی زد میں آکر جوانرگ ہو جائے اور عشق

جاں ہار! خورشید جیسی لڑکیاں عشق کی معراج ہوتی ہیں اُس نے مجھ سے بے پناہ محبت

کی حتیٰ کہ فنا ہو گئی خود بوئے گل تھی اپنے پیچھے نالہ دل چھوڑ گئی۔ اس شمع کی یاد ہر اس

رات کو جگمگا اٹھتی ہے وہ ایک ناکام محبت تھی؟ اصلاً وہی کامیاب رہی اس نے جان

دے کر وفا کی آبرورکھی اور ثابت کیا کہ عورت کی پہلی محبت ہی اس کی آخری محبت ہوتی

ہے میرے سامنے اس وقت بھی اس کی تصویر ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ میرے

ساتھ شملہ بہاری کی ٹہنیوں کے سائے میں بیٹھی وفا کا عہد کر رہی ہے لارنس گارڈن کی

شاخوں میں اس کی مسکراہٹیں ابھی تک پھول بن کر کھلی ہوئی ہیں شاہی مسجد کے میناروں

کی سلیں اس کے سرخ رخساروں کی آگ سے دہک رہی ہیں راوی اُسی کے گیت





ہوٹل تھا کئی طلبہ دوست بن گئے کچھ سیاسی مزاج کے اور کچھ ادبی مزاج کے۔  
میری دونوں سے آشنائی ہے

گوپال متل پبلسٹ تھے لیکن نواتے وقت کے ادارہ تحریر میں تھے انہی کی  
معرفت ساحر لدھیانوی سے تعارف ہوا ساحر لدھیانہ سے آتے تو لاکالچ کے ہوٹل  
میں ریم پر کاش اشک کے ہاں ٹھہرتے کبھی کبھار میرے ہاں ٹک جاتے اشک راولپنڈی  
کے رہنے والے ایک مخلص نوجوان تھے۔ تقی الدین پال اور غلام مرتضیٰ سے بھی اسی  
زمانہ میں دوستی ہوئی دونوں علم و ادب میں گہری بصیرت رکھتے تھے دن بھر اُن سے  
ہر موضوع پر گفتگو رہتی روکھی پھیلکی کھا کے ادھر ادھر کی بحث میں لگے رہتے کبھی  
مشرقی ہوٹل کی تنوری روٹیاں توڑی جاتیں کبھی چٹنی بنا کر پھلکے اڑاتے جاتے کلبیر سنگھ  
رہا ہو گئے تو انہوں نے بھی اسی بیٹھک کو دن بھر کی نشست گاہ بنا لیا اب دوہری تہری  
رونق ہو گئی سی آئی ڈی کانگراں سٹاف بڑھ گیا اختہ شیرانی بھی دوسرے تیسرے  
روز آبراجتے اور مطالبہ کرتے کہ —

شراب لامری حالت خراب ہے صافی

ہم لوگ صوفی صافی تھے اختر شراب پینے میں لاشرکیٹ ہم سے چھینا چھٹی کر کے  
پیے لے جاتے سرعام پیتے پلاتے ہمیں اس سے ایک خاص فائدہ پہنچا کہ سی آئی ڈی  
کاشیہ ہلکا ہو گیا انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ ایک دوستانہ مجلس ہے جس میں اختر شیرانی سا شرابی اور  
کلبیر سنگھ سا انقلابی دونوں جمع ہوتے اور ان کی گنگوگپ بازی تک رہتی ہے جب بیٹھک

۱۔ حال ہی میں سرطان کے مرض سے امریکہ میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے

سے دل لگتا جاتا تو ہم لاکالج کے ہوسٹل میں چلے جاتے اور وہاں منٹلی لگاتے اس کے باوجود سی آئی ڈی ہماری نیشتیں معتم نہ کر سکی اُس نے لاکالج کے پرنسپل سے شکایت کی اُس نے نوٹس ہی نہ لیا۔ کلبیر سنگھ اس فکر میں تھا کچھ ہونا چاہیے یہ کچھ ہونا چاہیے۔

میرے نزدیک کسی لحاظ سے بھی مفید نہ تھا میں نے کلبیر سے کہا کہ اول تو جنگ اتحادیوں کے حق میں ہوگئی ہے دوم اس مرحلہ میں مار دھاڑ قسم کا پروگرام خود کشی کے مترادف ہے سوم میں تشدد کا مطلقاً حامی نہیں اور نہ سیاسیات میں خفیہ کارروائیوں کو درست سمجھتا ہوں چہارم میرے نزدیک قومی تحریکوں میں عدم تشدد سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں مجھے اپنے پروگرام سے خارج کر دیجئے کلبیر سنگھ کچھ کرنے کے حق میں سوچتا اور مسلسل سوچتا تھا ایک دن وہ دوپستول لایا اور کہا کہ انہیں اپنے پاس رکھو میں نے کہا یہاں رکھنا مصیبت کا باعث ہوگا پولیس ذرہ ذرہ سے باخبر ہے اُس نے کہا میں بھی گھر میں نہیں رکھ سکتا سوچنے پر شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی کا نام ذہن میں آیا مولانا — چونی لال کاوش کے ہمراہ اکثر میرے ہاں آتے تھے۔ کلبیر سنگھ سے بھی انہیں لگاؤ تھا میں نے کلبیر سے کہا آؤ تاجور کے ہاں چلتے ہیں نظر بندی مانع تھی کیونکہ میں اپنے حدود سے باہر جا ہی نہیں سکتا تھا علامہ تاجور موجودہ اورینٹ ہوسٹل (چوک قلعہ گوجر سنگھ) کے عقب میں فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے میں نے کلبیر سے کہا تم تانگہ میں چلو اور گلی کے نکر پر پہنچ جاؤ لیکن ان گلیوں سے اس طرح نکلو کہ نگران کی نگاہ نہ پڑے میں شریف خالد کو ساتھ لے کر نکلتا اور سچ بچا کر پہنچتا ہوں۔ میں نے حلیہ بدلا اور خالد کی سائیکل پر سوار ہو کر علامہ کے ہاں پہنچ گیا دروازہ کھٹکھٹایا تو معلوم ہوا کہ گھر میں نہیں ہیں کاوش موجود تھا دیکھا تو حیران رہ گیا بڑی جسارت کی ہے "کاوش نے کہا اور اندر لے گیا مولانا رات بار بجے

بمک لاپتہ رہے ہم ان کا لحاف لے کر فرش پر لیٹے رہے کوئی سوا بارہ بجے مولانا تشریف لائے انہیں بھی حیرت ہوئی کہ ہم اور یہاں؟ پھر اس وقت؟ کچو کا دسے کر کہنے لگے ”پکڑے جاؤ تو پھر کیا ہو؟“

”کچھ بھی نہیں“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور حیب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہم اُن کے پاس اپنے دو پتول رکھنے آئے ہیں تو ایک لحظہ کے لیے سم گئے۔“

”اچھا تو کیا مجھے جیل بھوانے کی سوجھی ہے؟“

”جی ہاں۔ ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔“

”بھئی سی آئی ڈی کے فلاں سپرنٹنڈنٹ نے بلوایا تھا وہیں سے آ رہا ہوں تمہارا ذکر کرتے رہے میرے متعلق رپورٹ ہوتی ہے کہ میں تمہارے ہاں آتا جاتا اور وہاں کلبرینگ سے باہمی مشورے ہوتے ہیں انہوں نے مجھے تمہاری اور کلبرینگ کی خبروں سے آگاہ رکھنے کے لیے پانچ سو روپے ماہانہ کی پیشکش کی ہے۔“

”مولانا روپیہ نہ چھوڑیے موزیوں کا مال ہے یہ ہم بتا دیا کریں گے کہ آپ رپورٹ کیا کریں۔“

”توقید ہونے کا ارادہ ہے؟“

گھنٹہ آدھ گھنٹہ گپ شپ رہی آخر یہ دونوں پتول ہلانے کے پاس رکھ کر ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے پیسہ اخبار میں اس وقت تحریک رفاقت کے معتمد کی تختی کا شتمہ جاگ رہا اور نگران اونگہ رہا تھا یا پھر سڑک پر کتے بھونک رہے تھے میں شاپ شپ سیرٹھیوں کو چرتا پھاڑتا بیٹھک میں آگیا دروازہ چوہٹ کھلا تھا اور کوئی غیبی طاقت میرے تمام مسودات اٹھا کر لے جا چکی تھی۔

انگے روز کلیرنہ آیا تو تشویش ہوئی شاہ نور سٹوڈیو کے پاس اس کی کوٹھی تھی  
 جاتے کون! تاجور صاحب کا پیغام ملا کہ اپنے دونوں سودا لے جاؤ میں نے  
 نظر ثانی کر لی ہے ان کا خوف بھی ہاتھ تھا وہ بھلاستول کیسے رکھ سکتے تھے شام  
 کو پتہ چلا کہ کلیرنگ صبح تین بجے گرفتار کر لیے گئے اور اس وقت پیر اخبار کے  
 تھانے میں ہیں پولیس کا خیال تھا کہ ہم ان کا پھپھا کریں گے شاید کچھ ہاتھ آجائے ہم  
 نے چپ مادھلی دوسرے تیسرے روز کلیرنگ لاہور سنٹرل جیل میں چلا گیا اسکی گرفتاری  
 نے ہمیں چونکا دیا پتہ نہ چلا ہوا کیا ہے؟ حکومت نے ایک مراحتی بیان میں کہا کہ  
 کلیرنگ کو بیماری کی بناء پر چھوڑا گیا تھا اور یقین تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں علاج معالجے  
 تک محدود رکھیں گے لیکن انہوں نے مفاد عامہ کے خلاف بعض ایسی سرگرمیوں میں  
 حصہ لینا شروع کر دیا تھا کہ انہیں اس طرح کھلا چھوڑنا ملکی دفاع کے خلاف تھا لہذا  
 انہیں واپس جیل بھیج دیا گیا ہے۔

اس کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اختر شیرانی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ لاکالچ کے دوستوں  
 نے کچھ دن کے لیے آنا جانا ترک کر دیا۔ سی آئی ڈی کے نگران سٹاف کا پرہیز ہو گیا۔  
 دنوں تک یہ خدشہ رہا کہ حکومت شاید مجھے بھی گرفتار کر لے گی لیکن بلائلی ہی رہی  
 علامہ تاجور ایک دن بیگ اٹھائے ہانپتے کانپتے اٹکلے فرمایا

”کیسے ہو؟“  
 ”دعا ہے آپ کی“

”میاں یہ حرامی بچے میرے ہاں چھوڑائے ہو ان کی ماں کے ہاں پہنچاؤ۔ اس بڑے بچے  
 میں قید ہو گیا تو نیشن ہی باہر نکلے گی۔“

”لیکن مولانا! کلیر تو قید ہو گئے ہیں؟“

”تو میں انہیں کہاں رکھوں؟“

”آپ ایسا کیسے کہ ان دونوں بچوں کو راوی میں بہا دیجئے سب حدشے ڈوب جائیں گے۔“ اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا مولانا نے راوی سے واپس آ کر شکر ادا پڑھا اور سو گئے۔

نظر بندی تو خیر تھی ہی۔ زبان بندی بھی سمجھ میں آتی تھی لیکن قلم بندی سمجھ میں نہ آئی طبیعت لہرانے لگی تو اسرار بصری کے قلمی نام سے لکھنے لگا زمزم لاہور، الملل بلبلی اور احرار سہارنپور سیاسی طور پر ہم زلف اور ہم خیال اخبار تھے ان تینوں میں لکھتا رہا پابندیاں ختم ہوئیں تو اسرار بصری مستقل شعری نام ہو چکا تھا۔

نظر بندی کی وجہ کیا تھی خود میرے لیے مجسمہ تھا تقریباً سبھی احرار زعماء ان پابندیوں سے مستثنیٰ تھے مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی دھرم سالہ جیل میں تھے بائیں تھا جسے پانچ سال قید کے بعد بھی نظر بند رکھا گیا چودہری افضل حق کی وفات کے بعد مولانا منظر علی اظہر قائد احرار کملانے لگے انہوں نے ملک خضر حیات ٹوانہ کے ساتھ رشتہ موافقت استوار کر لیا لیکن بے سو اور بے بیکار نہ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رہا ہوتے نہ میری نظر بندی کا ٹٹا ختم ہوا۔ ایک دن اچانک ہی یہ خبر آگئی کہ مولانا محمد گلشیر کو سونے وقت گولی مار کر شہید کر دیا گیا ہے۔ زمیندار نے اس خبر کو پہلے صفحہ پر شہ سرخی دے کر شائع کیا۔ مسلم لیگ کے صوبائی زعماء نے ملزموں کی گرفتاری اور قرار واقعی سزا کا مطالبہ کیا لیکن مولانا منظر علی اظہر جو مولانا کی شہادت کے صدمے کو بُری طرح محسوس کرتے تھے ملک خضر حیات سے یہ کام بھی نہ لے سکے کہ حقیقی ملزم ہی پکڑے جائیں اور انہیں عبرت آموز سزا ہو مولانا علیہ الرحمۃ کا خون پولیس کے رازدارانہ قہقہوں میں گم ہو گیا اس قیمتی انسان کے

اٹھ جانے سے ایک ایسی جگہ خالی ہوئی کہ نہ احسار میں اس قسم کا انسان دوبارہ آسکا نہ  
کیمپوور کی مٹی ہی سے ایسا شخص اٹھاوہ بلاشبہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے  
میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس دھرتی پر قدرت کا عطیہ تھے۔

### عبداللہ ملک کی شادی

انہی دنوں عبداللہ ملک کی شادی قرار پائی۔ برات کو امرتسر جانا تھا عبداللہ ملک میرا  
جگری دوست تھا ہم دونوں میں رشتہ موانست انتہائی گہرا تھا ہم ایک دوسرے پر  
جان چھڑکتے تھے یہ سیاسی بال و پرتو اس کو بہت دیر میں لگے جب ہم دوست بنے  
تھے اس وقت گل و بلبل کی طرح ہم ایک دوسرے کے لیے فروری ہو گئے تھے۔  
میں نے قاعدہ کے مطابق ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی کہ مجھے اپنے اس  
عزیز دوست کی شادی پر امرتسر جانا ہے خود میرا گھر وہاں ہے اجازت دی جائے  
اجازت ہو گئی برات میں کمیونسٹوں کا ایک ہجوم تھا خفیہ پولیس کا ایک سپاہی میری نگرانی  
کر رہا تھا لاہور سے جس ڈبہ میں ہم سوار ہوئے وہ اسی میں آبیٹھا حالانکہ یہ ڈبہ ریزو تھا  
کامریڈوں نے دھکے مار کر باہر نکال دیا اس کم بخت نے واپسی پر رپورٹ کی کہ شورش  
کے ایما پر اُس نے یہ بدسلوکی ہوتی ہے حالانکہ اس کی اپنی جسارت نے اُسے خراب کیا تھا  
لفضان یہ ہوا کہ دوسری دفعہ جب میں نے ہمیشہ کی شادی پر انا لہ جانے کے لیے اجازت  
مانگی تو نکاسا جواب آگیا اللہ بخشے ڈاکٹر عالم اپنی ہی وضع کے آدمی تھے مستقل مزاج ہوتے تو  
آل انڈیا لیڈر ہو جاتے لیکن استقلال نہ تھا اس لیے سیاست میں کٹے ہوتے پتنگ کی  
طرح رہے آخر ہمیشہ کے لیے کئی کئی بیٹھے اپنے مفاد کے علاوہ کسی معاملہ میں بھی مخلص نہ تھے

دو اصولوں سے دو دوستوں سے ایک دن ان کا منشی میرے ہاں آیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ان سے کہتے میرے عدو و نظر بندی ان کی کو عی سے ہیں پچیس قدم ادھر رہ جاتے ہیں کس طرح آسکتا ہوں؟ ڈاکٹر صاحب نے حکم حضرت عیاء کو خط لکھا کہ نظر بندی ختم کر دی جائے یا لاہور کارپوریشن تک بڑھا دی جائے ان کا خط گھومتا پھرتا سی آئی ڈی تک پہنچا ایک دن سید اعجاز حسین شاہ تشریف لائے اور مجھے اپنے انگریز سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے۔

”جناب! یہ ہیں شورش کاٹھیری“

”شورش کاٹھیری“

”جی ہاں“

”بالکل نوجوان“

دو اور انگریز آفیسر پاس ہی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں بھی کرسی کو کروٹ دے کر بیٹھ گیا۔

”آپ کی درخواست پہنچی ہے!“

”کونسی درخواست؟“

”نظر بندی ختم کرنے یا عدو و بڑھا دینے کے متعلق“

”جی میں نے کوئی درخواست نہیں دی“

”ڈاکٹر عالم نے خط لکھا ہے“

”انہوں نے اپنے طور پر لکھا ہوگا۔“

قدرے توقف کے بعد ————— جگ کے بارے میں تمہارا خیال



”یہ ہے؟“

”خیال؟“

”ہاں“

”آپ خیال پوچھتے ہیں یا خواہش؟“

”فرق کیا ہے؟“

”ان میں بڑا فرق ہے“

”خیال کیا ہے؟“

”استحادیوں کی فتح کے آثار روشن ہیں“

”اور خواہش —؟“

”جس کے لیے پانچ سال قید کاٹی ہے اور اب بھی نظر بند ہوں“

”وہ گوراکر سی سے اچھل پڑا۔ آپ پہلے شخص میں جس نے اس بے باکی

سے بات کہی ہے۔“

”اچھا تمہارے مدد و نظر بندی لاہور کارپوریشن تک بڑھا دیئے جاتے ہیں۔“

### ڈار اور چڈھا

ناگاہ معلوم ہوا کہ پروفیسر تلک راج چڈھا اور یامین ڈار لغرض علاج میوہسپتال کے

فیملی وارڈ میں داخل ہو گئے ہیں دونوں پولیس کے زبردست پیرے میں تھے ایک دن پینچا

ملا کہ چڈھا جی یاد کرتے ہیں ظاہر ہے کہ بلا اجازت اُن سے ملنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

تاہم سو پینچ سا پینچ کر پیغام بھجوا دیا کہ آج بارہ بجے شب حاضر ہوں گا سر پر ڈیڑھ فنڈ

کاٹھولسکا باٹوانوں کی سی شکل بنائی اور ہسپتال پہنچ گیا ایک اونگھتا ہوا کنسیٹبل ڈیوٹی پر تھا ملاقات ہو گئی اس کے بعد بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن ان کا مقصد کسی پولیسنگ نہ تھا محض ایک دوستانہ اخلاص تھا۔ ایک دن مولانا مظہر علی انظر نے بلا بھیجا کہنے لگے چڑھا سے تمہاری ملاقاتوں کا سی آئی ڈی کو علم ہو گیا ہے اب گئے تو پکڑے جاؤ گے۔ پولیس گھات میں بھیٹا ہے۔ یہ اطلاع انہیں سی آئی ڈی کے ایک مسلمان آفیسر سے ملی تھی جو مجھے گرفتار کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا میں چونکہ ہو گیا اور دوبارہ میوہسپتال کا رخ ہی نہ کیا۔

### اخلاقی زوال

پر بودھ چندرا اور لالہ جی ابھی تک جیل میں تھے مکان ان کی اپنی ہی بلڈنگ ویرا ہوٹل کے بالائی حصہ میں تھا گھر میں صرف بچیاں ہی تھیں یا گود کا بچہ جس شخص نے ہوٹل کرایہ پر رکھا تھا اُس نے سارے ہوٹل کو شراب خانہ یا چکلہ بنا دیا تھا اس دردناک صورتحال سے سارا خاندان پریشان تھا پولیس نے کان بہرے کر لیے تھے ایک رات ان حالات کا جائزہ لینے کے لیے میں ویرا ہوٹل جا پہنچا شریف خالد میرے ساتھ تھے وہ سب کچھ موجود پایا جس کا چہرہ چاہتا ٹھیکیدار سے بہت کچھ کہا لیکن اس کی عزت مرچلی تھی پہلے بھی کئی دوست اُسے سمجھا چکے تھے لیکن وہ ٹھیکے اور دھندے میں سے کوئی چیز چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا اس کے نزدیک یہ بزنس تھا غصہ میں جھلا کر کہنے لگا آپ عجیب مسلمان ہیں کہ ایک ہندو کے لیے میرے بزنس کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ تمام واقعات سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی کو لکھے اس کی ایک نقل سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کو بھیجی ان دونوں شریف انگریزوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہفتہ عشرہ میں ٹھیکیدار کو نکال دیں گے

یہی ہوا جس ٹیکسیدار کی مونچس نیچی نہیں ہوتی تھیں وہ اس طرح نکلا جس طرح دودھ میں سے کھی نکال دی جاتی ہے تھوڑے دنوں بعد پر بودھ جی بھی رہا ہو گئے ان کے مہینہ دو مہینہ بعد لالہ پنڈی داس بھی آگئے میرا حلقہ نظر بند جی کارپوریشن تک بڑھ چکا تھا پر بودھ نے مجھے پیسا اخبار کا ماحول چھوڑ دینے پر آمادہ کیا بظاہر پیسہ اخبار کے لوگ مفلس اور مخلص تھے لیکن ان میں ہر تیسرا آدمی پولیس کا مجس تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ویرا ہوٹل میں آ گیا اور یہاں ایک انگ کرے میں رہنے لگا۔

### یامین ڈار کی رحلت

تک راج چڈھا واپس چلے گئے تو ان کی جگہ کلیرنگ آگے کبھی ہسپتال کی دیواروں کے پاس سے گزرتا تو ان سے اور یامین ڈار سے علیک سلیک ہو جاتی۔ کلیرنگ انٹریوں کی دق میں مبتلا تھا۔ یامین اختلاج قلب میں۔ حکومت نے ان دونوں کو بارہا پیش کش کی کہ وہ ذاتی چلکے پر رہا ہو جائیں اور یہ وعدہ کریں کہ جب تک صحت یاب نہیں ہونگے پالیٹکس میں حصہ نہیں لیں گے لیکن دونوں اپنی دھن کے پکے تھے اور ٹکا سا جواب دے چکے تھے۔

ایک روز ابھی پونہ نہیں بھٹی تھی کہ پر بودھ نے جگا دیا ایک سوہان روح خبر تھی  
 ”اٹھو یامین وفات پا گیا ہے“

”انا للہ وانا الیہ راجعون آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”میو ہسپتال سے فون آیا ہے کہ ویرا ہوٹل میں پر بودھ کی معرفت شورش کو اطلاع کر دو کہ یامین ڈار رحلت کر گیا ہے دل کا آخری دورہ پڑا تو اس نے شغف سے کہا میرا

آخری وقت آپنچا ہے ویرا ہوٹل میں پر بودھ کے ہاں شورشن کا ٹمیرن ٹھہرا ہوا ہے اُسے فون کرو کہ آکے مل لے بظاہر کسی سیاسی قیدی کے متعلق اطلاع دینے کا سٹاف تو کیا کسی ڈاکٹر میں بھی حوصلہ نہ تھا۔ اُس وقت سٹاف نے سنی اُن سنی کر دی لیکن جب تھوڑی دیر بعد دل کا حملہ مہلک ثابت ہوا تو اُس نے پر بودھ کو فون کیا ہم دونوں فوراً ہی ہسپتال پہنچے یا مین اپنے کمرے میں ابدی نمیند سورا ہا تھا پولیس کے جوان بدستور پہرہ دے رہے تھے تھا نیدار نے رد کا جب تک ڈس آئی جی نعش کو ملاحظہ نہ کر لیں اور ریلیز آرڈر (Release order) نہ ملے اس وقت تک آپ مرحوم کی نعش کے پاس اندر نہیں جا سکتے ہیں کلیر زار و قطار دور ہا تھا وہ خود پولیس کی نگرانی میں تھا لیکن ہمیں دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا گلے مل کر رو دیا اور اس طرح رویا کہ ساون بھادوں کی جھڑپی لگ گئی۔ کئی گھنٹے بعد ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے لاش ہمارے حوالے کی جنازہ اس بے بسی کے عالم میں اٹھا کہ مہینوں ملال رہا۔ یا مین کے چار بھائی تھے ایک بمبئی میں پروفیسر تھا جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ دوسرے مولوی عبدالغنی مشہور کانگریسی لیڈر تیسرے لاہور کی احمدیہ جماعت میں تھے۔ چوتھے شیخ غلام محی الدین جو اُس وقت سیکرٹریٹ میں سرٹینٹ تھے اور اسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوتے آج کل انجمن حمایت اسلام میں انریبری اسٹنٹ سیکرٹری ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں بھائی لاہور ہی میں تھے ہم نے ان کے عزیزوں کو اطلاع کی تو محسوس ہوا انہوں نے اس خبر کو سرد مہری سے قبول کیا ہے گمان یہ تھا کہ وہ پولیس کے عتاب سے بچنا چاہتے ہیں ہم نے فوراً ہی کفن کا انتظام کیا اس اثنا میں پولیس کے اعلیٰ افسروں سے بھی جھڑپیں ہو گئیں شاید انہیں اندیشہ تھا کہ یہ انسان جو سو گیا ہے جاگ اٹھے گا بھر حال ہم نے ان کی نعش کو ایک ریڑھی میں رکھا۔ کانگریس کے بعض راہنماؤں نے ازراہ عقید

اس پر ترنگا ڈالا اور ہم بس بچپن دوست یا مین زندہ باد کہتے ہوئے بسوں کے اڈہ کو روانہ ہو گئے  
 لاش امرتسر پہنچی تو ان کے اعزہ واقربا میں کھرام مچ گیا۔ سینکڑوں خواتین نے اس شدت سے  
 ماتم کیا کہ زمین و آسمان ہل گئے لیکن سی آئی ڈی والے باسنور تانک تھانک میں تھے کہ  
 کون کیا کرتا ہے۔

یامین کی موت کا ہفتوں قلم رمارہ رہ کے یہ خیال ستا رہا کہ ایک مخلص دوست اٹھ  
 گیا۔ ایک بہادر انسان چل بسا۔ ایک ایسے شخص کی موت واقع ہو گئی جو سزا پا باغ و بہار  
 تھا۔ موت نے اس کو کس حوصلہ کے ساتھ فتح کیا ہوگا۔

وہ چاہتا تو رہا بھی ہو سکتا تھا لیکن اُس نے ذاتی چلند دینا بھی قبول نہ کیا جسم کی  
 موت قبول کرنی لیکن عزت کی موت قبول نہ کی اسی کا نام ایثار ہے اور وہ ایثار کر کے امر  
 ہو گیا —



نظر بندی کا دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ اس عرصہ میں صرف یہ فرق پڑا کہ نظر بندی کے حدود دو تھانوں تک وسیع ہو گئے۔ لیکن پولیس کی نگرانی بڑھ گئی۔ ہر وقت سی۔ آئی۔ ڈی کے اہل کار نگہبین کی طرح ساتھ رہتے۔ کوئی ملنے آتا تو اس کا پیچھا کیا جاتا کون ہے؟ اور جب تک غلط یا صحیح پتہ نہ لگ جاتا کہ فلاں آدمی ہے، اُس وقت تک سی آئی ڈی کے اہل کار پریشان رہتے۔ کسی وقت طبیعت اُکتا جاتی۔ میں اُٹھ کے دوستوں کے ہاں چلا جاتا تو یہ لوگ ان کیلئے پریشانی کا باعث ہوتے۔ محلہ والوں سے ان کا حدود اربعہ دریافت کیا جاتا۔ تعلقات کی نوعیت معلوم کی جاتی۔ نتیجہً وہ لوگ جو محض دوست تھے اور کسی اعتبار سے بھی سیاسی نہیں تھے ایک طرح کی سرمایگی کا شکار ہوتے۔ کئی دوستوں نے اس ڈر سے ملنا چھوڑ دیا دوچار کئی کتر اگئے۔ بعض ڈٹ جاتے اور سی۔ آئی۔ ڈی کی اس روش پر تہمتیں لگاتے۔

پسا اوقات ہم سی آئی ڈی کے بے خود پریشانی پیدا کرتے ، بعض دوستوں کو پراسرار ملتے جس سے ان میں تجسس پیدا ہوتا۔ وہ ادھر ادھر دوڑتے پھرتے اور کئی کئی دن بدھو بنے رہتے آخر تک ہار جاتے۔ رپورٹوں کے متعلق تو معلوم نہیں کیا لکھتے اور کیا جکتے تھے لیکن کئی دفعہ زچ ہو کر ہاتھ جوڑنے لگتے اور ہتھیار ڈال دیتے۔ سی۔ آئی۔ ڈی میں کنسیٹیبلوں سے لیکر سب انسپکٹروں تک کی عمارت عجیب و غریب تھی۔ انگریزوں نے اہل کار کے بجائے اہلکار قسم کے لوگ غداری اور وفاداری کے معیار پر بھرتی کئے تھے جو صرف اس خدمت پر مامور تھے کہ جرائم کمریدیں، انعام پائیں اور برائیوں کے ڈبیر چن چن کر آقا یان ولی نعمت کی خدمت میں حاضر کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی عملداری میں سی۔ آئی۔ ڈی کے بندوستانی اہلکار قوم فروش اور ملک دشمنی کی شرمناک تصویروں کا ایلم تھے !

یامین کا انتقال میری اس منظر بندی کے دوسرے سال کی پہلی سہ ماہی میں ہوا تھا اور پر بودہ اس کی رحلت سے کوئی ہینہ بھر پہلے رہا ہوا تھا لیکن اس کی صحت کے درد دیوار اہل گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اس کے چہرے مہرے کی نام رونقیں رخت سفر باندھ کر رخصت ہر چکی ہیں۔

ان واقعات کو سن دس سال کی ترتیب کے لحاظ سے نہیں بلکہ عنوان و تذکرہ اور بعض جگہ برائے نام تکرار کے تحت قلم بند کیا ہے۔

ان دنوں جو درد اندر ہی اندر گھٹن کی طرح کھانے جا رہا تھا وہ میسر جہاں سال بھائی یورشس کا شیری کی بیماری تھی۔ وہ تیس چوبیس سال کا ایک کڑیل جوان، بالابلند خوبصورت و جیبہ و تشکیل ذہانت اور فطانت دونوں کے صدف کا موتی۔ قدرت نے اس کو تحریر و تقریر کی خوبیاں عطا کی تھیں وہ اپنا راہنما مولانا ابوالکلام آزاد کو سمجھتا تھا اس پر ان کے فلم کا لے مداثر تھا۔ عملاً سیاسی آدمی نہ تھا۔ صرف کتابی مطالعہ نے اسے ان کا



گردیدہ کر دیا تھا۔ اُبلا سفید کھدر پہتا جو اس کے گورے چٹے رنگ پر خوب کھلتا تھا۔ کبھی کبھار کھڑی کے چیک بھی پہنتا۔ پاؤں میں چپل سر پر جناح کیپ اٹکھیں تو اُس نے ایک خوشحال گھرانے میں کھولی تھیں لیکن دس ہی برس کا تھا کہ صدموں سے دوچار ہونے لگا۔ موت تک وہ مصائب ہی کا شکار رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خوشحالی اور خوشی نے اُس سے کٹی کر لی ہے۔ جس مصیبت اور اذیت سے ہم نے تیسرہ چودہ برس کا یہ زمانہ کاٹا اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہیں آج بھی اُن دنوں کا تصور آتا ہے تو دل کانپ کانپ اٹھتا ہے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو بھی اُن بُرے دنوں کی بد عادتیتے ہوئے خوف آتا ہے۔

شاعری اور ادب کی چٹیک د لگی ہوتی تو بلاشبہ میں یورش سے پہلے مرجاتا یا پاگل ہو جاتا لیکن اسی چٹیک نے مجھے زندہ رکھا اور اب تک جی رہا ہوں۔

اتقانات دیکھتے جب بھی میری شادی کا معاملہ ہوا فید پیش آگئی نتیجتاً ایک کے بعد دوسرا رشتہ ٹوٹتا گیا۔ اب کے صورتحال مختلف تھی اُجباب نے زور دیا کہ شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ مہینوں انکار کرتا رہا آخر سپر انداز ہونا پڑا نظر بندی کے دن روزگار مفقود۔ ع

کوئی دیرانی سی دیرانی تھی

کوئی انسان کسی سے امداد لینا ہے تو جو چیز سب سے پہلے رخصت ہوتی ہے وہ عزت نفس ہے ایک عزت مند شخص اپنی ہی نگاہوں سے گرجاتا ہے ان شدید احساسات کے باوجود مجھے امداد قبول کرنی پڑی یہ امداد میں نے سوال کر کے نہیں لی تھی بلکہ پیشکش ہونے پر قبول کر لی تھی۔ میاں قمر الدین رئیس اچھرہ بڑے ہی فیاض اور نیک دل انسان تھے قدرت نے انہیں دولت کے ساتھ ایمان بھی دیا تھا وہ بھی مصر تھے کہ شادی کر لوں۔ رشتہ موجود تھا لیکن سامان نہ تھا۔ گڑبوں کی شادی میں بھی دس بیس روپے خرچ ہو جاتے

ہیں۔ میرے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی۔ میاں صاحب نے اس غرض سے پانچ سو روپے عنایت کیئے بد قسمتی ملاحظہ ہو کہ اسنی دنوں یورشل کا مرض تیسرے درجے میں داخل ہو گیا وہ دن رات ہلکے ہلکے بخار میں پھلکتا اور خون تھوکتا۔ ایک دن اُسے قے میں اتنا خون آیا کہ بیچک کی نالی سُرخ ہو گئی اب تک وہ ادنے پونے جی رہا تھا اُس نے صبر و رضا کا دامن تھام رکھا تھا اس کی یہ خطرناک حالت دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ اب وہ موت کی راہ پر آ گیا ہے اور چند روز کا مہمان ہے جو علاج ہو رہا تھا وہ علاج نہیں تھا صرف خواہش علاج کی ادھوری کوششیں تھیں معلوم ہوتا تھا جیسے اُفلاس اور مصیبت نے ہمیں انتخاب کر لیا ہے روپیہ ہو تو علاج ہو یہاں جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ شورش کا شمیری کا نام تو ملک کے ہر سیاسی گوشے میں گونجتا تھا اور سائین کے اعلیٰ و ادنیٰ حلقے بھی متعارف و معروف تھے مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ جس شخص کی خطابت پر لوگ سرد ہنستے ہیں اور جو ابھی ابھی قید کے پانچ سال گزار کے آیا اور اب نظر بندی کا دوسرا سال گزار رہا ہے اس کی جیب میں چند ٹکے بھی نہیں ہیں۔ والد کی آمدنی قلیل تھی بیماری پر خرچ ہو جاتی میری کوئی مستقل آمدنی نہ تھی کچھ لوگ خطبات لکھواتے یا مسودوں کی تصحیح کرا لیتے اُن سے پچاس ساٹھ روپے کی جو آمدن ہوتی وہ نام کے رکھ رکھاؤ پر اٹھ جاتی تھی۔

میں نے محمد طفیل اب مدیر نقوش اور لطیف فاروقی اب مدیر زراعت کی خواہش پر مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبات مرتب کیئے۔ ان دونوں نے ان دنوں کتابوں کا مشترکہ کاروبار شروع کیا تھا اور یہ ان کی طرف سے پہلی کتاب شائع ہو رہی تھی انہوں نے مجھے دو سو روپے دیئے اُردو اکیڈمی کی طرف سے میری ایک اور تالیف آزاد ہند فوج کی تاریخ تو پہلی چلو کے نام سے شائع ہوتی اس کے مجھے کل چار سو روپے ملے۔ یہ چھ سو روپے میں نے یورش کی بیماری پر

ہو دیا لیکن اس کا مرض انتہا ہنسکا اور مہلک تھا کہ ہم لوگوں کے تصور و تخیل سے بھی پرے تھا ہم کی بھی دروازے پر دستک نہ دے سکتے تھے۔ میوہسپتال ہمارے لیے بند تھا۔ وہاں مریضوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ نیا داخلہ ملنا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں نظر بندی کے باعث میوہسپتال میں جا نہیں سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ میں ذاتی طور پر کسی ڈاکٹر سے مل ملا کر یا استدعا و التماس کر کے داخلہ حاصل کر لیتا لیکن اس وقت بے بس تھا والد لاپچار تھے کسی ڈاکٹر کو اس مرحلہ میں راضی کرنا مشکل تھا ویسے بھی تپدق کے مریض کو آخری حالت میں کون داخلہ دیتا لاہور سے باہر کسی کلینک میں یا سینٹی ٹوریم میں مجھوانے کا سوال گھریلو حالات کی معاشی عاقبتی کے باعث ناممکن تھا۔ زمانہ رسوخ کا تھا اور رسوخ ہمارے لیے عنقا تھا۔

حکام کو بارہا لکھا کہ وہ نظر بندی کے حدود گوانڈی کے تھانے تک بڑھا دیں تاکہ بھائی کو میوہسپتال میں لے جا سکوں سننا کون؟ مدت تک درخواست پڑی رہی سی آئی ڈی کے فرسٹوں نے رپورٹ کی کہ کلبر سنگھ سحر گل اور یامین ڈار میوہسپتال میں زیر علاج ہیں لہذا شورش کاشمیری کا وہاں جانا ان حالات میں نامناسب ہے انہیں احساس ہی نہ تھا کہ ایک کڑیل جوان تپدق سے مر رہا ہے اس کی حالت نازک ہے اور شاید چند منہتوں کا مہمان ہے۔ سی آئی ڈی کے اہلکاروں کا شیوہ یہی رہا ہے کہ وہ انسانوں کے منفی پہلو تلاش کرے اور شقاوت قلبی کو احساس فرض قرار دے۔ ان لوگوں نے انگریزی حکومت کے مخالفوں کی قبریں اکھڑیں کفن پھاڑے اور لاشیں سڑھی میں کہ شاید اس طرح انہیں کوئی چیز مل جائے جو ان کی خدایاتِ جلیہ کے اعتراف و انعام کا باعث ہو۔

یوریش موت کی طرف گامزن رہا جو علاج مقدرت میں تھا بے اثر رہا جہاں تک

قیمتی دواؤں یا بڑی نفیسوں کا سوال تھا بس سے باہر تھیں۔ ڈاکٹر عبدالقوی القمیان کسی زمانے میں مجلسِ احرار کے خزانچی رہے تھے وہ بہت اچھے معالج سمجھے جاتے تھے ان کا نام ذہن میں آیا خیال تھا حالات سے آشنا ہیں اور رعایت کریں گے مگر انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مرض خطرناک ہے مریض چک سکتا ہے ضرورت روپیہ کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس نوجوان کی زندگی ہر قیمت پر مطلوب ہے میرا بھائی ہے اور بھائی کے لیے جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔ میں نے عرض کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوا انجکشن کیے مکسجر کی ایک بوتل دی اور سولہ روپے نقد دھرائیے اگلے روز تین انجکشن اٹھارہ روپے نقد تمیر سے رز دو ٹیکے کچھ گولیاں اور اکیس روپے نقد۔ خطبات آزاد اور دہلی چلو کی رقم دونوں ہی میں آڑ گئی۔ اب کہاں جائیں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب بغیر پیسے کے علاج نہ کر سکتے تھے انہوں نے صبح فرمایا کہ دو برس کے مرض کا علاج ہفتہ مہر میں ناممکن ہے اس بیماری میں ہر سانس روپیہ چاہتا ہے ستم یہ تھا کہ بورش جس کو ٹھڑی میں رہ رہا تھا وہ بجائے خود بلیک ہول تھی وہاں دن کو سورج چمکتا نہ شب کو چاند اس کی تمیر ہی ایسی تھی کہ چوبیس گھنٹہ گھپ اندھیرا رہتا صفائی کا معاملہ اس سے بھی خراب تھا۔ افلاس اپنے عروج پر تھا احرار کا نفرنسین شورش کا شمیری زندہ باد کے نعروں سے گونجی تھیں اور ملاقات کو وہ لوگ بھی آتے جاتے تھے جن کے کتوں کو بھی آبِ حیات مل سکتا تھا لیکن مریض کو ہم ایک سیب بھی خرید کر نہ دے سکتے تھے میں بورش کو اس کال کو ٹھڑی سے نکال کر اپنی بیٹھک میں لے گیا بیٹھک کا حال اس سے مختلف ضرور تھا لیکن مریض کے لیے بہر حال ہلک تھا مرض میں اضافہ کا پورا سامان موجود تھا نیچے ڈھلائی بھٹیاں تھیں جہاں دوکاندار دن بھر لوہا پگھلاتے ظالم دھواں بیٹھک کے کونوں کھدروں

میں محسوس آتا مریض کو سخت تکلیف ہوتی لیکن گردشِ تقدیر کا یہ تماشا ہوتا رہا اور ہم مجبور تھے خطرناک بیماری خطرناک فریبی اور خطرناک عاجزی کے ہاتھوں شکست کھا کر حکیموں کا علاج شروع کیا ہلکا بھی اور مفت بھی — —

لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شفاء الملک حکیم محمد حسن قریشی کے صاحبزادے حکیم آفتاب احمد قریشی میرے مخلص دوست تھے انہوں نے اپنے مطب کا برقیمنی نسخہ آزما لیا لیکن مرض گرتا ہی رہا کسی نے کہا حکیم عبدالوہاب نابینا کے صاحبزادے اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بیٹے نیا گنبد کے چوک کی ایک عمارت میں مطب کرتے ہیں اُس سے رُجوع کرو معلوم ہوا کہ وہ امراء کے سوا کسی کے ہاں نہیں جاتے۔ میں یورش کو کاندھوں پر اٹھا کر ان کے ہاں لے گیا مطب غسری منزل میں تھا سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے خود میری سانس پھول گئی حکیم صاحب نے دس بارہ منٹ تو جبر ہی نہ کی کسی دوست سے گفتگو کرتے رہے پھر نہایت تمکنت سے مریض پر نگاہ دوڑائی اور کچھ پوچھے بچھوڑے بغیر نسخہ لکھ کر اپنے اسسٹنٹ کے حوالے کیا اس نے خمیرہ قسم کی کوئی حمیہ دے دی قیمت پوچھی تو جواب ملا حکیم صاحب مفت علاج فرماتے ہیں شکر کیا بھرا گئے۔ یورش سے کہا دوائی تو اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا میں دوائی نہیں لوں گا جس حبیب کے چہرے پر شگفتگی نہیں اور جو مریض سے ہنس کر بولنے میں اپنی وضعداری کی ہنک سمجھتا ہے اس کی دوائی مریض پر کوئی اثر نہیں کر سکتی ہے۔“

میں نے زور دیا کہ دوا اور حکیم دو مختلف چیزیں ہیں اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خمیرہ اٹھا کر زمین پر پھینک دیا کہنے لگا میں نے یہ دوائی کھائی تو فوراً ہی مر جاؤنگا۔ اس بے بسی میں ایک اور حکیم محمد دین الراعی کا پتہ چلا وہ گتیر بلڈنگ میں مدت

سے پرکیش کرتے تھے شہرت اُن کی یہ تھی کہ تپدق کے اچھے معالج ہیں اور کئی مریض ان سے شفا پا چکے ہیں انہوں نے خود اگر علاج شروع کیا اور اس شفقت کا ثبوت دیا کہ ایک لحظہ کے لیے اپنی بے مائیگی کا احساس جاننا ہالیکن دوامف مل سکتی تھی غذا نہیں۔ تپدق کا مریض غذا بھی چاہتا ہے۔ حکم صاحب نے دوستوں کو بھی مات کر دیا لیکن یورش کا مرض بڑھتا ہی گیا وہ تیزی کے ساتھ موت کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ معلوم ہوا کلکتہ کے ایک وید شاہ عالمی دروازے کے باہر مطب کرتے ہیں۔ ان کے پاس بڑا مفید نسخہ ہے اس نیک نفس انسان نے بھی علاج شروع کیا پہلے ایک دو روز تو دوائی کاروپہ ڈیڑھ روپیہ لیتا رہا پھر چھوڑ دیا ہم نے اصرار کیا نہ مانا۔ وہ مریض اور گھر دونوں کی حالت دیکھ کر متاثر ہوا ایک دن اُس نے بازار سے کوئی دوائی تجویز کی کل دس روپے قیمت تھی لیکن اس دس روپے نے اس کا علاج بھی جھڑا دیا۔ مریض بربشکال زدہ دیوار کی طرح گر رہا تھا ایک دن اس قدر ترپا کہ ہم سب ملبوس ہو گئے والد اداریں نے بہنوں کو اس کے پاس چھوڑا اور خود بے سوچے سمجھے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میرے پاس صرف تین روپے اور بارہ آنے تھے والد کے پاس ایک روپیہ اور دو آنے ایک سنگین کتکاش نے گھر رکھا کھاکوئی چار گھنٹے تک میں اور والد موری دروازہ کے باہر گنپت روڈ کے چوک میں ہی کھڑے رہے والد مجھ سے بھی زیادہ خود دار تھے انہوں نے سوال کرنا سیکھا ہی نہ تھا غور کیجئے ایک کا جوان بیٹا دوسرے کا جوان بھائی مر رہا ہے اور معاملہ صرف اس پر اٹکا ہوا ہے کہ گھر میں مال نہیں اور علاج روپیہ چاہتا ہے یہاں کھڑا رہنا بھی علاج نہ تھا لیکن ہم دونوں باپ بیٹا یہاں اس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی اجنبی طاقت ہمارے لیے دوائی لا رہی ہے یا کوئی عینی ہاتھ مدد کو آ رہا ہے گویا ہم نے اپنے نفس کو دھوکہ دے لیا تھا کہ

اس طرح کھڑا رہنے سے رلیض اچھا ہو جائے گا کوئی سی چیز بھی نہ تھی لیکن ہم کھڑے تھے  
 کبھی چپ رہتے کبھی ایک آدھ لفظ بول لیتے والد کے منہ سے عاجزی میں نکل گیا —  
 ”کہاں جائیں۔ قرض مانگیں تو ملتا نہیں۔ بل جائے تو چکانے کی طاقت نہیں۔  
 بھیک مانگیں تو عزت جاتی ہے اللہ بے نیاز ہے امیروں کی بیماری غریبوں کو لگ گئی ہے۔“  
 اُن کا یہ آخری فقرہ میرے دل میں ترازو ہو گیا میں یوں ہو گیا جیسے  
 کوئی لاش ہو۔

جو دوست میری شادی کی نگر میں تھے اور اپنے طور پر روپیہ جمع کر رہے تھے  
 انہیں معلوم تھا کہ اس کا جوان بھائی مر رہا ہے لیکن اس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔  
 مولانا منظر علی اظہر دوسرے تیسرے روز خبر لے جاتے باقی احسار دوست بے نیام  
 تھے انہوں نے گویا یہ فرض کر لیا تھا کہ سب اچھا ہے۔

ایک دن اچانک میاں قمر الدین نے یاد فرمایا۔ حاضر ہوا تو کہنے لگے۔

”شادی کب کر رہے ہو؟“

”میں تو بھائی کی وجہ سے سخت پریشان ہوں“

”سنا ہے کہ اس کی حالت خراب ہے“

”جی ہاں“

”وہ پانچ سو روپیہ اس کی بیماری پر تو نہیں لگا دیا۔ دوبارہ میں شادی

کے لیے کچھ نہ دوں گا؟“

ان کلمات سے میں لرز گیا میاں صاحب اس قسم کے آدمی نہ تھے لیکن ان کی  
 زبان سے یہ کلمات نکل گئے میں ابدیدہ ہو کر اٹھے پاؤں گھرا گیا۔ مستر میس الدین

کو بلا بھیجا انہی کے پاس سے روپیہ تھا اور وہی شادی کا انتظام کر رہے تھے ان سے کہا کہ پانچ سو روپیہ کی رقم فی الفور میاں قمر الدین کو واپس کر دو وہ بھاگ بھاگ مولانا منظر علی اظہر کے ہاں پہنچے۔ مولانا نے مجھ سے واقعہ پوچھا میاں صاحب کے ہاں گئے میاں صاحب نے گاڑی بھیج کر مجھے بلوایا۔ دیر تک معذرت کرتے رہے انہیں شوہر بھی تعلق تھا کہ نہ جانے اُن کے منہ سے یہ کلمہ کیونکر نکل گیا؟

میں یہی سوچتا رہا کہ پانچ سو روپیہ زیادہ وزن رکھتا ہے یا ایک سو سال بھائی اجیں کو افلاس نے تپ دق کے حوالے کیا اور تپ دق نے قبر سے فریب کر دیا ہے۔ حضرت شفاء الملک نے کہلا بھیجا کہ وہ ایک طبی بورڈ ترتیب دے کر یورش کو دیکھنا چاہتے ہیں کیا راتے ہے؟ عرض کیا میری راتے کیا ہو سکتی ہے اس معاملہ میں راتے تو آپ کی ہے لیکن یہ بورڈ کو ٹھیوں میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں کو ٹھریوں میں نہیں۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ یورش ختم ہو رہا ہے بلکہ ختم ہو چکا ہے اب طبی بورڈ کیا میجانی کر سکتے ہیں؟ نسبت روڈ کے چوک اور چیمبر لین روڈ کے نگر پرجیم دینا تاہ کو ہلی کا دو اخاند تھا۔ ان کے پاس دق کا تیر بہدف علاج بیان کیا جاتا تھا۔ ان سے عرض کیا تو وہ مریض کو دیکھنے گھر میں آگئے پہلے وزن کیا پھر دوائی دی اگلے دن دوبارہ وزن کیا مایوسی ظاہر کر کے چلے گئے۔ کئے لگے مریض کو اس جگہ سے لے جاؤ یہ دھواں جو اڑا اڑ کر اند آتا ہے اس کی زندگی کو اور تلخ کر رہا ہے مرض میں بڑا نڈ پیدا ہونے کا خدشہ ہے کہاں لے جائیں؟ یہی سوچا کہ اعاطہ لالوشاہ کی کچی کو ٹھری میں واپس کر دیں جہاں گھر روشنی نہیں ہے تو دھواں بھی نہیں — چنانچہ یورش کو بلٹھیک سے اٹھا کر کو ٹھری میں بھجوا دیا — اس دردناک صورت حال کا ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور سلیٹھ سدرشن کو پتہ



چھاتر تشریف لائے گنگارام ہسپتال میں داخلہ پر زور دیا داخلہ کی ذمہ داری وہ خود لے رہے تھے ان کے بُشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ دل سے ہمدردی کر رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہو چکا تھا کہ پرسش میں زندگی کی اب کوئی رست باقی نہیں رہی وہ جلد ہی رخصت ہو رہا ہے اس کا سپید و سرخ چہرہ زرد ہو کر ماند پڑ گیا تھا اس میں حرکت کرنے کی سکت بھی نہیں تھی وہ چراغ آنس رہا تھا۔ میں اُسے کن انگلیوں سے تھک کر بٹھیک میں چلا آنا اور دروازہ بند کر کے دیر تک روتا میرا بازو ٹوٹ رہا تھا زندگی اس کے لیے مشکل اور موت آسان ہو گئی تھی کسی کئی گھنٹے سر بہ زانو ہو کر سوچا کرتا موت نے اسے کیوں منتخب کیا ہے؟ وہ اس جوان سال کو چھوڑ نہیں سکتی؟ دماغ میں خیالات کا ایک تاسا بندھا رہتا۔ طرح طرح کے افکار گھومتے پھرتے۔ ایمان کا دامن چھوڑتے ہوئے خوف محسوس ہوتا آخر میت ایزدی کے سامنے سر جھکا دیتا اور یقین کرتا کہ اللہ کی رضا ہی میں بہتری ہے کبھی کبھی انگلی تھام کر منفی خیالوں کے غار میں لے جاتا تو وہاں دیر تک خدا ہے کہ نہیں ہے" کے سوال پر سوچنا۔ مثبت پر نکتہ چینی کرتا لیکن دل ہمیشہ ہی مسلمان رہا۔ معنی خیالات جلد ہی صفا ہو جاتے اور میں پھر اپنے خدا سے رُجوع کرتا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ کی طرف سے آزمائش ہے حق ذات اللہ کی ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے اللہ نہ ہوتے تو انسان انسان کو کھا جاتا حکومتوں کی پولیس انسانوں کو ہٹپ کر جاتی۔ سی آئی ڈی کے مقربین انسانوں کو اس طرح لنگل جاتے جس طرح سانپ چھپکلی کھا جاتا ہے اور بلی کبوتر پر لپکتی ہے۔ یاس اور تلخی کے اس عالم میں میں نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور سیٹھ سدرشن کو بھی جواب دے دیا انہوں نے بہتیرا زور لگایا لیکن میں اپنے جواب پر قائم رہا۔ مجھ میں قدرتی طور پر جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

میرے رد عمل کا پارہ اس درجہ تیز ہو چکا تھا کہ میں نے ان کے اخلاص یا ہمدردی کو بھی سیاسی احسان سمجھا اور بد تمیزی یہی کہی کہ ان کے منہ پر کہہ دیا کہ مجھے اس سیاسی احسان کی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کو قدرتی طور پر ناگوار لگتا لیکن وہ اتنے ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے کہ مسکرا کر طرح دے گئے اسی دن شام کو لالہ پنڈی داس کا پیغام آگیا کہ دیوان چمن لال نے کرنل (نام یاد نہیں رہا) سے وقت لیا ہے اور وہ شام کو مرلیض دیکھنے آرہے ہیں یہ پیغام لالہ جی کے چھوٹے بھائی کینی لائے تھے لیکن میں نے ان سے بھی خوبصورت الفاظ میں معذرت کر دی اور کہلا بھیجا کہ اب تو یوڈش گھڑی دو گھڑی کا مہان ہے کوئی سی قیمتی دوا یا بڑا ڈاکٹر اس کی جانکٹی کو ٹال نہیں سکتا ہے۔

میں دو دفعہ سرکار کو خط لکھ چکا تھا کہ میری پابندیاں ہٹا دی جائیں تاکہ میں اپنے جواں سال بھائی کا علاج کر سکوں لیکن حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رہی اور مرلیض تھا کہ ریگ ریگ کر موت کے دروازے پر پہنچا تھا امیدوں کے بہت سے چراغ حکومت کی سنگدلی سے بجھ گئے ہر اس ٹوٹ گئی تھی ملک خضر حیات ٹوانہ وزیر اعظم پنجاب اور مسٹر میکڈانلڈ ہوم سیکریٹری حکومت پنجاب کو میں نے ایک ہی مطلب کے دو مختلف خط لکھے تھے ان سے کہا تھا کہ وہ خدا کا خوف کریں اور ایک ایسے نوجوان کے علاج کی خاطر پابندیوں کو منسوخ کر دیں جس نے خود کوئی جرم نہیں کیا لیکن حالات کی خانہ ویرانی کے باعث تینس اور چوبیس سال کی عمر میں مر رہا ہے۔ ہوم سیکریٹری کے نام جو خط لکھا اس کا متن یہ تھا —

بخدمت ہوم سیکرٹری  
حکومت پنجاب لاہور

جناب محترم!

آپ نے مجھ پر جو پابندیاں لگا رکھی ہیں میں اس بحث میں نہیں بڑنا چاہتا کہ وہ قانوناً یا اخلاقاً کس حد تک درست ہیں لیکن ایک سنگین صورتحال جو اس وقت ہمیں درپیش ہے اُس طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا ضروری ہو گیا ہے میرا بھائی محمد اقبال یو۔ریش بعمر ۲۳ سال تپدق کے موذی مرض میں مبتلا ہے اس کی حالت سخت نازک ہے علاج کی راہیں پیدا کرنے کے لیے اس نظر بندی کا ختم ہونا ضروری ہے آپ ان احکام کو واپس لیں جو میرے نزدیک مر سچا ناجائز ہیں یہ انسان دوستی کا سوال ہے اگر آپ نے نظر بندی کے بہ احکام واپس نہ لیے تو مجھے یقین ہو گا کہ آپ اس نوجوان بچہ کی موت کو قریب لانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے قاتل مرض میں برابر کے شریک ہیں۔  
ذہرا خط ملک خضر حیات کو لکھا اس کا متن یہ تھا۔۔۔

ملک صاحب محترم!

سلام سنون

ممکن ہے سی آئی ڈی نے آپ کو مطلع کیا ہو کہ میرا چھوٹا بھائی محمد اقبال یو۔ریش بعمر ۲۳ سال اتپ دق کے موذی مرض کا شکار ہے اس وقت وہ موت و حیات کی کشمکش میں ہے۔ علاج کا سروسامان مہیا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میری نظر بندی ختم ہو تاکہ میں اس کے لیے زندگی تلاش کر سکوں یا اس کی موت سہل ہو جائے میں نے لین چار و فہ ہوم سیکرٹری کو اس غرض سے خط لکھا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے وہاں انسانوں

کے بجائے پتھروں کی عورتیاں طبعی ہیں جن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب آپ سے رُجوع کر رہا ہوں۔ آپ موجودہ وزارت کے سردار ہیں اور ان امور کی تمام ذمہ داری بالواسطہ اور بلاواسطہ آپ پر عائد ہوتی ہے۔ التماس ہے کہ آپ اُس جاں گداز صورتحال پر غور فرمائیں جو آجکل ہمیں درپیش ہے۔ درخواست صرف اتنی ہے کہ آپ نظر بندی کے یہ احکام واپس لے لیں جن کی عمر سال ڈیڑھ سال ہو چکی ہے اگر میرا بھائی اسی حالت میں مر گیا تو ممکن ہے یہ آپ کے لیے کوئی واقعہ نہ ہو لیکن ہمارے لیے یہ ایک سانحہ ہوگا اور ممکن ہے نیا مت کے روز آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے۔

والسلام

المخلص

شورش کاشمیری

دن گذرتے گئے جواب نہ آیا حکومتوں کی اپنی عزت کا سوال ہوتا آنکھ کی جھپکی میں کنواری مریم ہو جاتی ہیں لوگوں کا سوال ہوتا پتھروں کی طرح سوچنے سے انکار کر دیتی ہیں اس وقت ان کی حالت اُس ناکہ کی سی ہوتی ہے جس کے سینہ میں ضمیر نام کا کوئی کانٹا نہیں ہوتا۔ اور جو اپنے سوا ہر معاملہ میں بے حس ہوتی ہے حکومت طاقتور ہوتی چھتال ہے مگر وہ ہوتی ناکہ —

آخر پوریش کا آخری وقت آگیا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۴ء اس کی زندگی کا آخری دن تھا اس کی ہر چیز مر چکی تھی صرف آنکھیں کھلی تھیں جن سے وہ ٹکڑ ٹکڑ دیکھ رہا تھا یا دل حرکت کر رہا اور موت کے انتظار میں دھڑک رہا تھا اس کے پاؤں پر ورم آچکا تھا دونوں پاؤں سوچ کر منوں بوجھل ہو گئے تھے اس نے اس ظلمت خانہ میں جہاں وہ دم توڑ رہا تھا دیواروں کو واپس نظروں سے تگنا شروع کیا اُسے بھی یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ

ختم ہو رہا ہے اس کی نگاہیں ایک ایک سے معاف کر رہی تھیں ہم سب اس کی چارپائی کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھے وہ ایک ایک کو دیکھتا اور نظریں جھکالتا تھا وہ ایک بہادر انسان تھا۔ پر لے درجہ کا عینور مستقل مزاج ضدی خود دار عزت مند ذہین اور دلبر عنیت کا پتلا اس نے اپنے باپ اور بھائی سے بھی کبھی سوال نہ کیا تھا اب بلیس پڑا تھا۔۔۔ اس کے پھہڑے بالکل سڑ گئے تھے اس کا اندر کوئلہ ہو گیا تھا جب اس پر جانکنی سے پہلے کی رونق آئی تو اس نے اپنے بہنوئی کو انتہائی کرب کے عالم میں کہا۔۔۔

"مجھے خدا کے لیے بچاؤ"

لیکن اب اسے کوئی انسان نہیں بچا سکتا تھا اور خدا کی رضا اپنا فیصلہ دے چکی تھی تمام دن اسی تذبذب میں گزر گیا موت نے طول کھینچا میری آنکھ لگ گئی خواب دیکھا کہ شاخ سے گلاب کا ایک پھول ٹوٹ گیا ہے آنکھ کھلی تو پھول واقعی ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دق ہی سے نہیں بلکہ مفلسی کی چوٹ کھا کھا کر مر رہا تھا۔ پچھلے دس دنوں کا نقشہ کچنچ پکچن کے سامنے آتا رہا ہم اس کے لیے کچھ بھی نہ کر پائے تھے دواؤں کی خرید استطاعت سے باہر تھی ابھی غذا عنفا، پھل بھرا بڑی بہن ہر روز چند پیسوں میں گلے سڑے انا خریدتی اچھے دانوں کو چنتی اور اپنے میلے کچیلے دوپٹے کو دھو کر اس میں سچوڑتی یہ تھا جوں جو پورش کو موت کے دروازہ تک ملتا رہا۔ آخری دفعہ اُس نے کوئی گیارہ بجے شب آنکھیں کھولیں تو صرف یہ کہہ سکا کہ غریبی قدرت کی خوفناک سزا ہے اور غریب قدرت کا خوفناک مذاق طایر دنیا کچھ نہیں سب اللہ ہی اللہ ہے۔

میں ایک بجے شب بیٹھک میں چلا گیا والد دن بھر کے تھکے ماندے تھے ان کی آنکھ لگ گئی خواب دیکھا کہ چاند شق ہو گیا ہے اور بڑے بیروں کا ایک کبوتر اس کے اندر چلا

گھباہے۔ روایت اُن کی یہ تھی کہ جب ان کے ہاں کسی لڑکے کی پیدائش ہوتی تو چاند کھلتا اور اندر سے کبوتر اُڑنے کے باہر آجاتا لڑکے پیدائش تک کبوتر اُڑنے کے آتی۔ یورش کی پیدائش پر پہلے یورش کا کبوتر نکلا تھا وہی کبوتر آج واپس چلا گیا والد خواب دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھے یورش اس وقت حمدہ جانکنی کی آخری زود میں تھا۔ —

”شورش؟“ یہ میرے بہنوئی کی آواز تھی۔

”خیریت ہے“ میں نے اُوپر ہی سے آواز دی۔

”ورش کا انتقال ہو گیا ہے“

میں اُڑنے کے پہنچا تو والد غش کھا کے اس کی پائنتی پر پڑے تھے دوہنیں بچھاڑیں رہا کر رہ رہی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے یورش کا منہ چوما اس کو جھنجھوڑا۔

”اٹھو یورش اتنی جلدی سو گئے۔“

کب اٹھو گے

اُٹھتے کیوں نہیں؟

خدا کے لیے ایک دفعہ تو آنکھیں کھولو۔“

لیکن وہ ہمیشہ کی عیند سوچکا تھا۔ اب اس کا جگانا فضول تھا اس کو

من سے مکمل آرام آچکا تھا۔

کوئی دس بجے صبح ہم اس کی میت لے کر میانی صاحب کے قبرستان کو چلے تو ہجوم ساتھ تھا گریہ و زاری سے میرا حال بُرا ہو گیا کسی دوستوں نے مجھے اپنے قدم میں لے رکھا تھا مولانا داؤد غزنوی علامہ تاجوڑ ڈاکٹر گوپی چند جبار گوہر بہن چمن لال مولانا مظہر علی سیٹھ سدرشن اور لالہ جگت نارائن سپہارادے رہے تھے۔

ساحر دھینڈی سر جھکاتے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اختر شیرانی جنازہ کی چار پائی کو کپڑے چلا پلا کے کہہ رہا تھا۔ اٹڈ میاں اس کڑیل نوجوان پر یہ ستم کیوں توڑا ہے مجھے اٹھلایا ہوتا — میں بے کار ہوں۔ میں نے زندگی کھاپی لی ہے —“

پرائی انارکلی کے آخری نکلڑ یعنی جن مندر تک میری نظر بندی کے حدود تھے میں اس سے آگے نہیں جاسکتا تھا سرکاری گماشتہ ہمراہ تھا میں چاہتا تو قبرستان تک چلا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پابندیاں توڑنے کی پاداش میں مقدمہ چلتا اور میں قید ہو جاتا لیکن دوستوں نے روک کر واپس کر دیا۔ میں چوک میں کھڑا دور تک جنازے کو نکلتا رہا — ط

اک جنازہ جا رہا تھا دوش پر تقدیر کے

نصف فرلانگ پر قبرستان تھا لیکن قانون نے پابہ زنجیر کر دیا تھا کہ اس حد سے آگے بھائی کے جنازہ کو بھی کندھا نہیں دے سکتے ہو۔ یہ ایک ایسا المیہ تھا جس کا لغت میں کوئی نام نہیں دوستوں کے چہروں پر زردی کا کفن تھا۔

لوگوں کی واپسی تک میں اسی چوک میں کھڑا رہا۔ لوگ میت دفن کر گھر پہنچے تو پیہ اجا پولیس اسٹیشن کا سب انسپکٹر دروازہ پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہوم سیکرٹری کا دستخطی حکم نامہ تھا — گورنر پنجاب بڑی مسرت کے ساتھ شورش کا ٹیمپری پر عائد کردہ ان پابندیوں کو واپس لیتے کے احکام صادر کرتے ہیں جن کی رو سے وہ اب تک انارکلی پولیس کے علاقہ میں نظر بند ہے یہ پابندیاں اس کے بھائی کی علالت کے پیش نظر واپس لی جاتی ہیں اس کی نقل و حرکت پر اب سے کوئی پابندی نہیں رہی ہے“

ساحر غصہ سے کانپنے لگا میرے ہاتھ سے حکم نامہ لے کر اُس نے ذیل کے اشعار

لکھے اور سب انسپکٹر کے حوالے کرتے ہوئے طنزاً لکھا ————— ”حکم حضور سے

اطلاع پائی“ ————— ۵

شب کی سنگین سبابتی کو مبارک کہہ دو	اک دیا اور بچھا اور بڑھی تاریکی
جاؤ فرعونوں کی شاہی کو مبارک کہہ دو	جاؤ بجھتی ہوئی آنکھوں کے سکتے اشکو
جاؤ گھلا ہوا تپتا ہوا لاوا بن جاؤ	جاؤ جمہور کے روندے ہوئے بے بس جذبہ
جاؤ قانون کے ایوان پر شعلے برساؤ	جاؤ معصوم جنازے کے فسرده پھولو
میکڈانڈ سے کہو اب کوئی زحمت نہ کرے	جاؤ اس وقت کے تاریک بھیانک سیاہو
اب کوئی وعدہ تکلیفِ مردت نہ کرے	جاؤ اس قتل کے بالواسطہ مجرم سے کہو
سینکڑوں سینوں میں چنگاریاں رخشہ ہیں	جاؤ پنجاب کی سرکار سے جا کر کہہ دو
جاؤ اور خضر سے کہہ دو ابھی ہم زندہ ہیں	موت ایوان وزارت پہ کھڑی سنتی ہے

اور یہ نختا پس دیوار زنداں کی اس کہانی کا تکملہ -

Accession Numbers

11567.1

Date 4.12.88

